# جنگی قیدی کی ڈائری

بریگیڈیر منصور الحق ملک

# جنگی قیدی کی ڈائری

بریگیڈیر منصور الحق ملک

ملنے کا پتہ

ایس۔اے علیم اینڈ سنز ۔ ۳۱ ہسپتال روڈ۔ لاہور

طبع دویم ـــــــــ اگست ۱۹۷۶ء

تعداد ـــــــــ ایک ہزار

ناشر ـــــــــ بریگیڈیر منصور الحق ملک

طابع ـــــــــ سیّد عبدالسلیم

مطبع ـــــــــ آفتاب عالم پریس

۱۳ ہسپتال روڈ لاہور

قیمت ـــــــــ پندرہ روپے

## والدہ کے نام ______

جن کی دعاؤں کے سہارے مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی، بھارتی جارحیّت اور بعد میں گوالیار میں نظر بندی کے دوران میرے دِل میں بے خطر وقت گزارنے کا عزم اور ولولہ اُجاگر رہا اور جنہوں نے اپنی جان دے کر مجھے بھارت کی قید سے رہائی دلوائی۔

★

# پیش لفظ

دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے وقت متحدہ پاکستان کے مسلمانوں پر گویا ایک قیامت ٹوٹ پڑی، نظریاتی بنا پر قائم شدہ ایک متحد اسلامی مملکت کا دو ٹکڑے ہو جانا ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ پاکستان کی افواج کے بہت سے افراد نے اس المیہ کو قریب سے دیکھا۔ کرنل منصور بھی ان میں سے ایک فرد تھے اور ایک اعلیٰ ذمہ دار حیثیت پر فائز تھے۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں انہوں نے ملک کے بٹ جانے اور پاکستان کی افواج کے ہتھیار ڈالنے کا آنکھوں دیکھا حال نہایت دیانتداری سے سیدھے سادے فوجی الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اُن کی کتاب میں بیان کردہ اس سلسلے کے چھوٹے چھوٹے واقعات ایک عظیم اصول کی تصدیق کرتے ہیں "اے جماعت مومنین! تم اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا کسی کو اپنا رازدان نہ بنانا۔ یہ (دوسرے) لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ تم ایسی جانکاہ مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ جس سے تمہاری قوت ٹوٹ جائے۔ تمہارے خلاف بُغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کی زبان پر بے اختیار آجاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوتا ہے، وہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ قرآن حکیم ۳/۱۱۷"۔ کتاب میں بیان کردہ واقعات پڑھیئے۔ اُس عظیم المیے کے بعد کے بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان کے آپس میں تعلقات کا جائزہ لیجئے اور پھر دیکھیئے کہ قرآن حکیم کے بلند اصولوں کی تصدیق کس طرح نکھر کر ہو رہی ہے اور ابھی تو ابتدائے عشق ہے۔

کرنل منصور کی کتاب کا بیشتر حصہ ایک جنگی قیدی کے تاثرات سے متعلق ہے۔ پاکستان میں رہنے والے بیشتر افراد کے عزیز و اقارب اور دوست احباب قید و بند کی اس صعوبت سے گزر چکے ہیں۔ ان سب حضرات کے لئے بالخصوص اور ہر ایک پاکستانی کے لئے بالعموم ان تاثرات کا بیان بہت دلچسپی کا باعث ہوگا۔ کرنل منصور کی تحریر میں جو چیز میرے سامنے اُبھر کر آئی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی روزمرہ زندگی کے حالات اور ارد گرد کے ماحول کے کوائف کو مکمل دیانتداری اور خلوص سے بیان کیا ہے۔ کرنل صاحب نے ایک مسلمان جنگی قیدی کے کردار کے متعلق اپنے ہاں ایک معیار مقرر کیا ہے اور پھر وہ اپنے اور اپنے ساتھی جنگی قیدیوں کے کردار کا اس معیار کے مطابق موازنہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ قاری حضرات

اس معیار سے متفق ہوں۔ خود میرا یہ خیال ہے کہ کرنل صاحب کا متعین کردہ پیمانہ ایک مردِ مومن کا مثالی معیار ہے۔ مجھے میرا تجربہ بتاتا ہے کہ اس مثالی معیار پر پورا اُترنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ جو احباب اس بات پر مصر ہوں کہ معیار یہی یا اس سے بلند ہونا چاہیئے اُن کی طبع سلیم پر بہت سے جنگی قیدیوں کا بیان کردہ کردار گراں گزرے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ احباب کی رائے میں کرنل صاحب اپنا اور اپنے رفقاء کا محاسبہ کچھ سختی سے کرتے ہیں لیکن یہ فوجیوں کی ایک پرانی اور قابلِ ستائش عادت ہے کہ وہ الفاظ کو MINCE نہیں کرتے، میرے خیال میں یہی ایک چیز کرنل صاحب کی کتاب کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔

کرنل صاحب صرف واقعات کے بیان پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ساتھ ہی ساتھ بلند اقدار کی روشنی میں سبق بھی اخذ کرتے چلے جاتے ہیں اور انہیں سادہ اور دلچسپ الفاظ میں واقعات کے پہلو بہ پہلو تحریر کرتے چلے جاتے ہیں۔ حالاتِ حاضرہ کو تاریخ اور بلند اقدار کے پیمانوں پر پرکھ کر بلند فلسفیانہ اصولوں کو ایک فوجی کی سادہ زبان میں بیان کر دینا آسان کام نہیں ہے۔ کرنل صاحب نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ روزمرہ کے واقعات کے تفصیلی بیان کے ساتھ ساتھ جس طرح ان بلند اُصولوں کو سمویا گیا ہے اس سے کتاب کی افادیت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

کوریا کی جنگ کے دوران مختلف اتحادی ممالک کے بہت سے فوجی افراد کو قید و بند کی صعوبت سے ایک خاصی لمبی مدت کے لئے گزرنا پڑا۔ ترک فوجیوں نے ان دنوں ان مشکل حالات میں بلند حوصلگی اور کشادہ پیشانی کی ایک منفرد مثال پیش کی، بالعموم یہی کچھ پاکستانی جنگی قیدیوں کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے اور کیوں نہ ہو، ترکوں اور پاکستانیوں میں اسلام کی بلند اقدار ایک قدرِ مشترک ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ بندۂ مومن جو قرآنِ حکیم کی بلند اقدار اور رسول کریمؐ کے عظیم اخلاق کو اپنے لئے مشعلِ راہ بناتا ہے، اس کے لئے اس قسم کی آزمائشیں اسے اپنی خودی کو اور مستحکم کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں جس طرح آگ میں تپ کر سونا کُندن بن جاتا ہے اُسی طرح ایک بندۂ مومن سخت سے سخت آزمائش میں اپنے آپ کو اسلام کے عظیم اصولوں سے ہم کنار رکھے ہوئے اخلاق کے بلند سے بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ "یہی

وہ ٹکراؤ ہے جس سے وہ جماعت جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتی ہے ناساعد حالات کی کٹھالی میں سے نکل کر کندن بن جاتی ہے ، اُسے ثبات و استحکام نصیب ہوتا ہے اور جو لوگ ان قوانین سے انکار کرتے ہیں کمزور ہوتے ہوتے مٹ جاتے ہیں .... قرآن حکیم ۱۳/۱۷

میجر جنرل احسان الحق (ریٹائرڈ)

---

# گذارشِ احوال

جنگی قیدیوں کی بھارت میں نظر بندی کے دوران پاکستانی عوام نے اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور ہم وطنوں کے لئے بے مثال شفقت، ہمدردی اور ایثار کا ثبوت دیا۔ اس نظر بندی کی ساری کہانی ایک سبق آموز حکایت ہے۔ زندگی کے کئی سنہری اصول ایسے کٹھن حالات ہی میں اُبھر کر عیاں ہوتے ہیں۔ ہر پاکستانی کے دل میں یہ معلوم کرنے کی خواہش ہوگی کہ اُن کے جنگی قیدیوں پر کیا بیتی؟ ہر جاننے والے کو ملک میں واپسی پر پُوری تفصیل سے کہانی سنانی مشکل کام ہوگا اس لئے جب کہ یہاں گوالیار کیمپ میں فراغت ہی فراغت ہے، اس وقت سے فائدہ اٹھا کر نظر بندی کی کہانی بیان کر رہا ہوں۔ ہر موقع پر جو میرے ذاتی جذبات تھے یا دوسروں کے جذبات کی میرے دماغ میں تصویر کھنچتی تھی اُن کو ہو بہو لکھ دیا ہے۔ ایسا کرنے میں عین ممکن ہے کہ بعض حالات میں دوسروں کے جذبات کے متعلق میری رائے درست نہ ہو۔ بہر صورت جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ میں نے اپنے دل کی آواز پیش کی ہے اس میں ذرہ بھر بھی جھوٹ کی ملاوٹ نہیں، بعض باتوں میں شاید چُبھن ہو جبکہ چُبھن جھوٹ پر نہیں سچ کی نوک پر نمودار ہوتی ہے۔

یہ کوئی ادبی تخلیق نہیں محض قید کی تصویر ہے۔ ہو سکتا ہے تحریر میں غلطیاں ہوں ان کو در گزر کیجئے۔ ایسی غلطیوں کے باوجود میری کہانی کا مفہوم اور اس کا ہر پہلو صحیح اور حقائق پر مبنی ہے۔ اس آپ بیتی سے میں نے اپنی آئندہ زندگی کے لئے کافی سبق سیکھے ہیں۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا کہ آپ نظر بند ہوئے بغیر اور اس طرح کا ذاتی تجربہ حاصل کئے بغیر اس سے مستفیض ہوں۔

یہ مکمل کتاب میں نے گوالیار کے جنگی کیمپ نمبر ۶۱ میں دو سال کی نظر بندی کے دوران لکھی، سوائے گوالیار سے پاکستان کی تفصیل جو میں نے واپس آکر قلم بند کی۔

جو کچھ میں نے اسیری کے دوران لکھا اُسے جُوں کا توں شائع کر رہا ہوں۔ سوائے چند جملوں کی گرائمر دُرست کرنے یا بعض الفاظ کے ہجّوں کو ٹھیک کرنے کے باقی تحریر میں مَیں نے کسی قسم کی تبدیلی کرنا نامناسب سمجھا۔

کیمپ میں یہ سب کچھ میں نے بے حد باریک الفاظ میں لکھا کیونکہ کاغذوں کو چھپانا بھی کارے دارد تھا۔ یہ کاغذات میں کپڑے دھونے والے صابن کو اندر سے کھوکھلا کر کے اُن کے اندر چھپاتا رہا۔ واپسی پر بھارتی حکام نے بڑی تفصیل سے تلاشی لی مگر اُن کو صابن کی ٹکیوں کے اندر دیکھنے کا خیال نہ آیا۔

کرنل منصور الحق ملک

# ۱۹۷۱

## ۱

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کا دن پاکستان بلکہ عالمِ اسلام کی تاریخ میں ایک سیاہ دن بن کر نمودار ہوا۔ میں پاکستانی فوج کے نمبر ۹ ڈویژن کا جی ایس او I (جنرل سٹاف آفیسر گریڈ I) تھا۔ نمبر ۹ ڈویژن کے سپرد جیسور، کشتیا، باریسال اور کھلنا کا علاقہ تھا۔ ۱۹۷۱ء کا قریباً پُورا سال بدامنی اور خانہ جنگی میں گزرا تھا۔ ہر سپاہی کو اپنے وطنِ عزیز کے دفاع اور اُس کے نام کی تابانی کی خاطر لڑنے سے اور کیا چیز زیادہ پیاری ہو سکتی ہے۔ مگر آپس کی جنگ جو غلط فہمیوں، غلطیوں، نااہل قیادت اور سیاسی کشمکش کے پس منظر میں شروع ہوئی ہر پاکستانی کے لئے بڑی تکلیف دہ تھی، مشرقی پاکستانی فوجی افسر اور جوان جو ماضی میں اپنے مغربی پاکستان کے افسروں اور جوانوں کے شانہ بشانہ دشمن کا مقابلہ کرتے رہے تھے اُن میں سے کئی آج مقابل صفوں میں کھڑے تھے۔ فوج سیاست اور شخصی اقتدار کا آلۂ کار بن کر بٹ چکی تھی، بنگالی مغربی پاکستانیوں کے خون کے پیاسے بنے برسرِ پیکار تھے، بڑے ہی دردناک حالات تھے۔ حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ ان سے گریز نہ تھا۔ فوج کے سر ایک تلخ ذمہ داری سونپ دی گئی تھی۔ ملک میں اُبھرتی ہوئی تفریق کے لئے سیاسی حل کی ضرورت تھی جسے فوج کی طاقت سے طے کرنے کی کوشش کر کے ملک کو انتشار میں دھکیل دیا گیا تھا۔ جس سے نکلنا کارے دارد تھا۔ فوج کا سپاہی دیئے ہوئے حکم پر عمل کر رہا تھا۔ اگرچہ اس کے دل و دماغ میں اس گھناؤنی واردات کے لئے کوئی ہمدردی نہ تھی مگر اس کی تربیت ایسی تھی کہ وہ بغیر کسی حیل وحجت کے حکم کی بجا آوری اپنا فرض تصوّر کرتا تھا اور حکم کی درستگی یا غلطی سے اُسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ ان سیاسی کشمکشوں سے ناواقف اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ دونوں طرف جذبات کو اس

بُرے انداز سے بھڑکایا گیا تھا کہ دشمنی خون کے قطرہ قطرہ میں سرایت کر آئی تھی جس کا ٹھنڈے دل سے سوچنے والوں کے لئے کوئی جواز نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کا وفادار فوجی حکم کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ اس تمام عرصہ کے دوران ایک دائمی کشمکش میں مبتلا رہا کیونکہ اس نے دشمن سے لڑنا سیکھا تھا اپنوں سے نہیں۔ ملک کے ایسے ابتر حالات نے اسے رنج والم میں گھیر رکھا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اس آپس کی نااتفاقی سے اگر کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے تو وہ ہے ہمسایہ ملک بھارت جس کے لئے پاکستان کے اندرونی انتشار سے بڑھ کر اور کوئی مبارک خوشی نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اس ناچاقی سے پوری طرح فائدہ اٹھانے میں مشغول تھا۔ آخر ۲۱ نومبر ۱۹۷۱ء کو چوری چھپے کی جارحیّت کو خیرباد کہہ کر اُس نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ پاکستانی فوج خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو وہ اپنے بٹے ہوئے گھر میں اس جوش وخروش اور سرفروشی کے ساتھ نہیں لڑ سکتی جو کہ اس کا شیوہ ہے، اس میں شک نہیں کہ جہاں اپنے بھی پرائے بنے ہوں وہاں حب الوطنی کے ولولوں کا مظاہرہ کرنا ممکن نہیں۔

۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جیسور میں ہماری شکست کے بعد مگورا کے نواحی علاقے میں جہاں ہمارا ڈویژنل ہیڈکوارٹرز واقع تھا بہاری اور پاکستان دوست عناصر کے بحرِ بیکراں کو مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے گھبراہٹ اور وحشت کے عالم میں جیسور سے بھاگے تھے۔ بھارت کی فوجوں کے آنے سے پاکستان دوست طبقہ کے لوگوں کو پاکستان دشمن عناصر اور غنڈوں نے مارنا، لوٹنا اور قتل کرنا شروع کیا تو یہ بے چارے وہاں سے بے سروسامانی کی حالت میں مگورا کی طرف بھاگے جو جیسور سے بیس میل دُور تھا۔ گلیوں میں کھیلتے چھوٹے بچوں کو اپنے گھر تک واپس جانے کی بھی مہلت نہ ملی۔ غرض جو جہاں تھا وہیں سے بھاگ نکلا بچے ماں باپ سے جُدا ہوئے۔ مَردوں کو اپنے گھر والوں کا پتہ نہ چلا کہ کہاں گئے۔ بے شمار لوگ مارے گئے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اور مِل کر مجھے جو رنج ہوا وہ یہ قلم تحریر کرنے سے قاصر ہے۔ ان کی حالت دیکھ کر میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ان میں کئی چھوٹے بچے تھے جو

اس مجمع میں چلے آئے تھے جیسے دریا میں تنکے بہے چلے جا رہے ہوں۔ وہ رو رہے تھے، چیخ رہے تھے، ماؤں کو پکار رہے تھے، بھوک اور نڈھال سے تڑپ رہے تھے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ ان کے والدین کہاں ہیں اور وہ کس طرف اور کہاں جا رہے ہیں۔ میں حیران تھا کہ وہ بیس میل کا سفر پیدل کس طرح طے کر کے آئے ہیں۔ کئی زخمی تھے، چلتے چلتے ان کے پاؤں میں آبلے پڑ چکے تھے، عورتیں اپنے گھر والوں سے جدا ہو چکی تھیں، اس مجمع میں غریب بھی تھے اور امیر بھی، متوسط اور متمول گھرانوں کی عورتیں بھی شامل تھیں۔ ان لوگوں کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اپنے ملک سے پیار کرتے تھے۔ تمام بھوک پیاس، سفر اور دہشت سے تھک کر چُور نظر آتے تھے، ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میری جیپ کو دیکھ کر وہ میرے اِرد گرد جمع ہونے شروع ہو گئے جیسے ان کو اپنی منزل مل گئی ہو۔ جیسے ان کو مسیحا مل گیا ہو جو اُن کے ہر درد کا علاج جانتا ہو، جس کے پاس ان کے ہر دُکھ کا تریاق موجود ہو۔ مگر جنیدا کے محاذ سے بھی کوئی اچھی خبر نہیں آ رہی تھی۔ صرف تسلی دینے کے اور حقیقت تو یہ ہے کہ جھوٹی تسلی دینے کے علاوہ میں اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ان کے حال سے زیادہ مجھے اپنی مجبوری پر ترس آ رہا تھا اس علاقے میں بھی تو ان کے دشمن موجود تھے۔ جب بھارت کی فوجیں اس طرف کوچ کریں گی تو پھر یہ لوگ کس طرف کو جائیں گے۔ اتنی بڑی تعداد کے رہنے اور کھانے پینے کا کیا بندوبست کیا جا سکتا تھا۔ مگورا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ سول عہدیدار تو تھے ہی نہیں اور فوجی خود زندگی اور موت کی جنگ میں مصروف تھے۔ ایسے بُرے حالات میں اُن کی نگرانی کا کون ذمہ لے سکتا تھا۔ غم سے میرا دل نڈھال ہو رہا تھا۔ اپنے ہی ملک میں اپنے لوگوں کو بیچارگی کے عالم میں دیکھنے کا تصور ہی بے حد بھیانک ہے چہ جائیکہ حقیقی صورتحال کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ ہر ایک کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں جیسے میں ان کے تمام دُکھوں کا چند منٹ میں تدارک کر دوں گا۔ میرے دل میں بے پناہ خواہش تھی کہ کاش میں ان کی امیدوں کی پیاس بجھا سکتا۔ ان کے تشنہ لبوں کی طرف اپنے سہارے کا پیالہ بڑھا کر ان کو پُر سکون دنیا کی طرف لے جا سکتا۔ اُن کی مدد کر سکتا۔ میں تو مگورا کے دفاع کیلئے اردگرد کے علاقہ کا جائزہ لینے کے لئے آیا تھا لیکن بالکل کچھ کئے بغیر میں اُن پُر امید نظروں کو

مایوسیوں کے گڑھے میں دھکیل کر واپس جانے کی طاقت رکھنے سے قاصر تھا۔ چھوٹے چھوٹے لاوارث بچوں، چند بوڑھی عورتوں اور چند زخمیوں سے میں نے اپنی جیپ کو بھرا، باقی کو میں نے تسلی دی کہ جہاں تک ممکن ہو گا ان کی مدد کی جائے گی۔ اُنہیں خدا پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کی۔ وہاں سے مگورا کوئی چار کوس دُور تھا۔ جو چلنے کے قابل نہ تھا اُن سے میں نے وہیں انتظار کرنے کو کہا اور باقی کو مگورا کی طرف آہستہ آہستہ آنے کے لئے کہہ کر میں خود اپنی بھری جیپ میں مگورا آیا۔ زخمیوں کو ہسپتال چھوڑا۔ رضا کاروں اور قصبہ کے محبّ وطن لوگوں سے مل کر ان سے سکول اور سرکاری دفاتر میں ان لوگوں کے رہنے کا بندوبست کرایا۔ دو ٹرک جیسور کی طرف جانے والے کچے راستے پر بھیجے تاکہ معذوروں کو بٹھا کر مگورا لائیں۔ اُن کے کھانے کے لئے راشن اور کھانا پکانے کا بندوبست کرنے کے لئے کہا۔ لاوارث بچوں کو امن کمیٹی کے عہدیداروں کے حوالے کیا۔

یہ داستان میں نے صرف اس لئے بیان کی ہے تاکہ اس ماحول کا خاطر خواہ اندازہ ہو سکے جو مشرقی پاکستان میں موجود تھے۔ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ تمام پناہ گزین اس دی گئی تھوڑی سی پناہ اور تحفّظ سے صرف چند دن کے لئے فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ جس وقت منصوبہ کے مطابق ہماری فوجیں عقب میں دریائے مادھومتی کی طرف کوچ کریں گی تو اُن کے عارضی تحفّظ کا سایہ ان کے سروں سے ایک بار پھر اٹھ جائے گا اور وہ نئے سرے سے مخالفین کے ظلم وستم کا نشانہ بنیں گے لیکن اس سے فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔ اُن کے حقیقی تحفّظ کا راز ہماری فوجوں کی کامیابی میں تھا لیکن اس کے امکان بڑے مسدُود ہوتے جا رہے تھے۔ ان لوگوں کی کہانی میں ادھوری چھوڑ رہا ہوں کیونکہ ان لوگوں کی کہانی ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد لاکھوں پاکستان کے حمایتی بلکہ محبّ وطن لوگوں کی کہانی بن گئی۔

مشرقی پاکستان کے دس لاکھ سے زائد بہاری مسلمان، لاکھوں اسلام اور پاکستان پسند عوام اپنے ملک میں رہتے ہوئے بے ملک ہو گئے۔ ظلم وستم کا نشانہ بنے۔ اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے۔ ان کا کیا قصور تھا؟ یہ میں نہیں جانتا۔ مارچ ۱۹۷۱ء سے دسمبر ۱۹۷۱ء

تک جو کچھ حکومت نے کیا میں ذاتی طور پر اس کی تائید بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس عرصہ میں بھی عوام نے جن میں ہزارہا معصوم تھے بے پناہ تکلیفیں اٹھائیں ۔ انہوں نے ایک غیر یقینی اور پُر خطر ماحول میں وقت گذارا ۔ اس دوران ملک کے حالات کا تصوّر ہی بے حد تکلیف دہ تھا ۔ ظاہراً کوشش تو ملک کو اکٹھا رکھنے اور اس کے تحفّظ کی کی جا رہی تھی لیکن حقیقت میں ہم دن بدن اپنی منزل سے دُور ہٹتے چلے جا رہے تھے ۔ ان دنوں کے حالات اور ان حالات کے پیدا کرنے والی وجوہات ہماری شکست اور ان وجوہات کے ذمہ دار لوگوں کی سرگزشت کی تفصیل ایک علیٰحدہ دل شکن داستان ہے جو علیٰحدہ عنوان کے تحت قلمبند کرنے کا ارادہ رکھتا ہُوں ۔

## ۲

۱۵، ۱۶ دسمبر کی درمیانی رات کو دو بجے کے قریب میں فرید پور میں اپنے ڈویژنل ہیڈکوارٹر میں نقشے کے سامنے مدھم لالٹین کی روشنی میں بیٹھا بھارتی فوج کے نئے حملے کا جائزہ لے رہا تھا ، اس علاقے میں ہماری مختصر سی فوج جو جنید اسے فرید پور کی طرف پیچھے ہٹی تھی ۔ دریائے مادھومتی کے کنارے بھارت کے دو بریگیڈوں کے حملے کا مقابلہ کر رہی تھی ۔ یہاں ہماری فوج کُل ایک انفنٹری بٹالین پر مشتمل تھی ۔ وقتاً فوقتاً فون پر میں کرنل خوشدل خان آفریدی سے حالات کی تفصیل حاصل کرتا ۔ باوجود شدید بُرے حالات کے کرنل آفریدی اور ان کے سٹاف افسر میجر جعفر کی آوازوں میں گھبراہٹ کا نام ونشان تک نہ تھا ۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ بھارت کا توپ خانہ بھاری مقدار میں گولے گرا رہا ہے ۔ اس کے ٹینک جو پانی پر تیر سکتے تھے دریائے مادھومتی کو عبور کر کے دشمن کی پیادہ فوج کے آگے بڑھ رہے ہیں ۔ ہمارے ڈویژن کا ایک بریگیڈ بریگیڈیر محمد حیات کی سرکردگی میں کھلنا کے باہر لڑ رہا تھا ۔ دوسرے بریگیڈ نے کشتیا پر دشمن کا حملہ پسپا کرنے کے بعد پاکسی پُل کے دفاع کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی ۔ اسی

بریگیڈ کی ایک بٹالین کے لگ بھگ حصہ اب کرنل آفریدی کی زیرِ کمان فرید پور کی طرف بڑھنے والی فوجوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ مادھومتی کے کنارے واقع قصبہ کمارکھلی کے بعد منصوبہ کے مطابق تین اور نالوں پر دفاعی جنگ لڑنے کے بعد آخری مقابلہ فرید پور شہر میں ہونا تھا جس کے لئے ہم نے مقدور بھر تیاری کر رکھی تھی۔ فرید پور شہر کا دفاع آخری گولی اور آخری سپاہی تک کرنے کا حکم ہمارے ڈویژنل کمانڈر جنرل انصاری نے دے رکھا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری فوج کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ جن حالات میں وہ پچھلے تین ہفتوں سے لڑ رہے تھے، ان میں حوصلوں کا پست ہونا غیر فطری بات نہ تھی۔ باقی محاذوں سے بھی کوئی خاطر خواہ خبریں نہ آ رہی تھیں۔ دشمن کی فوجیں ڈھاکہ سے چند میل دُور ہی رہ گئی تھیں۔ کرنل آفریدی نے مجھے بتایا کہ دشمن کا دباؤ بہت زیادہ ہے اس لئے وہ عقب میں متبادل مورچے سنبھالنے کا حکم دے رہا ہے۔

تین بجے کے قریب ڈھاکہ ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹرز سے مجھے جنرل نیازی صاحب نے فون پر بتایا کہ یو این او والوں کا ڈھاکہ سے بھارت کے ساتھ ریڈیو کا سلسلہ نہیں ہے اور ایک ضروری پیغام اُن کی طرف سے جنرل مانک شاہ جو بھارتی فوج کے کمانڈر انچیف تھے، کو پہنچانا ہے۔ اس کے بعد ایسٹرن کمانڈ کے جی ایس او I لیفٹیننٹ کرنل لودھی نے مجھے پُورا پیغام فون پر نوٹ کرایا جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ ڈھاکہ کی لڑائی میں بے شمار بے گناہ انسان مارے جانے کا خطرہ ہے۔ انسانی زندگی کے تحفظ کے پیشِ نظر دوپہر کے تین بجے تک جنگ بند کی جائے۔ اس دوران لڑائی ختم کرنے کی شرائط طے کرنے کیلئے بھارتی فوج کا نمائندہ ڈھاکہ ہوائی اڈے پر اُترا تاکہ مزید گفت و شنید کے بعد مکمل جنگ بندی کی تفصیلات طے کی جائیں۔ یہ پیغام مجھے اپنے مقابل ہندوستانی کمانڈر کے ذریعے بھارتی فوج کے کمانڈر انچیف کو فی الفور پہنچانا تھا۔ پورے پیغام کی میں نے چار کاپیاں ٹائپ کرائیں، ایک کاپی میجر صادق امین کو دے کر اُسے ایک جیپ میں یہ پیغام اُس علاقہ میں بھارت کی فوج کے کمانڈر کو پہنچانے کے لئے روانہ کیا۔ اس کے

بعد میں نے ایسٹرن کمانڈ ہیڈ کوارٹرز سے رابطہ قائم کر کے جنگ بندی کی تفصیل کے متعلق باز پُرس کی کہ یہ کس طرز کی جنگ بندی ہو گی۔ اس کی شرائط کیا ہونے کی توقع ہے اور ہمارے لئے مزید کیا احکامات ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ان سوالوں کا جواب بھارتی نمائندہ کے ساتھ بات چیت کے بعد ہی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ڈھاکہ کے دفاع کی جنگ میں ہزارہا سویلین جانوں کے ضائع ہونے کا خطرہ تھا اس لئے جنرل یحییٰ خان نے جنرل نیازی کو جنگ بند کر کے صورتحال کے مدِ نظر خود فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جنگ بندی کی شرائط جیتنے والی افواج کی خواہش کے مطابق ہی طے ہو سکتی تھیں۔ اس لئے یہ جنگ بندی ہتھیار ڈالنے کے مترادف تھی۔ ایسے بدترین حالات میں مزید مزاحمت سوائے شجاعت اور بہادری کی روایات قائم کرنے کے لاحاصل تھی کیونکہ اس سے جنگ کو چند دن کے لئے طول دیا جا سکتا تھا۔ آخری فیصلہ کے متعلق کسی کو شک نہ تھا۔ ہتھیار ڈالنے پر کٹ مرنے کو ترجیح دینے کا جذبہ پیدا کرنے والے حالات مفقود تھے۔ اگر اپنے ملک کے عوام ہی دشمن بنے ہوئے ہوں تو فوج میں ایسی زمین کے لئے مر مٹنے کا جذبہ کیسے پایا جا سکتا ہے۔ اپنی پاک سرزمین کا تصور مشرقی پاکستان میں متعین افواج کے دفاع میں ماند پڑ چکا تھا۔ اس کی بڑی وجہ وہاں کے عوام کا دشمنانہ رویّہ تھا۔ مشرقی پاکستان میں ہماری افواج کی شکست کے اسباب اور بھی تھے مگر سب سے اہم اندرونی انتشار اور خانہ جنگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فوج کا مورال نیچا اور حوصلے پست تھے۔ نیچے مورال والی فوج کا مستقل مزاجی کے ساتھ لڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ عوام کی ہمدردی، مدد، تعاون اور دعاؤں کے بغیر فوج کے حوصلے کیونکر بلند رکھے جا سکتے ہیں۔ عوام کی نیک تمناؤں کی موجودگی میں بھارت کے لئے جارحیت بے حد نقصان دہ ثابت ہوتی۔ یہ کہنا غلط ہو گا کہ مشرقی پاکستان کے تمام لوگ فوج کے مخالف تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد جنہوں نے فوج کا ساتھ دیا کم نہ تھی۔ بے شمار لوگ ایسے بھی تھے جو یحییٰ خان کی حکومت کے خلاف بھی تھے اور مجیب الرحمٰن کے ساتھی مگر وہ بھارت کی اس جارحیت سے بے حد ناخوش تھے جہاں عوام کی اکثریت عوامی لیگ کے چھ نکاتی منشور کے حق میں تھی وہاں مکمل علیحدگی پسندوں کی تعداد

بے حد کم تھی البتہ خانہ جنگی نے حالات کو زیادہ بگاڑ دیا تھا۔

اگرچہ میجر صادق امین نے وہ پیغام بغیر کسی ہچکچاہٹ کے لے جانے کی ذمہ داری قبول کر لی تھی مگر اس کے چہرے کے تاثرات سے میں سمجھ سکتا تھا کہ اُس کا کام آسان نہیں، اگلے مورچوں میں جہاں لڑائی ہو رہی ہو گزر کر جانا اور دشمن کے ساتھ رابطہ قائم کرنا بے حد پُرخطر کام تھا۔ گولہ باری اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بالمقابل دشمن کے تمام سپاہیوں کو بتانا کہ وہ پیغام لے کر آرہا ہے سیدھا سادہ کام نہ تھا۔ میں نے اُسے سفید جھنڈا ساتھ لینے کے لئے کہا اور وہ بغیر وقت ضائع کئے چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد پَو پھٹنے لگی، اس دن کی صبح ہماری تاریخ کی بھیانک ترین صبح تھی۔ دلوں کے ولولے ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھنڈے پڑ گئے، اُس دن ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔ ایک قوم کی دو قومیں بنا دی گئیں۔ کیا صادق امین پیغام پہنچانے میں کامیاب ہو جائے گا؟ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی گولی کا نشانہ بن جائے، اس صورت میں مزید مذاکرات کا سلسلہ شروع ہی نہ ہونے پائے گا۔ ایسٹرن کمانڈ نے ہمیں جنگ بندی کا حکم دے دیا تھا اور اب جب کہ جنگ بندی ہی ہونا طے پا چکی تھی تو اس اثناء میں مزید جانوں کی تلفی ہر صورت میں غیر ضروری تھی۔ دشمن لڑائی جاری رکھتا تو کئی لوگ اور مارے جاتے اور بے سود مارے جاتے۔ اس کے علاوہ جنگ بندی کے لئے ہمارے علاقے میں کسی ذمہ دار افسر کا آگے جا کر بھارتی کمانڈر سے رابطہ قائم کرنا بھی ضروری تھا۔ اس ضرورت کے پیش نظر میں نے اپنے ڈویژنل کمانڈر سے بات کی، وہ مجھ سے متفق تھے کہ کوئی اور ذمہ دار افسر آگے جانا چاہئے چنانچہ میں نے خود آگے جانا مناسب سمجھا۔ ایک جیپ میں مَیں فرید پور سے کمارکھلی کی طرف روانہ ہوا۔ کمارکھلی کے گرد و نواح میں لڑائی جاری تھی۔ میں کوئی آدھ گھنٹہ میں مادھوکھلی سے آگے پہنچا سڑک پر ایک پُل چونکہ ٹوٹا ہوا تھا اس لئے جیپ پر آگے جانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے مجھے وہیں رُکنا پڑا۔ اس علاقے میں درختوں کے بے شمار جھنڈ تھے۔ سامنے کے درختوں میں سے بندوقوں، سٹین گنوں اور ٹینکوں کی فائرنگ کی آواز آرہی تھی۔ کمارکھلی کے عقب میں فرید پور کی طرف اپنی تمام فوجیں پیچھے ہٹ چکی تھیں۔ میں نے کئی سپاہیوں کو راستے میں فرید پور کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

ان میں کئی رضاکار اور مجاہد بھی تھے۔ جہاں ہمارے فوجیوں کے چہروں پر ہزیمت کی شرمندگی کے آثار تھے وہاں مشرقی پاکستان کے رضاکاروں جن میں بیشتر بنگالی تھے، کے چہروں پر ایک سوالیہ نشان تھا۔ یہ کیا ہو گیا؟ اب ان کا کیا بنے گا؟ وہ کس طرف جائیں گے؟ اُن لوگوں نے آڑے وقت میں ملک کی خدمت اور اُس کے تحفظ کی خاطر فرض شناسی کا ثبوت دے کر بندوق اٹھائی تھی۔ میں نے ٹوٹے ہوئے پُل سے جیپ گذارنے کی کوشش کی مگر جیپ پھنس گئی۔ میں جلد بھارتی کمانڈر سے رابطہ قائم کر کے لڑائی بند کروانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اپنے اردلی لانس نائیک برکت علی کے ساتھ پیچھے آیا تاکہ قریب کی کسی باڑی (جھونپڑی) سے لوگوں کی مدد لے کر جیپ کو پار کرا سکوں۔ سڑک پر مجھے دو چھوٹے چھوٹے بچے کھیلتے دکھائی دیئے، کسی غریب دہقان کے بچے۔ غربت اُن کے چہروں سے عیاں تھی۔ کالا رنگ اور چمکدار آنکھیں۔ میں نے اُن آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، وہ کل تک میرے ہم وطن تھے مگر چند لمحوں بعد ایک دوسرے ملک کے باشندے بنا دیئے جانے والے تھے۔ مجھے بنگال کے لوگوں سے الفت اور ہمدردی رہی ہے۔ وہاں کے لوگوں میں باعزت عجز و انکساری ہے۔ غربت کے باوجود خودداری ہے، سادگی ہے، کسی قسم کا تصنّع نہیں، بہت محنت کش ہیں، بے حد جذباتی ہیں۔ جذبات کی رو میں بہہ کر اپنا نفع نقصان سب بھول جاتے ہیں۔ ہر کنبے کی چھوٹی سی دنیا آباد ہے۔ جنگلوں اور دریاؤں کے درمیان مختصر ضروریاتِ زندگی کے ساتھ دن گذارتے چلے جاتے ہیں۔ پُرانے لوگ نماز روزہ کے پابند ہیں لیکن نئی پود میں مذہب کی لگن کم ہے۔ اس کے علاوہ میرے اس اُنس کی وجہ ہمارے ملک کے دو حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا۔ میرے لئے یہ فاصلہ آپس کی کشش کا اثر رکھتا تھا۔ میرے کئی بنگالی دوست ہیں جن کی دوستی مخلصانہ ہے۔ میرے دل میں اُن کے لئے عزّت ہے جو ہمیشہ رہے گی۔ ان دو بنگالی بچوں کے سر پر میں نے دستِ شفقت پھیرا۔ شاید پھر یہاں کے بچوں کے سر پر یوں ہاتھ نہ پھیر سکوں۔ میری جیب میں اُس وقت کوئی بارہ تیرہ سو روپے تھے۔ میں نے اُن سے اُن کا نام پوچھا مگر وہ میری زبان نہ سمجھ سکے اور مجھے بنگلہ نہ آتی تھی۔ میں نے دونوں کو دس دس کا ایک ایک نوٹ

دیا، وہ اسے لے کر بے حد خوش ہوئے۔ اُن کو خوش دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ میں نے اُنہیں اپنی باڑی کی طرف لے جانے کے لئے کہا تاکہ ان کے والد سے مل کر مدد حاصل کر سکوں۔ دونوں بچے خوشی سے شور مچاتے اپنی باڑی کی طرف بھاگے۔ میں ان کے پیچھے چل دیا۔ ہم چند قدم ہی آگے گئے ہوں گے کہ قریب کی باڑیوں میں سے کئی اور بچے آ گئے۔ انہوں نے مجھ سے کچھ مانگا تو نہیں مگر میں سمجھ گیا کہ ان کی نظریں کس چیز کی طالب ہیں۔ میں نے ہر ایک کو دس دس کا نوٹ دیا۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ ایک ہمارے لئے دو عدد کرسیاں اٹھا لایا۔ ایک ڈھاب (ناریل کا پانی) ہمارے پینے کے لئے لے آیا۔ نہ تو میرے پاس بیٹھنے کا وقت تھا اور نہ ہی ڈھاب پینے کا۔ مجھے تو جیپ کو پار کر کے بھارتی کمانڈر سے رابطہ قائم کرنے کی جلدی تھی۔ یہ سب لوگ اس وقت تک پاکستان کے باشندے تھے اور چند گھنٹوں کے بعد جنگ بندی کے ساتھ ہی وہ بنگلہ دیشی بنا دیئے جانیوالے تھے اور میں خود ان کے نئے ملک کے دشمن ملک کا باشندہ بن کر رہ جانے والا تھا۔ اسی سرزمین کی خاطر اور اس کی حفاظت کے لئے ہمارے کئی ساتھیوں نے اپنی جانیں نچھاور کیں۔ ہم لڑے، ان ہی لوگوں کا تحفظ ہمارا فرض اوّلین تھا۔ مگر کاش ہماری حکومت ایسے حالات نہ پیدا کرتی جو اندرونی انتشار کی وجہ بنے اور جس سے فائدہ اٹھا کر بھارت نے شرمناک جارحیت کی۔

وہ سب بے حد غریب لوگ تھے۔ میں نے ان میں سے کچھ زیادہ غریب عورتوں اور مردوں کو پچاس پچاس روپے دیئے۔ اُن لوگوں کو میں نے حالات سے آگاہ کیا تو اُن کے چہروں کے تاثرات سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ غمگین تھے۔ چند کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ باری باری میرے ساتھ بغلگیر ہوئے۔ مَیں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے بعد یہاں کے لوگوں سے میری طویل عرصہ کے لئے علیحدگی رہے گی۔ اس لئے میں نے ان کو بڑے تپاک سے گلے لگایا وہ لمحے اور منظر میں زندگی بھر نہیں بھول پاؤں گا۔ ایک بوڑھی اماں نے ایک بچے کو جس کا نام ابوبکر تھا ایک تعویز میرے گلے میں ڈالنے کے لئے دیا۔ جو میں نے سر جھکا کر گلے میں ڈلوایا۔ اُس

کا یہ تحفہ میرے لئے گراں قدر سرمایہ تھا۔ کیونکہ یہ تعویز دے کر اس بڑھیا نے جن جذبات کا اظہار کیا انہوں نے میرے بجھے ہوئے دل میں اُمید کی کرن روشن کر دی کہ وہ دن زیادہ دُور نہیں جب ہم پھر ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے۔ بنگال کے مسلمان ماضی کی تلخیوں کو بھول کر پھر سے ہمارے ساتھ برادرانہ رشتوں میں منسلک ہو جائیں گے۔

اُن لوگوں نے میری جیپ کو دھکیل کر پار کیا۔ اُن کی دی ہوئی دعائیں اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ میں ذرا آگے آیا تو اِدھر اُدھر سے گولیاں چل رہی تھیں۔ ذرا ہٹ کر درختوں کے پار ٹینکوں کے چلنے اور وقفہ کے بعد فائر کرنے کی آواز آرہی تھی۔ برکت علی نے سفید جھنڈا جیپ کے اوپر لگایا اور میں دھیرے دھیرے جیپ چلانے لگا۔ دل میں بار بار خیال آتا کہ کیا دشمن کا سپاہی یا ٹینک میری جیپ دیکھ کر مجھے اتنا موقع دے گا کہ میں اسے اپنے آنے کی وجہ بتا سکوں یا وہ گھبراہٹ میں گولی چلا دے گا۔ درختوں کی وجہ سے نگاہ زیادہ دور تک نہ جا سکتی تھی۔ درختوں میں سے گولیاں گزر کر ہمارے سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اپنے ڈرائیور اور اردلی دونوں کے چہروں پر میں پریشانی کے آثار دیکھ سکتا تھا کیونکہ ٹینک کا فقط ایک گولہ ہمیں بمعہ اپنی جیپ کے ریزہ ریزہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ دُور درخت کی آڑ سے ایک مشین گن نے ہماری جیپ پر فائر کیا۔ گولیاں جیپ کے بالکل سامنے سڑک پر لگیں۔ میں نے جیپ کو فوراً روک لیا اور برکت علی کو زور زور سے سفید جھنڈا ہلانے کو کہا۔ ایک اور چھوٹا سا مشین گن کا برسٹ آیا اور اس کے ساتھ ہی بھارتی فوج کا ایک دستہ بندوقیں اور مشین گنیں سنبھالے جیپ کے سامنے دُور سڑک کی اوٹ میں لیٹ کر ہمیں ہینڈز اپ کرنے کے لئے شور مچانے لگا۔ میں خاموشی سے جیپ میں بیٹھا رہا۔ برکت علی لگاتار جھنڈا ہلا رہا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں آگے آنے کے لئے کہا مگر وہ نہ ہلے۔ میں نے جیپ سے باہر نکل کر ان کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ وہ لگاتار ہینڈز اپ کی رٹ لگائے جا رہے تھے۔ مَیں نے زور سے پکار کر کہا کہ اپنے افسر کو بلاؤ۔ چند لمحوں کے لئے میں رُک گیا کیونکہ انہوں نے ہالٹ ہالٹ

پکارنا شروع کر دیا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے دو ٹینک درختوں کے جھنڈ میں سے نکلے اور ہمیں دونوں طرف سے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ دُور میں نے سڑک پر ایک فوجی افسر کو آتے دیکھا جس کے پیچھے وائرلیس سیٹ لئے ایک اور فوجی تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی افسر ہوگا۔ میں نے اسے اشارہ کیا اور اپنی طرف بلایا۔ میرا اندازہ درست نکلا، وہ بھارتی فوج کا افسر تھا۔ میں نے اپنی پیٹی سے پستول لگایا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ذرا فاصلہ پر آکر رُک گیا۔ اس کے سپاہیوں نے اس کے اشارے پر ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ بندوقیں فائرنگ پوزیشن پر رکھے وہ ہمارے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔ میں نے انگریزی میں اُسے بتایا کہ میں کون ہوں اور یہ کہ اس غیر ضروری گھبراہٹ کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس پر اس نے اپنے سپاہیوں کو پرے چلے جانے کا حکم دیا۔ وہ آگے بڑھا اور مجھے فوجی انداز سے سلیوٹ کیا جس کا میں نے فوجی انداز ہی میں جواب دیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں جنرل نیازی کی طرف سے جنرل مانک شاہ کے لئے پیغام لے کر آیا ہوں۔ چونکہ جنگ بندی کا فیصلہ ہو چکا ہے اس لئے وہ اپنی فوجوں کو جنگ بندی کا حکم دے۔

یہ میجر سری رام سنگھ تھا۔ اس نے اپنے وائرلیس سیٹ سے اپنے بٹالین ہیڈ کوارٹرز سے بات کی۔ چند منٹوں میں اُن کی بٹالین کا سیکنڈ اِن کمانڈ میجر کور میبا اور بٹالین کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل جیک ٹورپی وہاں پہنچ گئے۔ یہ سب افسر نمبر ۵ مرہٹہ لائیٹ انفنٹری سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے پیغام کی ایک کاپی کرنل ٹورپی کو دی جو اُس نے اسی وقت ایک سپاہی کے ہاتھ اپنے بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز کو روانہ کر دی تاکہ متعلقہ افسر کو بھجوائی جا سکے۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کا بریگیڈ کمانڈر اور ڈویژن کمانڈر میجر جنرل برآر جو ایک سکھ افسر تھا وہاں پہنچ گئے۔ جنرل بھارتی نمبر ۴ مونٹن ڈویژن کا کمانڈر تھا۔ میں نے اُن کو حالات سے آگاہ کیا تو ڈویژنل کمانڈر نے جنگ بند کرنے کا حکم دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی اِکّا دُکّا گولی چلنے کی آواز کافی دیر تک آتی رہی مگر دھواں دار بمباری بند ہو گئی۔ میجر کور میبا نے اغلباً بریگیڈ کمانڈر کے کہنے پر مجھے

اپنا پستول اس کے حوالے کرنے کو کہا، شاید ان کو ڈر پیدا ہوا کہ میں کہیں ان پر گولی نہ چلا دوں۔ ہم سب وہاں سڑک کے درمیان کھڑے تھے۔ چاروں طرف بھارتی فوجی آڑ لے کر بندوقیں تھامے پوزیشن لئے ہوئے تھے۔ چار عدد ٹینک بھی چاروں طرف کھڑے تھے۔ میں ڈویژنل کمانڈر سے مخاطب ہوا اور اُسے کہا کہ میں یہاں ہتھیار ڈالنے نہیں آیا بلکہ ایک نمائندہ کی حیثیت سے پیغام پہنچانے اور جنگ بندی کی تفصیلات طے کرنے آیا ہوں، اس لئے مجھ سے میرا پستول مانگنا ایک ناجائز عمل ہوگا۔ میرے اردلی اور ڈرائیور سے بھی انہوں نے ہتھیار لے لئے تھے۔ کچھ سوچ کر جنرل برآر نے میجر کور مبیا کو میرا پستول لینے سے منع کیا۔ جنرل برآر نے ہماری فوجوں کی پوزیشن کے متعلق سوال کیا۔ جواب میں مَیں نے اسے کہا کہ یہ غیر موزوں سوال ہے اور وہ اس کے جواب کی مجھ سے امید نہیں کر سکتا۔ میں نے اس کی یقین دہانی کروائی کہ عقب میں ہماری فوجیں جنگ بندی کی پوری طرح پابندی کریں گی اور یہ کہ ان کی فوجیں اُس وقت تک آگے نہ بڑھیں جب تک جنرل اروڑا (جو کہ بھارتی ایسٹرن کمانڈز کے کمانڈر تھے) اور جنرل نیازی میں تفصیلات طے نہ پا جائیں۔ انہوں نے اس بات پر مجھ سے اتفاق کیا۔ یہ میں تسلیم کروں گا کہ جنرل برآر اور اس کے زیر کمان افسروں کا جو کہ وہاں موجود تھے، رویّہ میرے ساتھ بالکل سپاہیانہ تھا، جس کی مجھے بہت کم توقع تھی۔ جنرل برآر نے ۲۲ راجپوت بٹالین کے کچھ جنگی قیدیوں کے متعلق جو کشتیا میں ہماری فوج کے قبضے میں آئے تھے اُن کے قتل کئے جانے پر مجھ سے شکایت کی۔ مَیں نے اسے بتایا کہ ہمارے پاس اس کے ایک افسر اور پندرہ جوان قیدی ہیں اور مارے جانے والوں کی تعداد جو سو کے لگ بھگ تھی وہ تو حملہ کے وقت مارے گئے تھے اور ایسا تو آخر لڑائی میں ہوتا بھی ہے اور جائز بھی ہے۔ کشتیا میں ہماری فوج نے دشمن کو بہت جانی اور مالی نقصان پہنچا کر اس کے حملے کو پسپا کر دیا تھا۔ وہاں اس کے تین ٹھیک حالت میں ٹینک ہمارے قبضہ میں آئے تھے اور چار تباہ کر دیئے گئے تھے۔ دوسرے دن میں نے ان کے سولہ قیدیوں کی خیریت کی خبر ان کو دی تو وہ قدرے مطمئن ہوئے۔ مگر اُن کو پھر بھی شکایت تھی

کہ ان کے ۲۵ کے قریب قیدیوں کو کشتیا میں قتل کر دیا گیا ہے جبکہ وہ ہتھیار ڈال چکے تھے۔ یہ ان کا الزام اغلباً غلط تھا مگر اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے بعد میں بھارتی حکام نے کشتیا کی ہماری فوج کے چند افسروں کو سات آٹھ ماہ تک قید تنہائی میں رکھا اور ان کے ساتھ سختی برتی۔ اُن سے چند اور تفصیلات طے کرنے کے بعد میں فرید پور لوٹ آیا۔ اُس وقت دن کے بارہ بجے ہوں گے۔ میں اُن سے یہ فیصلہ کر آیا تھا کہ میں ڈھاکہ سے بات چیت کرنے کے بعد، بعد از دوپہر پھر آؤں گا۔ فرید پور پہنچنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے ایسٹرن کمانڈر نے ہتھیار ڈال دینے کا حکم دیا تھا۔ ابھی تک میرے دل میں ایک مدھم سی امید تھی کہ شاید جنگ بندی بہتر شرائط پر طے پا جائے جن کے تحت کوئی باعزت سمجھوتہ ہو جائے مگر ظاہر تھا کہ ہماری شکست در شکست کے بعد بھارت کے کمانڈر غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کے مطالبے سے کم کسی چیز پر رضامند نہ ہوں گے۔ ایسی ہزیمت شاید ہماری قسمت میں لکھی تھی۔ کہتے ہیں انسان اپنی قسمت خود تحریر کرتا ہے۔ کیا ایسی شرمناک شکست کے ہم خود بانی اور ذمہ دار تھے؟ شاید ہوں۔

## ۳

کمارکھلی سے فرید پور واپس آنے سے پہلے میں نے جنرل برآر سے اپنے مغربی پاکستان پولیس اور ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز کے دستوں کے متعلق جو بھاٹیہ پارا، مداری پور، بورگھاٹہ، باریسال، نواکھلی اور بھولا کے علاقوں میں گھرے رہ گئے تھے بات کی اور ان کو محفوظ جگہوں پر لانے کے لئے تجویز پیش کی کیونکہ جنگ بندی کے بعد ان تمام دُور دراز علاقوں میں پاکستان دشمن عناصر کی سرگرمیاں تیز ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے ان کے انخلاء کے لئے جوائنٹ منصوبے کی ضرورت تھی ورنہ وہ ان دُور دراز علاقوں میں گھرے کے گھرے رہ جاتے اور بدلے کا شکار ہو جاتے۔ جنرل برآر نے میرے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ میرے مشورے کے مطابق کچھ بندوبست ضرور کرے گا۔

بدترین بات تو ہونی طے پا چکی تھی یعنی ہمیں غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے تھے۔ بہرحال ضرورت اس بات کی تھی کہ ہتھیار ڈالنے کی رسم نہ ہونے پائے اور دوسرے ہمارے ڈویژنل کمانڈر کو کسی ایسی عام رسم میں ندامت اور شرمندگی کے ماحول سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ جنرل انصاری حوصلہ مند شخص تھے۔ شکست کا احساس ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ وہ بے حد غمگین اور افسردہ تھے۔ میں نے انہیں کرنل آفریدی اور کرنل این ڈی قریشی (جو ہمارے ڈی۔ ایم۔ ایس تھے) کو میری روانگی کے اندازاً ایک گھنٹہ بعد کمارکھلی آنے کی درخواست کی اور میں کمارکھلی کی طرف واپس لوٹا۔ دوپہر کے دو بجے ہوں گے۔ اس وقت تک ریڈیو پر یہ خبر عام ہو چکی تھی کہ پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ جنگ بندی ہو چکی ہے اور بھارتی افواج ڈھاکہ میں داخل ہو چکی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیہاتوں میں جو مکتی باہنی کے کارندے چھپے تھے کھُلے بندوں سڑکوں اور بازاروں میں نکل آئے۔ میں فرید پور سے ابھی دس میل دُور گیا ہوں گا کہ میری جیپ پر گھات میں بیٹھے بیس پچیس مکتی باہنیوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ میں نے جیپ کو روکا تو وہ ہم پر ٹوٹ پڑے۔ زیادہ تر ہمارا سامان لوٹنے کے پیچھے پڑ گئے۔ ہماری گھڑیاں اور بٹوے چھین لئے۔ وہ ہمیں گرفتار کر کے گاؤں کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ جب اُن میں سے چند نے مجھے زبردستی دھکیلنے کی کوشش کی تو میں نے مزاحمت کی۔ ایک نے گولی چلائی جو میرے سویٹر سے گھستی ہوئی نکل گئی، میں بال بال بچ گیا۔ جب وہ سامان لوٹنے میں مشغول تھے تو ایک نے میری جیپ کا ڈیش بورڈ کھولا۔ اس میں میرا قرآن مجید پڑا تھا۔ اُسے نکال کر اُس نے چوما، آنکھوں سے لگایا اور پھر اندر رکھ دیا۔ ابھی ان سے میری کشمکش اور تکرار جاری تھی کہ ذرا فاصلے پر ایک پتلون پوش نظر آیا جو ذرا بہتر تعلیم یافتہ دکھائی دیتا تھا میں نے اُسے اپنی طرف پکارا۔ وہ بھی انہی لوگوں کا ساتھی تھا۔ میں نے اُسے موقع کی نوعیت اور حالات سے روشناس کیا۔ بڑی مشکل کے بعد وہ میرے ساتھ اپنی مکتی باہنی کے

جوان لے کر چلنے کے لئے تیار ہوا۔ میں ان کو لے کر کمار کھلی کے قریب آیا جہاں کرنل ٹورپی اور اس کے افسر میرا انتظار کر رہے تھے۔ کرنل ٹورپی نے میرے کہنے پر میجر سری رام سنگھ کو اُسی پتلون پوش کے ہمراہ میرے تین سپاہیوں کو لانے کے لئے بھیجا جنہیں یرغمال کے طور پر وہیں رکھ لیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ ان کو چھڑوا کر لایا۔

کرنل ٹورپی کو میں نے حالات سے آگاہ کیا اور اس سے طے پایا کہ بھارتی فوج فریدپور نہیں جائے گی۔ ہم اپنی فوجوں کو فریدپور میں اکٹھا کریں گے اور اس کے بعد منتقلی کا کام شروع کیا جائے گا اور یہ کہ ہمارے ڈویژنل کمانڈر اور دو سینیئر افسر وہاں پہنچنے والے ہیں۔ چنانچہ جنرل برار اُن سے ملنے کے لئے آیا۔ جنرل برار جنرل انصاری کو اپنے ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر ساتھ لے گیا۔ اُن کے چلے جانے سے ایک لحاظ سے میرے سر سے بھاری بوجھ کم ہوا کیونکہ میں اُن کو کسی ہتھیار ڈالنے کی رسم میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ کرنل افریدی اور کرنل قریشی کو واپس فریدپور جانا پڑا۔ مجھے خود ۵ مرہٹہ بٹالین کے ساتھ وہیں کمار کھلی ٹھہرنا تھا۔ بات چیت سے صورتحال یوں نکلی کہ ہتھیار ڈالنے کی رسم نہ ہوئی۔ شکست بذاتِ خود بڑا پریشان کن سانحہ تھا۔ فریدپور شہر میں عوام کے سامنے جو آج تک ہمارے بھائی بند اور ہم وطن تھے ہتھیار ڈالے جانے کی رسم ایک فحش ڈرامے سے کم نہ ہوتی جس میں اغلباً پاکستان دشمن عناصر تو تالیاں بجاتے اور پاکستان پسند لوگوں کے دل ٹوٹ جاتے۔

جو کچھ میں اس حصہ میں تحریر کر رہا ہوں وہ ایک کہانی ہے، ایک سیاہ کہانی۔ اس کہانی کے بیان کرنے میں مَیں حالات اور جذبات کو توڑ موڑ کر پیش نہیں کر رہا بلکہ یادداشت کے مطابق ٹھیک ٹھیک نقشہ کھینچنے کی کوشش کر رہا ہوں، اگر کوئی بات میں نے یا ہم نے بُری کی ہے تو میں اسی طرح بیان کروں گا۔ اگر دشمن نے کوئی بات اچھی کی ہے تو اسے بے جا طور پر غلط بنا کر نہیں لکھوں گا۔ اگر ایسا کروں تو میری تحریر حقائق پر مبنی نہ ہوگی۔ محض افسانہ بن جائے گی۔ اس موضوع پر ایک اچھا افسانہ نگار بغیر موقع پر ہوتے ہوئے بھی ایک بلکہ کئی دلچسپ افسانے گھڑ سکتا ہے۔ مجھے

حقیقت پر مبنی اس پوری واردات کی داستان پیش کرنی ہوگی۔ بقول انگریزی محاورے کے میں حکم کے پتّے کو حکم کا پتّہ ہی کہوں گا یا بقول سعادت حسن منٹو کے ہم پستان کو پستان ہی کہیں گے اُسے میز، مونگ پھلی یا اُسترہ نہیں کہیں گے۔

کرنل ٹورپی حیدر آباد کا رہنے والا تھا۔ بڑی شُستہ اور سلیس اُردو بولتا تھا۔ مجھے یہ لکھنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ ایک اچھا افسر دکھائی دیتا تھا جو سپاہ گری کی روایات سے بخوبی واقف تھا۔ میرے ساتھ اس کا رویّہ نہایت سپاہیانہ رہا۔ اُس کے اس سپاہیانہ رویّے کی تعریف نہ کر کے میں گھٹیاپن اور تنگ نظری کا ثبوت دوں گا۔ اس کا رویّہ قابلِ قدر تھا۔ اُس نے کسی فاتحانہ پن کا مظاہرہ نہ خود کیا اور نہ ہی اپنے ماتحت کسی افسر کو کرنے دیا۔ مجھے دِل شکستہ دیکھ کر وہ گاہے بگاہے یہ شعر پڑھتا ؎

مدعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

کرنل ٹورپی کی بٹالین کے باقی افسروں نے بھی مہذب ہونے کا ثبوت دیا۔ یہ شاید اُن کو اپنے کمانڈنگ افسر کی طرف سے ہدایت کا نتیجہ تھا البتہ باہر سے آئے ہوئے چند بھارتی افسروں کا رویّہ غیر مہذبانہ تھا جن میں لیفٹیننٹ کرنل داس گپتا مہار بٹالین جو کہ کرشن نگر میں مقیم ۲ کور ہیڈ کوارٹرز سے تعلق رکھتا تھا سب سے سبقت لے گیا۔ اُس نے بدکلامی سے بھی کام لیا اور اپنی بدتہذیبی اور ناکارہ پرورش کا بھی ثبوت دیا۔ ایسے موقعوں پر ہارے ہوئے سپاہی کے جذبات کا اندازہ لگانا آسان کام نہیں۔ کچھ شرمندگی، کچھ بے بسی پھر دشمن کی طرف حقارت، کچھ غم و غصّہ، ان سب عناصر کے مِلے جُلے جذبات جو ان حالات میں پیدا ہوتے ہیں تو ان پر ضبط کرنا ایک کٹھن کام بن جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اکثر دل کو جھوٹی تسلی دینی پڑی لیکن یہ ضبط اور جبر دل و دماغ پر کاری ضرب لگاتا رہا۔ آزادی اور عزت سے بڑھ کر اور انسان کو کیا چیز پیاری ہو سکتی ہے۔ اس شکست میں ہم یہ دونوں کھو چکے تھے۔ اس خوفناک صورت اور اس کے بعد دشمن کی قید کی صعوبتوں کو جانتے ہوئے بھی کیوں نہ ہم نے

کٹ مرنے کو اس بے عزتی اور قید کی زندگی پر ترجیح دی، یہ سوال شاید باقی ماندہ زندگی دماغ میں گھومتا رہے گا۔ اس میں شک نہیں کہ کٹ مرنے کے باوجود بھی شاید ہم اپنے ملک کی تقسیم کو نہ بچا سکتے لیکن یہ ضرور ہوتا کہ دشمن اپنی جارحیت کی بھاری قیمت ادا کرتا اور ہم اپنے ملک کی آئندہ نسلوں کے لئے ایسی روایات چھوڑ جاتے جو ان کے لیے مشعلِ راہ بنتیں اور وہ بڑے فخر سے یہ کہتے کہ ہم نے کٹ مرنا سیکھا ہے ہتھیار ڈالنا نہیں، اس لحاظ سے ہم قوم کی امیدوں کو پورا نہ کر پائے۔ یہ ہماری کمزوری تھی کہنا آسان ہے مگر مرنا شاید کہنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ ایسے جذبۂ شہادت کو اُبھارنے کے لئے ہمیں سچے دل سے اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینے کے لئے سچائی سے کام لینا چاہیئے۔ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے سے انسان صرف اپنے آپ کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مشرقی پاکستان میں ہمارے حالات بالکل مختلف تھے اور مخالف تھے۔ مگر پھر بھی سرفروشوں کے لئے بدترین حالات میں بھی موت سے بڑھ کر اور کیا نقصان ہو سکتا تھا شاید سرفروشی اور شہادت کی تمنّا دلوں سے مفقود ہو چکی تھی۔ اس کمزوری کو تسلیم کر کے رفع کرنا ہی ہمارے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ اس کی ناپیدگی کے دفاع میں دلائل پیش کرنے سے ہم محض خود کو دھوکہ دے سکتے ہیں۔ دوسروں کو ہم خیال نہیں بنا سکتے۔

فرید پور میں بیشتر فوجی سگنلز اور سروسز یعنی سپلائی۔ میڈیکل اور آرڈی نینس وغیرہ کے تھے۔ کچھ آرٹلری کے افراد اور جوان تھے، انفنٹری کے کچھ جوان کمار کھلی کی لڑائی میں شہید ہو گئے تھے اور کچھ جنگی قیدی بنا لئے گئے تھے اور باقی فرید پور پہنچ گئے تھے۔ کسی ملک میں اپنی فوج کو ایسی انوکھی اور اندوہ گیں صورتِ حال کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو گا جیسا کہ پاکستانی افواج کو کرنا پڑا۔ اگر اپنے ملک میں ملک دشمن عناصر اور وہاں کے عوام سے خطرہ نہ ہوتا تو ہزارہا فوجی بجائے بھارت کی قید میں جانے کے نیپال، برما اور بھارت سے ہو کر پاکستان پہنچ سکتے تھے۔ پاکستان دشمن عناصر کا ۱۶ ر دسمبر کے بعد تمام طرف کنٹرول تھا۔ اُن کے ڈر کے مارے کوئی بھی کسی فوجی کو پناہ دینے یا مدد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی بھاگ نکلنے کی تدبیر نہ کی۔ کیونکہ بیچ

نکلنا نہ صرف مشکل تھا بلکہ کچھ حد تک ناممکن۔

تین روز میں کمار کھلی ہی میں رہا۔ فرید پور سے ہمارے فوجیوں کو بھارت میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مجھے باریسال، مداری پور، بھاٹیہ پارا اور گورندی میں پھنسے ہوتے اپنے لوگوں کا بے حد فکر تھا۔ اس کے لئے دو تین مرتبہ جنرل برآر سے بات کی۔ ۱۹ دسمبر کو میں فرید پور آگیا۔ ۲۰ دسمبر کو صبح جنرل برآر نے میرے ساتھ میجر دیوی دیال سنگھ کو جو نمبر ۶ سکھ لائٹ انفنٹری بٹالین سے تعلق رکھتا تھا بمعہ ایک پلاٹون کے بھیجنے کی ہدایت کی چنانچہ ہم علی الصبح ہی مداری پور بذریعہ جیپ روانہ ہوئے۔ فرید پور شہر میں کرنل ٹوپی کی بٹالین آچکی تھی۔ مکتی باہنی کے دو گروہوں نے شہر میں علیحدہ علیحدہ ہیڈ کوارٹرز بنا لئے تھے۔ ایک وہ جو بھاگ کر بھارت چلے گئے تھے اور اب واپس پہنچے تھے۔ دوسرے وہ جو وہیں رہے تھے۔ وہ گروہ اپنی اپنی اتھارٹی رائج کرنے کے لئے برسرِ پیکار تھے۔ شہر میں ہر طرف بنگلہ دیش کے سُرخ اور سبز جھنڈے لگے ہوئے دکھائی دیتے تھے، جہاں چند روز پیشتر پاکستان کے جھنڈے دکھائی دیا کرتے تھے۔ شہر میں ہر طرف لوگوں کے جھمگٹے تھے جو بنگلہ دیش۔ بنگلہ دیش۔ زندہ باد۔ زندہ باد۔ شیخ مجیب۔ شیخ مجیب۔ زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے، سڑکوں پر نعرے لگانے والوں کی بڑی تعداد تھی اور وہ بے حد خوش نظر آتے تھے۔ جن کو اس سانحہ سے رنج پہنچا تھا ان کا رویّہ کیا تھا اس کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا۔ چند ایسے لوگوں کو میں ملا وہ بہت غمگین نظر آرہے تھے۔ کئی ایسے بھی تھے جو اپنی آزادی سے تو خوش تھے مگر ہندو اور ہندوستان کی دلائی ہوئی آزادی کی وجہ سے ناخوش تھے، نعرے لگانے والوں میں کئی بھارتی فوج کے جوانوں کو دیکھ کر اندرا گاندھی، زندہ باد کے نعرے بھی لگاتے۔ ایک چیز میں نے خاص طور پر محسوس کی اور وہ یہ تھی کہ کسی نے پاکستان یا پاکستانی فوج مردہ باد کا نعرہ بلند نہ کیا۔ مجھے اس بات سے تقویت پہنچی کہ ان لوگوں کو باوجود اس وقت دشمنی کے اپنے پُرانے ملک کے لئے احترام ہے۔ بہر صورت میں نہ صرف

ایک جنگی تبدیلی تھا بلکہ اب ایک بیرونی ملک میں تھا، فریدپور شہر کی سڑکوں سے گذرتے ہوئے میں گلی کوچوں دکانوں اور دیواروں پر نظریں ڈال ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ یہ شہر اب میرے ملک کا حصہ نہیں۔ یہ سب لوگ میرے ہموطن نہیں رہے اجنبی بن چکے ہیں۔ اپنے گرد و نواح کو میں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا گذر گیا۔

ہم ایک جیپ اور دو فوجی ٹرکوں میں سوار تھے۔ میں اور میجر دیال سنگھ سب سے آگے جیپ میں سوار تھے۔ مداری پور جاتے ہوئے سڑک کے کنارے لوگ بڑھ بڑھ کر بھارتی فوج کے اس دستہ کو ودھائی دے رہے تھے۔ اُن میں بیشتر ہندو عورتیں اور مرد تھے۔ دیال سنگھ تو جیپ چلا رہا تھا اور میں اُس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا، چنانچہ یہ عورتیں اور مرد اظہارِ عقیدت کے طور پر میرے پاؤں کو چھوتے اور میرے ہاتھوں کو بوسہ دیتے۔ جو مسلمان تھے وہ میرے ساتھ مصافحہ کرتے اور میرا شکریہ ادا کرتے وہ سب لوگ اس بات سے ناواقف تھے کہ میں پاکستانی فوج کا افسر تھا۔ وہ مجھے بھارتی فوج کے اُس دستہ کا کمانڈر تصور کر رہے تھے۔ دیال سنگھ زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ اور گاہے گاہے مجھے کہتا کہ کرنل صاحب یہ نہیں جانتے کہ آپ کون ہیں۔ اگرچہ یہ کافی مضحکہ خیز منظر تھا۔ میں مصافحہ بڑی گرمجوشی کے ساتھ کر رہا تھا کیونکہ میرے دماغ میں اُن کا تصوّر اپنے مشرقی پاکستانی بھائیوں کا تھا۔ میں اُس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اُن کے دلوں میں پاکستانی فوج کے لیے کس قسم کے جذبات کا طوفان ہے۔ پاک سرزمین پر بھارتی فوج کا خیر مقدم دیکھ کر دل جل رہا تھا۔ ہمارے ملک میں ہی یہ آدم بھگت خون کے آنسو رلواتی تھی۔ کیا ایسے حالات کے ہم خود معمار تھے۔ خانہ جنگی کے دوران سینکڑوں امن پسند عوام کو بے پناہ نقصان اٹھانا پڑا۔ کئی ماہ کی اس کشمکش میں کئی لوگ بے گھر ہوئے اور کئی بے گناہ تشدد کا نشانہ بنے۔ قسمت کی ستم ظریفی کہہ لیجیے کہ عوام کے ایک طبقہ کے لئے کم از کم بھارتی فوج ان کی ہمدرد بن کر وہاں پہنچی تھی۔ ہزیمت کا رنج تو قابلِ برداشت تھا مگر یہ نظارہ دیکھ کر دل پارہ پارہ ہوا جاتا تھا۔

# ۴

۲۰ دسمبر کو شام کے وقت میں نے اپنا ٹرانسسٹر لگایا تو معلوم ہوا کہ جنرل یحییٰ سبکدوش ہو گئے ہیں اور اُن کی جگہ ذوالفقار علی بھٹو صدر کے عہدے پر فائز ہوتے ہیں۔ اس کے بعد صدر بھٹو کی تقریر سنی۔ اس خبر سے دل کو تقویت پہنچی۔ ذاتی طور پر مجھے کبھی جنرل یحییٰ کی قیادت پر اعتماد نہ تھا۔ اب جبکہ وہ قوم کو اس گہرائی اور ذلت میں دھکیلنے کے ذمہ دار بن چکے تھے تو یہ غیر اعتمادی حقارت میں بدل چکی تھی۔ مسٹر بھٹو کی تقریر نے پھر سے کچھ خود اعتمادی کی لہر پیدا کی۔ "ہم بدلہ لے کر رہیں گے" کے الفاظ نے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا۔ دل کی گہرائیوں سے آمین ثم آمین کی آواز نکلی اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کہ اللہ کرے وہ دن دور نہ ہو جب ہم میدان کارزار میں اس بھارتی جارحیت کا خاطر خواہ طور پر بدلہ لیں تاکہ ہزیمت کا داغ ہمارے دامن سے دھل سکے۔

مداری پور روانہ ہونے سے پہلے راج باڑی قصبہ میں جو فرید پور کے شمال میں پندرہ میل کے قریب ہے، قتل و غارت کی خبر ملی۔ اس قصبہ میں بہاریوں کی تعداد کوئی پانچ چھ ہزار کے قریب ہو گی۔ جونہی پاکستان دشمن عناصر کو پاکستانی افواج کو شکست کی خبر ملی تو انہوں نے بہاریوں پر حملے شروع کر دیئے۔ سب کو گھروں سے نکال دیا اور قتل و غارت کا میدان گرم کر دیا۔ میں نے کرنل ٹرپی کو وہاں امن و امان برقرار رکھنے کے لیے اس کی ذمہ داری کا احساس دلایا۔ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اس نے فوج کا ایک دستہ وہاں روانہ کیا۔ بے شمار بہاریوں کو جن میں عورتیں اور بچے سبھی شامل تھے راج باڑی سے فرید پور جیل میں پہنچایا گیا۔ اور ان کی حفاظت کا بندوبست کیا گیا۔ بے شمار تو راج باڑی ہی میں مارے گئے۔

فرید پور اور مداری پور کے درمیان کئی پل ٹوٹے ہوئے تھے اس لئے اگرچہ فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ مگر وہاں پہنچتے پہنچتے گیارہ بج گئے۔ مداری پور میں ہمارے دو افسر اور ۱۵۰ کے قریب جوان تھے۔ جن کی جان کی مجھے سخت فکر تھی، لوگوں سے باز پرس کرتے ہم اُس مکان پر پہنچے جہاں

پچھلے ۲۶ روز سے ہمارے دو میجروں کو بند کر رکھا تھا۔ میں اُن کو وہاں جاکر ملا تو اُن کی جان میں جان آئی چند جوان مارے گئے تھے باقی کو وہاں کے مقامی لوگوں نے حراست میں لے رکھا تھا ان سب کو فرید پور بھجوانے کا بندوبست کیا۔ پھر ہم گورندی روانہ ہوئے۔

دوپہر ایک بجے کے قریب میجر دیال سنگھ اور دس بھارتی سپاہی گورندی کی طرف چل دیئے۔ گورندی کے کالج کی عمارت میں ہمارے ۷۰ جوانوں اور ۸۰ رضاکاروں نے مورچے سنبھال رکھے تھے اور مکتی باہنی نے چاروں طرف سے اُن کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ راستے کے بیشتر پل چونکہ ٹوٹے ہوئے تھے اس لئے اندازاً پندرہ میل کا سفر پیدل ہی طے کرنا پڑا۔ چند میل ہم سائیکل رکشوں پر بیٹھ کر گئے۔ جب وہاں پہنچے تو شام کے چھ بجنے کو تھے۔ کالج کے علاقہ میں ہمارے سپاہیوں اور مکتی باہنی کے درمیان وقتاً فوقتاً فائرنگ ہو رہی تھی۔ دیال سنگھ اور اس کے سپاہیوں کو میں نے فاصلہ پر چھوڑا اور خود رینگتا ہوا کالج کے قریب چار سو گز کے فاصلے پر ایک آڑ میں بیٹھ کر اپنے آدمیوں کو فائرنگ بند کرنے کے لئے کہا، پھر باآواز بلند اُن کو یہ بتانے کی کوشش کرتا رہا کہ میں پاکستانی افسر ہوں اور اُن سے ملنے اور انہیں یہاں سے نکلوانے کی خاطر یہاں آیا ہوں، مگر اُن کو میری بات کا یقین نہ آیا تھا وہ بار بار یہی کہتے کہ ہمارے ساتھ دھوکہ مت کرو۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں اُن کے پاس آکر بات چیت کرتا ہوں تو انہوں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اور اُن کا انچارج جو ایک جے سی او تھا بولا کہ اگر آگے بڑھے تو گولی سے اڑا دیئے جاؤ گے۔ شام ہونے کو تھی اس لئے مجھے جلدی تھی۔ چنانچہ میں آڑ سے نکل کر سڑک پر کالج کی طرف چل دیا۔ میرے ہاتھ میں سفید رومال تھا۔ جو میں زور زور سے ہلا رہا تھا۔ میں چند گز آگے گیا ہوں گا کہ ایک فائر ہوا اور گولی میرے کان کے قریب سے شائیں کرتی ہوئی گذر گئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ واپسی اور ہچکچاہٹ کی صورت میں بچنا ناممکن تھا اور دوسرے اُن سے بات چیت کئے بغیر معاملہ طے ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں بھارتی فوج تشدد پر اُتر آئے گی۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ ۔۔ اور فائر ہوئے۔

میرے سامنے سڑک میں پیوست ہوئے۔ مگر اب میں کالج کی عمارت سے ایک سو گز کے فاصلے پر تھا صوبیدار چلایا کہ وہیں ٹھہر جاؤ ورنہ مشین گن سے اڑا دیئے جاؤ گے۔ میں چار و ناچار رک گیا اور آئندہ آدھ گھنٹہ ان کو دور ہی سے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ کہ میں پاکستانی افسر ہوں اور یہ کہ اب چونکہ جنگ بند ہو چکی ہے، میں ان کے یہاں سے انخلار کے لیے آیا ہوں۔ وہ اس بات پر مصر رہے کہ چونکہ وہ مجھے نہیں پہچانتے اور ہو سکتا ہے کہ میں ان کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ اس لیے جب تک ان کا جاننے والا افسر نہیں آئے گا۔ وہ مورچے نہیں چھوڑیں گے۔ لہجے سے وہ صوبیدار اور اس کا ساتھی مجھے پٹھان معلوم ہوئے یہ سمجھتے ہوئے کہ اپنی شناخت کا یقین دلانے کے لئے شاید پشتو کے چند جملے بولنے سے کام نکل آئے گا۔ میں نے پشتو میں اس کا حال پوچھا اور یقین دلایا۔ اس پر اس نے پشتو میں لمبا چوڑا سوال کر ڈالا۔ جو میری سمجھ سے بالکل باہر تھا۔ میں نے پشتو میں جواب دیا کہ مجھے تھوڑی پشتو آتی ہے اس کے بعد اردو میں باقی کے جملے کہے اس سے اس کا شک اور بڑھ گیا۔ اندھیرا چھانے والا تھا۔ مجھے چار و ناچار واپس لوٹنا پڑا۔ دیال سنگھ بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا جب اس کو معلوم ہوا کہ انہوں نے میری بات نہیں مانی تو وہ بھی بڑا پریشان ہوا اور چاہتا تھا کہ وہ اپنی مورچہ شکن توپ سے کالج پر فائر کر کے ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرے بڑی مشکل سے میں اس کو راضی کرنے میں کامیاب ہوا۔ آخر ہمارے سپاہی فرض کی ادائیگی کر رہے تھے، اور اپنے افسر کی صحیح شناخت کے بغیر اپنے مورچے چھوڑنے کے لئے راضی نہ تھے ان کا مطالبہ جائز اور سپاہیانہ تھا۔ اگرچہ ان کے انکار سے میں بڑی مشکل میں پڑ گیا۔ مگر دل ہی دل میں ان کی فرض شناسی کو سراہا۔ آخر یہ طے پایا کہ واپس مداری پور چلیں اور وہاں سے ای پی سی اے ایف کے کچھ آدمی جو ان کو جانتے ہوں ساتھ لائیں اور میجر خٹک کو بھی جو پشتو بول سکتا تھا۔ تھکے ماندے واپسی کا لمبا سفر شروع کیا۔ جن سائیکل رکشوں پر ہم نے جانے اور واپسی کا کچھ سفر طے کیا تھا، میں نے ان رکشہ والوں کو دس دس روپے دیئے تو دیال سنگھ میری اس فراخدلی پر کافی حیران ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ لوگ بڑے غریب ہیں اور یہ ہمیں قریباً پانچ میل اپنے رکشوں پر بٹھا کر لائے ہیں۔

اس لیے ان کو محنت کی مزدوری دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں ۔ وہ بولا کہ کرنل صاحب میرا خیال تھا کہ آپ لوگ ان تمام بنگالیوں کے دشمن ہیں ۔ ایسی ہمدردی کے جذبات تو بھارتی فوج نے کبھی امن کے زمانے میں بھی نہیں دکھائے۔ وہ دس کے دس رکشہ والے بے حد خوش ہوئے ۔ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں اور یہ نہ سمجھیں کہ یہ کرایہ بھارتی فوج والے ادا کر رہے ہیں میں نے اُن سے اپنا تعارف کرایا ۔ انہوں نے میرا بڑے خلوص کے ساتھ شکریہ ادا کیا ۔ جب میں نے اُن کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ میری مجبور حالت پر خاموش ہمدردی کے جذبات سے لبریز نظر آتے ۔ نو بجے کے قریب ہم مداری پور واپس پہنچے ۔

رات کو مداری پور کے ایس ڈی او اور عوامی لیگ کے کارکنوں نے بھارتی فوج کے اعزاز میں کھانے کا بندوبست کر رکھا تھا ۔ میں نے مداری پور پہنچتے ہی میجر نشنگ سے رابطہ قائم کیا اس کے علاوہ تین سی اے ایف کے جوانوں کو دوسری صبح گورندی ساتھ چلنے کے لیے منتخب کیا ۔ شام کو اس کھانے میں مَیں بھی شامل تھا ۔ لیکن میرے لیے یہ بڑے دُکھ کی بات تھی کہ بھارتی فوج کو دولہا کی طرح خوش آمدید کہا جا رہا تھا ۔ کھانے پر مجھے عوامی لیگ کے چند اراکین سے ملنے کا اتفاق ہوا جو خانہ جنگی کے دوران یا تو روپوش ہو گئے تھے یا بھارت بھاگ گئے تھے ۔ اور اب وہاں کے معتبر لیڈر تھے سب کے سب جنرل یحییٰ کے سخت خلاف تھے کہ اس نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ بھائی بھائی کا دشمن بن گیا ۔ اُن کو پاکستانی افواج سے اس بات کا گلہ تھا کہ وہ یحییٰ خان کے اشاروں پر عمل کرتے رہے اور بجائے صرف شر پسند بنگالیوں کو سزا دینے کے انہوں نے ہر کسی کو ملک دشمن تصور کر کے ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کیا ۔ اُن میں سے بعض نے یہ بھی کہا کہ اگر حکومت کا خیال تھا کہ عوامی لیگ کے کچھ بڑے کارکن علیحدگی پسند ہیں تو اُن کو گرفتار کیا جانا چاہیئے تھا ۔ نہ کہ اس بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی جس کے دوران گناہ گار اور بے گناہ سب ایک ہی چکی میں پیسے جانے لگے اس بات سے تو وہ خوش معلوم ہوتے تھے کہ خانہ جنگی ختم ہوئی مگر پچھلے چند ماہ کے حالات پر جو ملک کی تباہی کا سبب بنے ، ہر کوئی کفِ دست مَل رہا تھا ،

ماضی میں جو کچھ ہوا تھا بہت بُرا ہوا تھا۔ اُس میں یحییٰ خان کے علاوہ عوامی لیگ اور مجیب الرحمان کا بھی قصور تھا۔ جہاں یحییٰ خان نے تنگ نظری اور خود غرضی کا ثبوت دیا وہاں عوامی لیگ نے صوبائی تعصب کو ہوا اس قدر دی کہ وہ ایک خوفناک آندھی کی شکل اختیار کر گئی۔ ان نمائندوں میں ایسے بھی تھے جن کو بنگلہ دیش۔ بننے کی خوشی تھی مگر کافی ایسے بھی تھے جن کو پاکستان کے دو حصوں میں بٹ جانے کا بے حد رنج بھی تھا۔ وہاں کا ایس ڈی او بڑے فخر سے لوگوں کو بتا رہا تھا، اگرچہ وہ بظاہر حکومت کا وفادار تھا مگر چوری چھپے وہ مکتی باہنی کی مدد کیا کرتا تھا۔ اس کے منہ سے یہ سُن کر مجھے بڑا رنج ہوا اور غصّہ بھی آیا۔ اپنے ناپاک رویے کا اعلانیہ طور پر بیان کرنے میں اس بھاری بھرکم شخص کو ذرّہ بھر عار محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میرے دل میں اس انسان سے مکتی باہنی کے لیے زیادہ قدر تھی کہ انہوں نے جو کچھ کیا اپنے ضمیر کی آواز پر اعلانیہ طور پر کیا، خواہ وہ کسی غلط جذبے کے تحت ہی کیوں نہ تھا۔ مگر جو شخص دیانت دارانہ اصولوں کو پس پشت ڈال کر ملک سے غداری کرتا ہے وہ قابلِ نفرین ہے اور وہ بعد میں بھی قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کا ظاہر اور باطن مختلف اور علیحدہ علیحدہ خیالات اور اعمال کا حامل ہو وہ ایک انتہائی گھٹیا اور کمینہ انسان ہے۔ میرے دل میں ایسے شخص کے لیے انتہائی نفرت کے جذبات کے سوا اس وقت اور کیا ہو سکتا تھا۔

اُسی پارٹی میں ایک سفید ریش ایم این اے سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ اُس کو رنج اس بات کا تھا کہ اگر جنرل یحییٰ خاں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر یا ملک کو بچانے کی خاطر مشرقی پاکستان میں غلط قدم اٹھایا تھا اور اس کے بعد جو دھاندلی وہاں مچی رہی اس کے خلاف مغربی پاکستان کے لیڈروں نے یا عوام نے کیوں صدائے احتجاج بلند نہ کی، وہ خاموش تماشائی کیوں بنے رہے شاید وہ یہ جاننے سے قاصر تھا کہ مغربی پاکستان کے عوام کا مشرقی پاکستان کی صورتِ حال کا صحیح اندازہ لگانا اب بھی مشکل ہو، ایک غیر یقینی فضا تھی۔ شر پسند اس ماحول۔ سے ناجائز اٹھا رہے تھے اور تخریب کاروں کے لیے حالات سازگار۔ بنے رہے۔

دوسرے روز ہی لمبا سفر مداری پور سے گورندی کی طرف کیا گیا۔ میجر خٹک اور سی اے ایف کے جوان بھی ہمارے ساتھ تھے۔ میجر خٹک کو بھی میری طرح پون گھنٹہ اُن سے تکرار کرنی پڑی۔ وہ بڑی مشکل سے آخر مان گئے۔ ان کے ساتھ اسی کے قریب رضاکار بھی تھے۔ مکتی باہنی والے اُن کے خون کے پیاسے دکھائی دیتے تھے کیونکہ انہوں نے بنگالی ہوتے ہوئے بھی اُن کا ساتھ نہ دیا۔ وہ ان کو غدار تصور کرتے تھے۔ اب جبکہ بنگلہ دیش بن گیا تھا تو کل کے محبِ وطن آج کے غدار بن گئے تھے۔ اور کل کے غدار آج کے محبِ وطن۔ میرے لیے ان بنگالی رضاکاروں کی جان بے حد پیاری تھی۔ انہوں نے مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ میں اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ ان کو مکتی باہنی کے رضاکاروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ بڑی بحث و تکرار کے بعد آخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ تمام رضاکاروں کو اپنے اپنے گھروں میں جانے کی اجازت دیدی گئی۔ مجھے خدشہ تھا کہ بعد میں اُن کو ہراساں نہ کیا جائے۔ مگر ان میں سے چند کو بعد میں میں مداری پور ملا تو اُن سے معلوم ہوا کہ وعدے کے مطابق اُن کو کسی طرح کا ضرر نہیں پہنچایا نہ دیا گیا۔

ہمارے دو سپاہی پچھلے دس بارہ روز سے سخت زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک کو بازو میں گولی لگی تھی جس کی وجہ سے اس کو گینگرین ہو گیا تھا۔ دوسرے کی ٹانگ میں گولی لگی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے لیے دو سٹریچر بنائے گئے۔ اسی اثناء میں اردگرد کے گاؤں سے کوئی دس بارہ ہزار لوگ کالج کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ سب بنگلہ دیش زندہ باد اور مجیب زندہ باد کے نعرے لگانے میں مصروف تھے۔ اتنے بڑے مجمع کے درمیان میں سے گذر کر جانا میرے لئے کافی تشویش کا مقام تھا۔ ہمارے ساتھ کل آٹھ مسلح ہندوستانی سپاہی تھے۔ دیال سنگھ بھی کافی پریشان تھا۔ کیونکہ ہمارے لوگوں کے خلاف اس علاقے کے لوگوں کو کافی شکایت تھی کیونکہ اُن میں سے ایک حوالدار نے بڑے رذائل کا مظاہرہ کیا تھا۔ چند عورتوں کی بے حرمتی کی تھی۔ اردگرد گاؤں میں جاکر شاید پیسے بھی بٹورلیا تھا۔ ان میں سے چند معتبر اور معزز لوگ میرے پاس اس کی شکایت لے کر آئے۔ اُن

کا مطالبہ تھا کہ بس صرف اس حوالدار کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ باقی کے خلاف انہیں کوئی شکایت اور گلہ نہ تھا۔ وہ سب اس کے خون کے پیاسے دکھائی دیتے تھے۔ ایسے دور دراز علاقوں میں خراب ڈسپلن اور بدخصلت سپاہی کے لیے بُرے عمل کرنے کے کافی مواقع تھے۔ اگر ہمارے حوالدار نے اپنی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا تھا۔ تو اس نے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ پوری فوج کو بھی بدنام کیا۔ ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کرتی ہے، خیر وہ وقت نہ عدالت لگانے کا تھا نہ ہی سزا دینے کا۔ دیال سنگھ نے لوگوں کو سمجھایا کہ اس کو سرکاری طور پر بعد میں سزا دی جائے گی لیکن وہ اس بات پر رضامند ہونے کو تیار نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ خود اس کو سزا دیں۔ عوام کی طرف سے پتھراؤ کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان میں بے شمار لوگ مسلح تھے اس لیے صورتِ حال سنگین شکل اختیار کر سکتی تھی۔ ابھی یہی بحث جاری تھی کہ مجمع میں سے کسی نے ایک عدد ہوائی فائر کیا پھر کیا تھا۔ سب طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ حالات ہاتھ سے باہر نکلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہم سب بمعہ بھارتی سپاہیوں کے کالج کی عمارت کے اندر گھس گئے۔ آدھ گھنٹے کے قریب خوب گولیاں چلیں۔ بڑی مشکل سے چند مکتی باہنی کے جوانوں کی مدد سے جن کا لیڈر ایک ریٹائرڈ پاکستانی نیوی کا پیٹی افسر تھا، اس بپھرے ہوئے طوفان کو کنٹرول کیا۔ میں ان معتبر نمائندوں سے ملا۔ ان کے جذبات کو سراہا، اپنے حوالدار کی حرکات پر شرمندگی کا اظہار کیا، انہیں مکمل طور پر یقین دہانی کرائی۔ تب جا کر وہ راضی ہوئے۔ کہ حوالدار ہمارے ساتھ جا سکتا ہے۔ دونوں زخمیوں کو سٹریچر پر ڈالا اور اپنے سپاہیوں کو لے کر ہم بالآخر وہاں سے روانہ ہوئے۔ ہجوم ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہمارے ساتھ ساتھ پانچ میل تک چلتا آیا۔ وہ فلک شگاف نعرے لگا رہا تھا، بچے کبھی کبھی پتھر مارنے سے دریغ نہ کرتے۔ سفر لمبا تھا۔ اور ماحول بے حد پُرخطر، اور اگر کوئی ایک آدھ ہوائی فائر ہو جاتا تو پھر شاید ہی کوئی ہم میں سے بچ کر نکل جاتا۔ مجیب الرحمٰن مکتی باہنی کا لیڈر میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ سمجھدار ہونے کے علاوہ ایک حوصلہ مند شخص تھا۔ میرے کہنے پر اس نے مکتی باہنیوں کے ایک گروہ کو ہمارے چاروں طرف متعین کر رکھا تھا تاکہ ہجوم میں سے کوئی

بھی ہمارے سپاہیوں کے قریب نہ آنے پائے۔ دیال سنگھ کافی گھبرایا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ذرا سے اشتعال سے خود اُس کے سپاہیوں کی بھی خیر نہیں۔ وہ مجھے بار بار کہتا کہ کرنل صاحب یہ کس مشکل میں پھنسا دیا ہے۔ میں اُسے تسلی دیتا کہ بس خدا کا نام لے کر چلتے چلو۔ خدا مالک ہے مگر بے سود ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ اس خطرناک صورتِ حال سے تو کوئی فرار نہیں، زیادہ سے زیادہ موت واقع ہو سکتی تھی۔ اس لئے گھبراہٹ لاحاصل تھی۔ اس ماحول کا نقشہ کھینچنا ذرا مشکل کام ہے۔ خطرہ کے علاوہ میرا دماغ لوگوں کے رویّہ سے قدم قدم پر مہلک زخم کھا رہا تھا۔ اپنی قوم کے لوگوں پر افسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اس تمام قضیئے میں اُن کا کیا قصور تھا، حالات نے ہم میں دشمنی پیدا کر دی تھی۔ راستے میں کھڑے لوگ ہم پر انگلیاں اُٹھا رہے تھے۔ کیا یہ سب لوگ ہماری اس حالت پر خوش تھے اس کا جواب تو میں دُرست طور پر نہیں دے سکتا لیکن میرے لئے یہ اندوہناک منظر تھا۔ انسان اپنے بارے میں دوسروں کے ردِعمل کو اپنے جذبات کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ میں نے ہمیشہ مشرقی پاکستانیوں کو اپنا ہم وطن اور عزیز تصور کیا تھا۔ میں نے پناہ گزین کیمپوں میں جا کر سینکڑوں روپوں کے کپڑے اپنی جیب سے خرید کر تقسیم کئے تھے۔ ان کی مصیبت کو اپنی مصیبت اور ان کے دکھوں کو اپنا دُکھ سمجھا تھا۔ ان لوگوں کو اگر سیاسی لیڈروں نے بہکا کر مغربی پاکستان کے خلاف کیا تو اُن کا اس میں کیا دوش تھا۔ غریب اور اَن پڑھ انسان میں یہ بڑی خامی ہوتی ہے کہ وہ جلد دُوسروں کی باتوں پر بغیر پرکھے یقین کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ بنگالی بڑے جذباتی لوگ واقع ہوئے ہیں۔ ہم سے کہیں زیادہ جذباتی اگر کوئی ٹھنڈے دل سے اُن کو سمجھائے تو وہ خلوصِ دل کی آواز کو سن کر مان بھی جاتے ہیں۔ مگر حالات کچھ اس قدر تیزی رفتار سے خراب ہوئے کہ نہ تو دل ہی ٹھنڈے رہے اور نہ ہی سمجھانے والے۔ گولی اور جبر سے کسی کا دل نہیں جیتا جا سکتا۔ انسان کے بدن کو قید کی زنجیروں میں جکڑا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے دل و دماغ کو مقید نہیں کیا جا سکتا۔ کیا انکی ہمدردی کھونے میں ہمارا بھی دوش تھا۔ کیا ہم اکیلے سارے ڈرامے کے ذمہ دار تھے۔ شاید دونوں تھے۔ بس ان ہی خیالات میں ڈوبا ہوا ہم ٹوٹے ہوئے بورگھاٹ پُل کے قریب آن پہنچے۔

بغیر کسی بڑے حادثے کے سفر طے ہو گیا۔ ندی کو ہم نے چھوٹی کشتیوں میں پار کیا۔ دوسری طرف چند فوجی گاڑیاں موجود تھیں۔ پل کے ارد گرد ہزار ہا لوگ جمع تھے، ان کے فلک شگاف نعروں کے درمیان سے گزر کر ہم ٹرکوں میں بیٹھے اور مداری پور کی طرف نکل آئے۔

ہر سوسائٹی، ہر گروہ اور ہر محلہ میں کچھ برے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ بنگالیوں نے بہاریوں اور غیر بنگالیوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی داستانیں بھی لرزہ خیز ہیں۔ چٹا گانگ، کھلنا، راج باڑی اور سنہمار میں جس بے رحمی سے ہزاروں غیر بنگالی عورتوں بچوں اور مردوں کا قتل کیا گیا وہ کوئی من گھڑت کہانی تو نہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس ہولناک ڈرامے کا ہر بنگالی ہیرو تھا سینکڑوں بنگالیوں نے ہزار ہا غیر بنگالیوں کی جانیں بچائیں۔ اگر غیر بنگالی بے رحمی سے قتل کئے گئے تو ان کو قتل کرنے والے کچھ شر پسند اور بد خصلت لوگ تھے۔ اسی طرح اگر بنگالیوں کے ساتھ بعض علاقوں میں زیادتی کی گئی تو یہ سمجھنا بالکل بے جا ہو گا کہ مغربی پاکستان کے تمام لوگ بنگالیوں کے خون کے پیاسے تھے۔ مکان کو آگ لگانے کے لئے ایک آدمی کی دیا سلائی دکھانے سے آگ بھڑک اٹھتی ہے پھر اس مکان کے تمام مکین اس آگ کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور خود آگ لگانے والا دور بیٹھا تماشہ دیکھتا ہے۔ بعینہٖ ہمارے ملک کا بھی ایسا ہی حال ہوا۔

## ۵

مداری پور ہم رات کو پہنچے۔ باریسال کی طرف بھی ہمارے پولیس اور ای پی سی اے ایف کے دستے گھرے ہوئے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد میں بمعہ میجر دیال سنگھ اور بھارتی فوج کے ایک دستہ کے رات کے بارہ بجے سٹیمر میں باریسال کی طرف روانہ ہوا۔ گورندی والے جرالوں کو فرید پور بھجوا دیا گیا۔ دن چڑھے ہم باریسال سے ذرا دور تھے کہ دریا میں سٹیمر ڈوبے ہوئے دکھائی دیئے۔ ایک مچھیرے سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ چند روز قبل باریسال سے پاکستانی فوجی چار سٹیمروں میں روانہ ہوئے۔ بھارت کے ہوائی جہازوں کے حملے سے دو سٹیمر ڈوب گئے اور دو کو

سخت نقصان پہنچا۔ سٹیمروں کے ڈوبنے سے کافی سپاہی شہید ہو گئے۔ یہ دیکھ کر میرے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ لیکن جنگ کی تباہ کاریاں کو دیکھنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنگ ایک ہولناک کھیل ہے۔ موت اور تباہی اس کے جزو ہیں۔ انسان اپنے ساتھیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا دیکھتا ہے۔ کچھ میدانِ جنگ میں کام آتے ہیں اور کچھ ان کی جدائی کا غم سینوں میں چھپائے انہیں یاد کرنے کے لئے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ غم زدہ ہونا قدرتی عمل ہے لیکن بے حوصلہ ہونا مردوں کے شایانِ شان نہیں۔ زندگی میں تمام تباہیوں اور ہولناکیوں کو دیکھ کر انہیں قدرتی عمل قرار دیتے ہوئے ماحول پر قابو پانا ہر انسان اور خاص کر سپاہی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ باریسال میں میرا بڑا بھائی میجر منظور الحق بھی تھا اس کے ساتھ کیا بیتی میں اس سے ناواقف تھا۔ ان چار سٹیمروں میں سے وہ کس میں تھا۔ اسی قسم کے خیالات میرے دماغ میں آرہے تھے۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ جس سٹیمر میں وہ تھا اس کو بھی کافی نقصان پہنچا تھا۔ اس کے چند ساتھی شہید ہو گئے تھے۔ مگر اس کا سٹیمر نقصان کے باوجود نارائن گنج پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

۲۳ دسمبر کو صبح دس بجے کے قریب ہم باریسال پہنچے۔ میں پہلے بھی تین چار دفعہ باریسال جا چکا تھا۔ مگر اب میں محسوس کر رہا تھا کہ میں کسی پرائے ملک کے باریسال میں پہنچا ہوں۔ جیسی وہی تھی وہی عمارات تھیں مگر جا بجا پاکستانی پرچم کی جگہ بنگلہ دیشی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ میں اور دیال سنگھ سیدھے ڈپٹی کمشنر کے دفتر پہنچے۔ ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ضلع کے دیگر افسر وہاں موجود تھے۔ شاید کوئی کانفرنس ہونے والی تھی۔ سب کے سب مجھے بڑی اچھی طرح ملے۔ ڈپٹی کمشنر کی آنکھوں میں سوال تھا کہ اب اس کے مستقبل کے لیے کیا رکھا ہے۔ اس کی جگہ نیا ڈپٹی کمشنر مقرر ہو چکا ہے۔ بنگلہ دیشی حکومت اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی، یہ اس کو معلوم نہ تھا ملک کا وفادار خادم ہونے کی حیثیت سے اس نے اپنا فرض ادا کیا تھا۔ وہ ایک شریف نیک اور مخلص آدمی تھا۔ کیا اس پر بنگلہ دیشی حکومت غداری کے الزام میں مقدمہ چلائے گی؟

دوسرے تمام افسر اور عہدیدار ماضی کے حالات اور خانہ جنگی پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ میری

اپنی رائے یہ تھی کہ وہ بنگلہ دیش بننے سے کوئی غیر معمولی طور پر خوش نہ تھے۔ مستقبل میں صورت کیا بنے گی؟ کیا بھارت کی فوجیں واپس چلی جائیں گی؟ بھارت کس رنگ میں اپنا سیاسی اور اقتصادی تسلط قائم کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس طرح کے خدشات سے وہ ہراساں نظر آتے تھے۔ یہ بات میرے لئے حوصلہ کن تھی کہ وہ شروع سے ایسے انجام کے تمنائی نہ تھے۔ لیکن ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے واقعات کے بعد شاید علیحدگی کے سوا انہیں کوئی چارہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ واپڈا بلڈنگ میں جہاں ہمارے ای پی سی اے ایف کا ہیڈ کوارٹر اور میس ہوا کرتا تھا۔ وہاں مکتی باہنی کا ہیڈ کوارٹر اور میس بنا تھا۔ اس علاقے میں مکتی باہنی کا کمانڈر میجر جلیل تھا۔ جو پرانا آرڈ کور کا افسر تھا۔ اس کا نمبر ۲ کیپٹن بیگ آرڈی ننس سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں پاکستانی فوج کے افسر رہ چکے تھے۔ کیپٹن بیگ سے میں نے اپنے جوانوں کے متعلق پوچھا۔ بھولا اور بیڑا کھلی نون کیا تو معلوم ہوا کہ ہمارے آدمی وہاں سے نکل کر ڈھاکہ کی طرف چلے گئے تھے۔ کیپٹن نہار بمعہ ۵۰ جوانوں کے باریسال کے شمال میں ایک جزکی پر تھا جہاں سے اُن کو لاکر باریسال میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ میں اُن سے ملنے گیا۔ اُن کا حال پوچھا۔ اسی طرح وزیر پور میں گھرے ہوئے انداز اً بیاسی پولیس مینوں کو محفوظ جگہ پر پہنچانے کا بندوبست کیا۔

باریسال میں رات کے قیام کا سوال پیدا ہوا۔ کیپٹن بیگ نے بھارتی فوج کے جوانوں کو ایک مقامی ہوٹل میں ٹھہرانے کا بندوبست کیا تھا۔ مجھے اس نے پیشکش کی کہ میں اس کے ساتھ واپڈا ہاؤس ٹھہروں جہاں مکتی باہنی کا میس تھا۔ دیال سنگھ کو یہ تجویز پسند نہ آئی وہ بولا کرنل صاحب بھی ہوٹل ہی میں ٹھہریں گے کیونکہ حفاظت کی ذمہ داری اس کی تھی۔ کیپٹن بیگ نے جواب دیا۔ دیکھیں میجر صاحب آپ کی ذمہ داری اپنی جگہ ہوگی مگر ہمارے ساتھ رہنے میں بھی کرنل صاحب کو کوئی خطرہ نہیں، آپ کی ذمہ داری پچھلے ایک ہفتہ سے شروع ہوئی ہے اور ہم آپس میں ایک دوسرے کے پچھلے پچیس سال سے غم اور خوشی میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ ہماری اب مزید کوئی دشمنی نہیں، میں اس کا فیصلہ کرنل صاحب پر چھوڑتا ہوں۔ میرے لئے بھارتی فوج اور مکتی باہنی میں

سے کون زیادہ بہتر تھا۔ مکتی باہنی کے پاس ٹھہرنا خطرے سے خالی تو نہ تھا مگر میں اتنی آسانی سے کیپٹن بیگ کی مخلصانہ پیش کش کو رد بھی نہ کر سکتا تھا۔ میں چند لمحوں کے لئے ایک کشمکش میں گھر گیا۔ اگرچہ دل ہی دل میں اپنا جواب جانتا تھا۔ جب میں نے کہا کہ میں مکتی باہنی کے میس میں ٹھہرنا پسند کروں گا۔ تو کیپٹن بیگ وفورِ جذبات سے میرے ساتھ بغل گیر ہو کر کہنے لگا کہ کرنل صاحب آپ نے میری عزت رکھ لی۔ جب کیپٹن بیگ ذرا پرے ہوا تو دیال سنگھ مجھے وہاں ٹھہرنے کے خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اُس سے کہا کہ میرا رکھا اللہ ہے۔ تو وہ چپ ہو گیا۔ میں کیپٹن بیگ کے ساتھ مکتی باہنی میس میں آگیا۔ مکتی باہنی میس میں لیڈروں کی کافی تعداد تھی۔ سب کے سب کالجوں اور سکولوں کے طلباء تھے، کوئی میڈیکل کالج اور کوئی لاء کالج کا کوئی ایف اے اور کوئی بی اے کا طالب علم، ہر ایک نے گلے میں سٹین گن یا رائفل لٹکائی ہوئی تھی۔ ماضی کے حالات اور مستقبل کے متعلق ہم دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ اُن میں سے ہر ایک میرے ساتھ بڑے احترام اور عزت سے پیش آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ باوجود اس خون خرابے کے ہم میں اُنس تھا، اور ایک دوسرے کے لئے ہمدردی کے جذبات تھے۔ خانہ جنگی کے باوجود ہماری دشمنی عارضی تھی۔ وہ لوگ بھی شاید گردشِ دوراں پہ آنسو بہا رہے تھے۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اللہ کرے گا تو پھر ہم ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے۔ ماضی کے حالات ہمارے درمیان مستقل خلیج حائل نہ کر پائیں گے۔ اُن میں سے ہر ایک نے مجھے اپنی تربیت اور معرکوں کی کہانی سنائی۔ بلشتر کو بھارتی حکام نے ڈیرہ ڈون میں تخریب کاری کی تربیت دی تھی اور ان کے افسر اُن کو تخریب کارانہ داتیوں کے لئے مشرقی پاکستان بھیجا کرتے تھے۔

میجر جلیل ڈاک بنگلہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں یہ اطلاع بھی موصول ہو چکی تھی کہ بھارتی فوج کی نمبر ۱ ناگا بٹالین کھلنا سے باریسال کے لئے روانہ ہو چکی ہے۔ میں اور دیال سنگھ کیپٹن بیگ کے ہمراہ میجر جلیل کو ملنے ڈاک بنگلہ گئے۔ دیال سنگھ اُس کے ساتھ ناگا بٹالین

کے باریسال میں قیام کے متعلق بات کرنا چاہتا تھا۔جلیل نے بھارتی فوج کے باریسال میں آنے پر سخت احتجاج کیا۔ اس نے دیال سنگھ کو بتایا۔ میجر صاحب یہاں باریسال کے حالات بالکل ٹھیک ہیں۔ یہاں پاکستانی فوج کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں۔ اس لئے بھارتی فوج کی یہاں آنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ آپ مہربانی کر کے اپنی فوج کو فوراً واپس چلے جانے کا آرڈر دیں۔ دیال سنگھ اُسے کہہ رہا تھا کہ فوج بنگلہ دیش کی حکومت کی مرضی سے آرہی ہے اس پر میجر جلیل بڑا بگڑا اور گرم ہو کر کہنے لگا کہ آپ اپنے کمانڈر کو فوراً بھارتی فوج کے باریسال آنے سے روکیں ورنہ یہاں خون خرابہ ہو جائے گا۔ مجھے میجر جلیل سے پہلے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ مجھے وہ بڑے خلوص سے ملا۔ وہ افسوس کر رہا تھا۔ کہ ہماری پاکستانی فوج کو جس کا وہ خود چند ماہ پہلے افسر تھا کن بُرے حالات میں پھنسا دیا گیا تھا۔ یحییٰ خان اور اس کے ساتھیوں نے اتنی اچھی فوج کا کیا بُرا انجام کر دایا۔ اُس کو اس انجام سے رنج تھا۔ اُس نے اپنے کمانڈنگ افسر لیفٹننٹ کرنل شاہ رفیع عالم اور جنرل گل حسن کو اپنا سلام بھیجا۔ وہ شاہ رفیع عالم کا مداح تھا۔ کہ اُس نے اس کو اچھی تربیت دی تھی۔ اور وہ اس کا دل سے مشکور تھا۔ میں نے اُسے طنزاً کہا کہ اچھی یا خراب تربیت، اُس نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اگر ہمارے ملک کے اندرونی حالات یوں نہ بگڑتے اور ہمارے لیڈر اپنی نااہلی کا ثبوت نہ دیتے تو کیا مجال تھی کہ بھارتی فوج ہماری فوج کا مقابلہ بھی کر پاتی یا جارحیت کے بدلوں چند روز میں سرخرو ہو جاتی اُسے بھارتی فوج کے ساتھ رہ کر ان کی حالت کا اچھی طرح علم تھا وہ جو کچھ کہہ رہا تھا۔ اپنے تجربے کی بناء پر کہہ رہا تھا، دیال سنگھ سے وہ سخت کلامی، ترشی اور روکھے پن سے کام لے رہا تھا۔ لیکن میرے ساتھ اس کا لب و لہجہ نہایت دوستانہ تھا۔ بعد میں میجر دیال سنگھ مجھ سے کہنے لگا۔ دیکھیں کرنل صاحب ہم نے ان لوگوں کے لئے اتنا کچھ کیا ہے لیکن پھر بھی خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ ان کی حکومت نے ہمارے اندرونی انتشار سے فائدہ اٹھا کر جارحیت کی تھی،

اور جو کچھ کیا تھا وہ مشرقی پاکستان کے فائدے کے لیے نہیں بلکہ اپنی خود غرضی کے لیے کیا تھا۔ مسلم بنگال کے عوام بھارت کے ساتھ کیسے دوستی رکھ سکتے ہیں۔ وہاں کے لوگ پاکستان کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ ہمارے شانہ بشانہ کام کر کے انہوں نے جنگ آزادی اور تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ مستقبل میں بھی مسلم بنگال پاکستان کے زیادہ قریب ہوگا۔ ہمارے مذہبی رشتے مضبوط رشتے ہیں۔ یہ صرف تاریخ ہی بتائے گی کہ اس جارحیت سے بھارت نے کیا حاصل کیا ہے۔ اس نے ایک پاکستان کے دو پاکستان بنا دیئے ہیں۔ خواہ ان دونوں کو کسی اور نام سے ہی منسوب کیوں نہ کیا جائے۔

چند روز بعد جب ہم واپس مزید پور پہنچے تو اخبار میں خبر پڑھی کہ میجر جلیل کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ بنگلہ دیش کے مسلمان بھارت کا تسلط قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ یہ جذبہ سطح پر آ کر اس وقت آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹنے گا جب بنگلہ دیش کے موجودہ لیڈر بھارت کی دی ہوئی مدد کے دباؤ تلے اُن کو مراعات دیں گے۔ اُن سے جب لین دین ہوگا، تو پھر اُن کے ذاتی مفاد پر مبنی ان کے اصل منصوبوں کا پتہ چلے گا۔ تو پھر بنگلہ دیش کے لوگ بھارت کی خود غرضی کو خود ہی بھانپ جائیں گے۔ اُن ممالک میں جہاں لوگ اَن پڑھ اور غریب ہوں وہاں عوام سیاسی تحریکوں کے اصل مقاصد کو اکثر نہیں سمجھ پاتے۔ وہاں عوام کی اکثریت خاموش تماشائی ہوا کرتی ہے۔ کیا چھ نکات پر مبنی عوامی لیگ کا منشور ملک اور قوم کے مفاد میں تھا۔ وہاں کے لوگ یہ سمجھنے سے قاصر رہے۔ غریب آدمی کو تو ایسا نظام چاہیئے۔ جو اس کو غربت کی لعنت سے چھٹکارا دلوا سکے۔ جہاں وہ عزت امن اور آزادی کی فضا میں اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھر سکے۔ بعض منشور سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ عمل کرنے کے لیے نہیں۔

مکتی باہنی کے میس میں رات کے کھانے کے بعد بھی بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ نوجوان جو کچھ بھی تھے۔ اور جو کچھ انہوں نے ملک کے عظیم ترین مفاد کے خلاف کیا وہ ایک الگ

بات ہے۔ مگر وہ سب جرأت مند جوان تھے۔ خواہ اُن کی جرأت کو ایک غلط مقصد کے لیے ہی استعمال کیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے جوانمردی اور ایثار سے کام لیا۔ اس قسم کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے مقصد اور نصب العین کی صحت کا یقین ضروری امر ہے۔ حالات نے شاید اُنہیں ایسی یقین دہانی کروائی تھی کہ اُن کے لیے ایسی کشمکش میں حصہ لینا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ اپنی تربیت کے دوران بھارتی عہدیداروں کے رویہ سے بے حد ناخوش تھے۔ انہوں نے مجھے بھاگ گئے ہوئے پناہ گزینوں کی کہانی بڑے دکھی الفاظ میں سنائی جہاں ان کا اصل بھاڑ سے نکالا اور بھٹی میں جھونکنے کے مترادف تھا۔ ایک دفعہ ملک کو چھوڑ کر چلے جانے کے بعد وہ حالات کے دھارے میں بہتے چلے گئے۔ پھر ان کے اپنے اعمال کا تعین کرنا، ان کے اپنے ہاتھوں میں نہ تھا۔ وہ چاہتے بھی تھے تو ان کی واپسی کی اجازت نہ دی جاتی تھی۔ عورتیں بھارتی ہوس پرستوں کا شکار ہوئیں دوسروں نے طرح طرح کے طعنے سُنے اور دُکھ اُٹھائے۔ جیسور کے علاقے میں جب بھارتی فوج نے ۲۱ر نومبر ۱۹۷۱ء کو پہلا حملہ کیا تو وہ تمام علاقہ مکتی باہنی کے لیے ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ کیونکہ ان پر بھارتی فوج کے افسر بالکل بھروسہ نہ کرتے تھے۔ اس بات چیت کے دوران میں نے اپنے جنگی قیدی بنائے جانے پر اظہار ندامت کیا۔ ان میں سے ایک میری بات سمجھ گیا۔ وہ میری مدد کے لئے تیار ہو گیا۔ اور اپنے گاؤں میں مجھے چھپانے کی حامی بھر لی۔ مگر اپنی کامیابی پر اُسے خود زیادہ یقین نہ تھا۔ وہ مخلص معلوم ہوتا تھا اور اُس کی پیشکش ہمدردانہ تھی۔ کافی غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ میری کامیابی کی حد تک مدد کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ بہرصورت میں نے اس کی اس پیشکش کا شکریہ ادا کیا۔

رات کو ہم سٹیمر میں واپس مداری پور کی طرف روانہ ہوئے۔ مداری پور اور فرید پور سے ہمارے تمام افسروں اور سپاہیوں کو ہندوستان میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ میں فرید پور ۲۵ر دسمبر کو پہنچا۔ وہاں مجھے کالج کے دو طالب علم برلب سڑک ملے۔ یہ دونوں نومبر ۱۹۷۱ء کے مہینے میں نڑالی کے قریب مقامی رضاکاروں کے ساتھ مڈبھیڑ میں بمعہ اپنے چند اور ساتھیوں کے پکڑے گئے تھے۔ ان دنوں وہ

مکتی باہنی بن کر بھارت سے تربیت لے کر آئے تھے۔ اگر میں دخل نہ دیتا تو وہ گولی سے اڑا دیئے گئے ہوتے۔ میں نے ان کو اپنی ملٹری پولیس والوں کے پاس حراست میں رکھوا دیا۔ اور ان کو نماز اور قرآن پڑھنے کی تلقین کی۔ چند روز بعد ایک کا باپ جو راج باڑی کا سٹیشن ماسٹر تھا۔ مجھے ملنے آیا، اس کو کہیں سے پتہ چلا تھا کہ اس کا بیٹا پکڑا گیا ہے۔ وہ اپریل کے شروع میں گھر سے بھاگ کر بھارت چلا گیا تھا۔ اپنے بیٹے کی تخریبی کارروائیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے اسے افسوس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے سنگین جرم کی سزا موت کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ایک دفعہ اپنے بیٹے کی صورت دیکھ لے۔ میں نے اس کے بیٹے کو دفتر میں بلوایا۔ دونوں باپ بیٹا سات ماہ کی جدائی کے بعد یوں بغلگیر ہوئے اور روئے کہ مجھے جہاں ان کے ملنے کی خوشی ہوئی وہاں ان کی غم زدگی پر رنج ہوا۔ جب وہ مل چکے تو بڑے میاں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میرا شکریہ ادا کیا اور بڑا دکھی دل لے کر گھر واپس لوٹنے سے پہلے اپنے لخت جگر کو خدا حافظ کہنے کے لئے آگے بڑھا میں نے اس سے کہا: بڑے میاں! یہ کیا؟ کیا آپ ابوبکر کو ساتھ اپنے گھر نہیں لے جائیں گے؟ بوڑھا باپ ہکا بکا کھڑا میرا منہ تک رہا تھا۔ شاید اسے یقین نہ آیا۔ کہ جو میں نے کہا وہ سچ بھی ہو سکتا ہے۔ اس رقت انگیز منظر، باپ بیٹے کا ملاپ اور خود میرے دلی جذبات ان سب باتوں کو احاطہ تحریر میں لانا بے حد مشکل ہے۔ میں نے ابوبکر کو جو کہ بی اے کا طالب علم تھا۔ چند نصیحتیں کیں تا کہ وہ ملک اور قوم کے مفاد کے خلاف دشمن کی باتوں میں نہ آئے اس نے سچے دل سے وعدہ کیا کہ وہ پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ اس کا باپ دعائیں دیتا ہوا اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر چلا گیا، ان دنوں ہمیں ایسے دکھی لوگوں کی دعاؤں کی بے حد ضرورت تھی۔ ہمیں اپنے ہم وطنوں کے دل کو موہنا تھا، مجھے یقین تھا کہ ایسے اقدام سے وہ سیدھی راہ پر آ جائے گا۔ اس طرح اس کے ایک اور ساتھی کو بھی رہا کر دیا۔ یہ دونوں لڑکے وہی مکتی باہنی تھے۔ میں تو ان کو نہ پہچان سکا مگر وہ اپنی جانیں بچائے جانے پر میرا شکریہ ادا کر رہے تھے، انہوں نے مجھے بتایا کہ اس دن کے بعد انہوں نے حکومت کے خلاف کسی کام میں حصہ نہیں لیا، اور وہ اپنے

وعدے پر قائم رہے۔ اور ۱۷ دسمبر کے بعد سے انھوں نے راج باڑی میں کئی غیر بنگالیوں کی جانیں بچائیں۔ وہ میری خاطر کرنے پر تلے ہوتے تھے۔ بار بار مجھ سے پوچھیں کہ وہ میرے لئے کیا کریں ایک لڑکا میرے لئے ٹرے میں چائے اور کیک لے کر آ گیا۔ بعد میں دیال سنگھ نے اُن کی اس پُر خلوص خاطر و مدارات پر میرے ساتھ اظہار تعجب کیا۔

دوسرے روز مجھے جنیدا لایا گیا۔ فرید پور سے جنیدا کے سفر کے دوران میرے دماغ میں دو متضاد نقشوں کی تصویر آتی انہی راہوں پہ، ہم ملک کے محافظوں کی طرح آتے جاتے تھے۔ اور اب آنکھیں ایک بھارتی جیپ میں زیر حراست سفر کر رہا تھا۔ سب کچھ وہی تھا، وہی ہماری موٹی وہی پل، وہی عمارت وہی درخت، وہی دکانیں وہی لوگ۔ مگر فضا مختلف تھی، انتہائی دکھ اور کرب کے ساتھ میں ان چیزوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ پاس سے گزرتے ہوئے لوگوں کی شکلیں مانوس ہونے کے باوجود غیر دکھائی دیتی تھیں۔ مگورا کے قصبہ سے ہم گزرے جہاں چند روز پہلے ہمارا ہیڈکوارٹر تھا۔ عمارت اور بنکر وہی تھے۔ مگر اُن کے مکین اب دشمن کی فوج کے سپاہی تھے۔ برآمدے میں سبز وردی پہنے سکھ اور گورکھے دکھائی دیئے جہاں چند روز پہلے ہمارے سپاہی کھڑے دکھائی دیا کرتے تھے۔ ان ہی خیالات میں جنیدا کیڈٹ کالج میں آ پہنچا۔

اس کالج کی ایک عمارت میں ہمارا نمبر ۵۷ بریگیڈ ہیڈکوارٹر ہوا کرتا تھا۔ اب وہاں ہندوستانی فوج کی ایک بٹالین کا ہیڈکوارٹر تھا، پچھلے آٹھ دس روز سے میں اپنے گھرے ہوئے سپاہیوں کے تحفظ کی خاطر سرگرداں پھرنے کی وجہ سے قیدی بن جانے کے احساس کا اثر مجھ پر زیادہ نہ ہو پایا تھا۔ مگر اب اس ذمہ داری سے فارغ ہونے کے بعد آزادی کے سلب ہو جانے کی تکلیف زور پکڑ رہی تھی۔ دفتر میں مجھے ایک ہندوستانی افسر نے بتایا کہ کرنل برندر سنگھ بینٹل میرے ساتھ ملاقات کرنے کی غرض سے کافی دیر تک میرے انتظار کرنے کے بعد واپس کرشن نگر چلا گیا ہے۔ اس بھارتی افسر نے امریکہ میں میرے ساتھ تیرہ برس پیشتر ایک کورس

کیا تھا، وہ ۱۹۴۷ء سے قبل ماڈل ٹاؤن لاہور کا رہنے والا تھا۔

## ۶

مجھے ایک کمرے میں رکھا گیا اور باہر چار سپاہی پہرہ پر مقرر کر دیئے گئے۔ کیا یہاں فرار کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟ یہ تھا سوال جو میرے دماغ میں بار بار ایک ٹیس پیدا کر رہا تھا۔ میرے پاس دو کمبل، ایک تکیہ، ایک سویلین پتلون قمیض، دو عدد وردیاں اور شیو کا سامان تھا۔ باقی تمام ذاتی سامان میں فرید پور چھوڑ آیا تھا۔ فرار کی کوشش ہر جنگی قیدی کا فرض ہے۔ جنیدا سے ہندوستانی سرحد اندازاً تیس میل دور تھی۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے اور اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں ان پہرہ داروں کو جھانسہ دے کر نکل سکتا ہوں۔ ایک سو گز کالج کی بیرونی دیوار تھی جس کے اوپر کانٹے دار تار لگی ہوئی تھی۔ کمرے سے نکلنے کے بعد دیوار کو پھاندنا مشکل نہ تھا۔ مگر مقامی لوگوں سے پوشیدہ رہ کر سرحد تک پہنچنے کے لئے دشمن بنگالیوں کے ہاتھ لگنے میں جان سے ہاتھ دھونے کا خطرہ تھا۔ سرحد تک پہنچنے کے لئے تین چار نالوں کو عبور کرنے کے لئے مقامی لوگوں کی ضرورت تھی۔ شام کو میں نے سنتریوں سے گپ شپ لگانا شروع کی، وہ نمبر ۱/۱ گورکھا بٹالین کے سپاہی اور نیپال کے باشندے تھے میں نے ان سے نیپال کے بارے میں سوالات کئے۔ وہ سب چینیوں کی دوستی سے کافی مرعوب نظر آتے تھے اور ہندوستانیوں کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے۔ رات کے وقت میں نے غسلخانے کی کھڑکی کا شیشہ نکال کر عارضی طور پر پھر اسی جگہ فٹ کر دیا۔ وہ رات میں نے اس کشمکش میں گزاری۔ میرے لئے فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ فرار جیسے کاموں کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اور ایک مل کر گیارہ بن جاتے ہیں۔ شاید یہ قدرتی امر ہے کہ انسان فیصلہ کرتے وقت آسان راہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ رات کو دیر تک میں اپنے بستر میں کروٹیں بدلتا رہا۔ مگر فیصلہ نہ کر پایا کہ آیا بھاگوں یا نہ بھاگوں۔ رات کو بار بار اٹھتا، باہر دیکھتا اور چارپائی پر آن کر

کریسٹ بابا، فیصلہ کرنے کی قوت اس رات میرا ساتھ نہ دے رہی تھی۔ اسی تذبذب میں میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں وہاں سے بھاگ رہا ہوں۔ مگر کچھ وحشی لوگوں نے مجھے سرحد کے قریب پکڑ لیا ہے اور مجھے بڑی بے رحمی سے قتل کر رہے ہیں۔ ساری رات اسی تذبذب اور اضطراب میں گزر گئی۔

دوسری صبح ایک بھارتی افسر نے میرے کمرے اور غسلخانے کا معائنہ کیا۔ غسلخانے میں اس نے شیشے کو ڈھیلا سا پایا۔ وہ کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد لانس نائیک تھاپا جو کہ گارڈ کمانڈر تھا میرے پاس آیا اور مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ مجھے ساتھ والی عمارت کی اوپر والی منزل کے کمرہ میں لے گیا۔ اس کے سنتری میرا سامان بھی وہاں لے کر پہنچ گئے۔ اس عمارت میں ہمارے سپاہیوں کے ذاتی صندوق رکھے تھے جو کہ اندازاً پانچ ہزار کے قریب ہوں گے بھارتی فوج کے بہت سے سپاہی اس سارے سامان کی تلاشی لے رہے تھے۔ اسی غرض سے انہوں نے صندوقوں کو باہر نکال کر خالی کر دیا تھا۔ سارے سامان کو اس بری طرح تہس نہس اور خلط ملط کیا کہ وہ سارا میدان لنڈا بازار نظر آنے لگا۔ اچھی اچھی چیزیں بھارتی سپاہی لوٹنے لگے۔ اچھی چیزوں پر ایک دوسرے کی لڑائی ہو رہی تھی۔ یہ چیزیں نکالتے اپنا سائز فٹ کرتے اور لے جاتے۔ لوٹ کا بازار گرم تھا۔ رنگ برنگی سویٹریں، پتلونیں، قمیضیں، جرابیں وغیرہ بکھری پڑی تھیں۔ میں اوپر کی منزل میں کھڑا یہ دلدوز منظر دیکھ رہا تھا۔ جہاں بھارتی فوجیوں کی مجرمانہ لوٹ حقارت آمیز تھی وہاں اپنے سپاہیوں کے سامان پر ڈاکہ زنی افسوس ناک بھی۔ سارا دن یہ منظر دیکھتا رہا۔ رات ہوئی تو پھر سے وہ کل والا مسئلہ دماغ میں چکر کاٹنے لگا۔ کیا میں اس لئے فیصلہ نہ کر پاتا تھا کہ مجھ میں جرأت اور حوصلے کی کمی تھی، انسان اپنی جرأت مندی میں فقدان کو تسلیم کرنے پر کبھی تیار نہ ہوتا، اپنے کمرے میں بالکل تنہا تھا، ضمیر کی آواز مجھے جرأت مندانہ قدم اٹھانے کی ترغیب دے رہی تھی۔

میں اپنے آپ میں شائد کسی اور کمزوری کو ماننے کے لئے تیار ہوں۔ مگر یہ تسلیم کرنے کے

لئے تیار نہ تھا کہ مجھ میں جرأت کا مادہ نہیں ہے۔ کیونکہ میرا یہ شروع سے عقیدہ رہا ہے کہ جرأت انسانی کردار کی بنیاد ہے، جرأت کے بغیر انسان نہ اچھے کردار کا، نہ مذہبی عقائد کا اور نہ ہی ایثار و محبت کے جذبہ کا حامل ہو سکتا ہے، سچائی کا حصول ادنیٰ کردار سے ممکن نہیں۔ وہاں مجھے ڈرپوک کہنے والا کوئی نہ تھا۔ میں اکیلا تھا۔ اگر میں فرار کی کوشش نہ بھی کرتا تو بھی کسی کو میری غیر جرأت مندی کی خبر نہ ہو سکتی تھی۔ ہم عام زندگی میں زیادہ تر باتیں دوسروں کی رائے سے ڈر کر کرتے ہیں لیکن جب کوئی ضمیر کی آواز کے خلاف عمل کرتا ہے تو وہ خود اپنی نظروں میں گر جاتا ہے۔ دوسروں کی نظر میں گرا ہوا شخص اُن سے دور رہ کر گزارہ کر سکتا ہے لیکن خود اپنی نظروں میں گرنے کے بعد اپنے آپ سے گریز ممکن نہیں۔ کیا ہمیشہ ہمارے اعمال اور ہمارا کردار دکھاوے کے لئے ہوتا ہے۔ اغلباً دکھاوے کا عنصر کچھ حد تک موجود ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اپنے ضمیر کی پیاس بجھانے کے لئے اور اپنے آپ کو اپنی نظروں میں باعزت رکھنے کے لئے میں نے فرار کی کوشش کا تہیہ کر لیا۔

اقبالؒ کے یہ شعر بار بار یاد آتے اور جرأت کی تلقین کرتے ؎

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمانِ خوش آہنگ، دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہیئے شاہین کا تجسس، جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ

اس فیصلے کے بعد ترکیب بنانا مشکل کام نہ تھا۔ فیصلہ کر لینے کے بعد میرے دل و دماغ سے ایک بھاری بوجھ اُتر گیا۔ مجھے ذہنی سکون حاصل ہوا۔ وہ دماغی کش مکش جس میں پچھلے 24 گھنٹے سے گرفتار تھا ختم ہوئی اور میں نے سکون کا سانس لیا۔ پوری رات اپنی تھی۔ رات کو دس گیارہ بجے کے بعد کسی وقت موقع ملنے پر میں نے اس کمرے سے کھسکنا تھا۔ غسلخانہ کمرے سے باہر برآمدے میں سے گزر کر آتا تھا۔ کمرے کے پچھواڑے کھڑکی سے پھاند کر بھی باہر نکلا جا سکتا تھا اور غسلخانے کے راستے بھی۔ شام کے کھانے کے بعد میں نے اپنی سویلین پتلون اور قمیض پہنی اور بستر میں گھس کر سو گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد جاگا۔ کیا وقت تھا میں نہیں جانتا۔ میری گھڑی تو مکتی باہنی نے چھین لی تھی۔ سنتری کمرے کے باہر کرسی پہ بیٹھا تھا۔ ایک کمبل کو لپیٹ کر میں نے

اس طرح رکھا کہ جب دوسرا کمبل اُوپر ڈالا تو وہ سوئے ہوئے آدمی کی طرح دکھائی دینے لگا تاکہ اگر سنتری میرے جانے کے بعد اندر دیکھے تو یہی سمجھے کہ میں سویا ہوا ہوں۔ کمرے میں تو اندھیرا تھا۔ مگر دُور برآمدے میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی دروازے سے اندر آرہی تھی۔ کھڑکی کو میں نے آہستہ سے کھولا، نیچے صرف ایک سنتری سارے گراؤنڈ کا آہستہ آہستہ چکر لگا رہا تھا۔ بوٹ کے تسموں کو باندھ کر گردن میں لٹکایا کھڑکی کے اُوپر چڑھ کر ٹانگیں باہر لٹکائیں۔ زمین وہاں سے کوئی بیس فٹ ہوگی ایک دم خیال آیا کہ دھڑام سے نیچے چھلانگ لگانے سے سنتری کو آواز آئے گی اور وہ چونک پڑے گا۔ میں نے ٹانگیں اُوپر کر لیں اور پھر کمرے میں واپس آرہا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا اتنی زور سے کہ دھک دھک کی آواز میرے کانوں میں آرہی تھی۔ میں کمرے کے دروازے کے پاس گیا۔ سنتری کی آنکھیں بند تھیں اور وہ سو رہا تھا۔ میں نے تکیے کے بیچ میں چھپایا ہوا اٹرانسمٹر سیٹ نکالا۔ دبے پاؤں باہر نکلا اور غسلخانے کی طرف مڑ کر پیچھے دیکھا تو سنتری نیند میں مدہوش تھا۔ غسلخانے کے باز و میں سیڑھیاں تھیں۔ اُن سے نیچے اُترا اور نیچے والے برآمدے میں آرہا۔ نیچے والا پہرہ دار میری طرف پیٹھ کیے پڑے جا رہا تھا۔ بڑی تسلی کے ساتھ دبے پاؤں چلتا ہوا میں احاطہ کی دیوار اور کانٹے دار تار کے درمیان سے کھسک کر میں کالج کے احاطہ کے باہر آگیا۔ چند لمحے دیوار کی اوٹ میں چپ بیٹھا رہا۔ دیوار پھاندتے وقت ہلکی سی خراشیں آئیں۔ چاندنی رات تھی، میں نے مکمل خود اعتمادی کے ساتھ سڑک کی طرف چلنا شروع کیا کشتیا کو جانے والی سڑک پر پہنچا۔

چاند کی پوزیشن سے میں نے اندازہ لگایا، وقت دو بجے کے لگ بھگ ہوگا۔ میرا منصوبہ تھا کہ سیدھا سڑک پر مہرپور کی طرف چلتا رہوں، راتوں رات جتنا بھی سفر ہو جائے بہتر ہے دن کو کسی کھیت میں چھپ کر گزاروں اور آئندہ رات کو باقی سفر طے کرنے کے بعد سرحد عبور کروں۔ سڑک کو چھوڑ کر کھیتوں کا راستہ اختیار کرنے میں دشواری تھی راستے میں آنے والے ندی نالوں کو پار کرنے کی اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ قسمت کو آزماؤں۔ اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ کہیں پلوں پر بھارتی فوج کا پہرہ نہ ہو۔

کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ خدا کے سپرد کر کے میں کشتیا جانے والی سڑک سے ہوتا ہوا مہر پور جانے والی لنک روڈ پر ہو لیا۔ پون گھنٹے میں جینیدا شہر سے مہر پور جانے والے چوک میں آ پہنچا۔ چوک میں بھارتی پولیس ہو سکتی تھی۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ ملٹری پولیس کا سپاہی کرسی پر بیٹھا شاید اونگھ رہا تھا۔ میں نے سڑک سے ہٹ کر چوک سے دو تین سو گز پہلے ہی اپنا رُخ دائیں طرف کھیتوں کی جانب کر لیا اور پہرہ دار کے عقب سے ہوتا ہوا مہر پور جانے والی سڑک پر آن پہنچا۔ وقت انتہائی قیمتی تھا اور اس رات سے میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، مگر اب مجھے اپنے پکڑے نہ جانے کا یقین تھا۔ خدا ہمت کرنے والوں کی کوشش کو رائیگاں نہیں جانے دیتا یہ میرا ایمان ہے میں نے اپنی تمام تر اہلیت فرار کی کوشش پر صرف کر دی تھی، اب بھی اگر اللہ تعالیٰ کو میری ناکامی منظور تھی تو پھر اس کی رضا ہی میری خوشی تھی، مجھے اگر ڈر تھا تو صرف یہ کہ کہیں مقامی لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں۔ لیکن یہ سوچ کر کہ جب اوکھلی میں سر دیا تو دھماکوں کا کیا ڈر، میں بغیر کسی خوف و ہراس کے سڑک کے کنارے کنارے تیزی سے مہر پور کی طرف بڑھتا گیا۔

پو پھٹنے کے قریب میں کشتیا سے درسنا جانے والی ریل پٹڑی پر پہنچا۔ میں نے اندازاً بارہ چودہ میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔ پٹڑی پر پہنچ کر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں درسنا کی طرف پٹڑی کے ساتھ ساتھ جاؤں۔ مہر پور جانے کی بہ نسبت یہ رستہ بہتر رہے گا۔ اس معاملے پر دوبارہ غور کیے بغیر میں پٹڑی کے ساتھ چل دیا۔ اندازاً ایک میل جانے کے بعد میں نے چھپنے کے لیے جگہ تلاش کرنی شروع کر دی کیونکہ صبح ہونے والی تھی۔ پٹڑی پر سے ذرا ہٹ کر گنوں کے کھیت تھے۔ ان سے بہتر چھپنے کے لیے جگہ کون سی ہو سکتی تھی، میں اس طرف ہو گیا۔ قریب تھا کہ میں اس میں گھس کر اس کے ایک کنارے سے دہقان شاید رفع حاجت سے فارغ ہو کر نمودار ہوا۔ اس نے مجھے دیکھا کچھ سوال کیا جو میں نہ سمجھ سکا میں بنگلہ نہ سمجھتا تھا اس لیے خاموش رہنے ہی میں بہتری سمجھی، جھٹ وہیں بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا۔ وہ شخص اپنے ہاتھ میں گڑوی سنبھالے ایک طرف کو چلا گیا۔ جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں اٹھ کر پھر پٹڑی پر آ گیا۔ دو چار سو گز درسنا کی طرف چلنے کے بعد پٹڑی کی دوسری سمت کماد کے ایک کھیت میں گھس کر درمیان

میں بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ کافی تھکا ہوا تھا۔ ایک گنا توڑا۔ اس کی کچھ پھانکیں چوسیں اور وہیں زمین پر لیٹ کر آرام کرنے لگا۔ یہ چھپنے کی جگہ بڑی محفوظ تھی۔ مجھے مکمل سکون حاصل تھا۔ دن گزارنے کے بعد رات کو باقی سفر طے کرنا آسان تھا۔ مشکل کام سے تو میں نپٹ چکا تھا۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ میں نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ فرار کی کوشش میرا فرض تھا۔ دل ہی دل میں مسکراتا۔ سرحد پار کرنے کے بعد مجھے کیا کرنا تھا۔ یہ میں خود نہ جانتا تھا۔ میرے پاس پانچسو پاکستانی روپے تھے اور ان کا تبادلہ کلکتہ پہنچنے سے پہلے نہ ہی ممکن تھا۔ اور نہ ہی خطرے سے خالی۔

دماغ ایک کامیاب منصوبے کا جال بُننے لگا۔ دریا کے پار سرحد کے ساتھ ہی ریلوے سٹیشن تھا اور وہاں سے گاڑیاں کلکتہ اور کرشن نگر کی طرف جاتی تھیں۔ دو تین سو روپے ٹرانسسٹر بیچ کر مل سکتے تھے اور پھر کلکتہ کے بڑے شہر میں ہر طرح کے مواقع موجود ہوں گے۔ مسجدوں میں پناہ لی جاسکتی ہے۔ کلکتہ میں تو افغانستان کے کافی تاجر ہوں گے۔ ان کے ذریعے کابل پہنچ سکوں گا، یا پھر غیر جانبدار ملک کے علاقے میں پہنچ سکتا ہوں کیونکہ جنیوا کنونشن کے مطابق اگر کوئی جنگی قیدی کسی غیر جانبدار ملک کے سمندری جہاز میں پہنچ جائے تو اس کا فرار مکمل سمجھا جاتا ہے ... یا شاید بمبئی جانا پڑے اور وہاں سے سمندری جہاز میں کویت یا جدہ وغیرہ یا ڈیرہ بابا نانک پہنچ کر راوی پار کرکے جسڑ کے علاقے میں پہنچا جاسکتا ہے۔ غرض تخیل کی پرواز بڑی بلند تھی۔ اس تخیل میں خوشی اور بے چینی کے ملے جذبات تھے۔ ٹی وی میں دیکھی ہوئی کہانی FUGITIVE کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ تخیلات کی دنیا بڑی سہانی ہوا کرتی ہے FUGITIVE کے ہیرو کی طرح میں کئی مشکلات میں گھرا ہوا اپنے خیالوں کی دنیا میں ہر ایک مشکل میں کامیابی کے ساتھ بچ نکلا۔ شہر شہر کی سیر کی، آخر لاہور آن پہنچا۔ اپنی ہمشیرہ، والدہ اور دوسرے عزیز و اقارب سے ملا۔ بنگلا پہنچا، میرے بیوی بچے مجھے دیکھ کر دنگ رہ گئے، خوش ہوئے، یہ سب بے حد خوش کن خیالات تھے۔ میرا دل جو ایک روز پہلے فرار کی کوشش کے خلاف تھا۔ اب میرے ضمیر کی آواز کو سراہ رہا تھا۔ اپنے خیالات میں محو میں نیلے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ گاہے گاہے کوئی کوا آیا چڑیا

اُوپر سے گزرتی، سورج کی کرنیں گنّے کے اُوپر والے حصہ پر پڑ رہی تھی۔

پچھلے چند روز سے جنگ میں ہزیمت اور دوسرے واقعات کی پریشانی کا بوجھ جو میرے دماغ پر تھا وہ بالکل ختم ہو گیا تھا بس ایک بات کی کمی تھی۔ کوئی دوست ساتھ ہوتا تو اس سے اس کی کامیابی کی خوشی بانٹ لیتا۔ شاید یہ قدرتی بات ہے کہ انسان اپنی کامیابی پر اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا کہ کامیابی سے حاصل کی گئی خوشی کو دوسروں سے بانٹ کر خوش ہوتا ہے، لیکن اب تو ایسے رفیق پاکستان پہنچنے پر ہی مل سکیں گے۔ اس وقت تک یہ خوشیاں دل پر بوجھ بنا رہیں گی۔ یہ سب کچھ بہت سہانا تھا، موسم میں ہلکی سی خنکی تھی۔ سب کچھ ایک خواب معلوم ہوتا تھا۔ ہزیمت، رُسوائی، شرمندگی اور ملال کے بھیانک خوابوں کے بعد ایک پیارا خواب تھا۔ پچھلے اپریل سے جب سے میں مشرقی پاکستان آیا تھا، مجھے ایسا سکون اور ایسا اطمینان کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔ کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ ایک مختصر اور صاف مقصد کا حصول میرے نزدیک آسان بات تھی، مقصد اور منزل کا تعیّن مشکل ہوا کرتا ہے۔ مگر اس کے تعیّن کے بعد اس کے حصول کے لیے سُوجھ بُوجھ کے ساتھ منصوبہ بندی کی تیاری آسان، ان خوابوں کی دُنیا میں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کھویا رہا اور کوئی کام بھی تو نہ تھا، وقت گزارنے کے لیے تخیلات کی پرواز سے بہتر کیا چیز ہو سکتی ہے۔ سورج اوپر چڑھ آیا تو اس نے سرد جسم کو حرارت پہنچائی، جس کی مجھے ضرورت تھی، بدن گرم ہوا تو مجھے کچھ نیند سی آنے لگی۔

دُور پٹڑی پر کچھ لوگوں کی باتوں کی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں، دن چڑھ چکا تھا اس لیے پٹڑی پر سے گزرنے والے لوگوں کی آوازیں آنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اس لیے میں بے فکر ہو رہا باتوں کی آوازیں آہستہ آہستہ بند ہوتی گئیں۔ کیونکہ وہ لوگ پٹڑی کے ساتھ ساتھ آگے آ رہے تھے ضرور دریا کی طرف جا رہے ہوں گے۔ اور پھر وہ آوازیں بالکل بند ہو گئیں۔ دس پندرہ منٹ خاموشی رہی ضرور وہ لوگ دوسری سمت مڑ گئے ہوں گے۔ پھر یکایک میرا سارا سہانا خواب ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا، جیسے شیشے کا گلاس ہاتھ سے گر کر فرش پر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ جس کھیت میں میں چھپا تھا، اس کے اردگرد سے اُونچے اُونچے شور کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سب چلّا چلّا کر کہہ رہے تھے،

جو میری سمجھ سے بالا تھا۔ ایسے وقت میں اگر کوئی اُردو میں بھی کچھ کہہ رہا ہوتا تو میں ایک لفظ نہ سمجھ پاتا۔ میرا دل دھک سے بیٹھ گیا۔ لاہور، کلکتہ اور بمبئی کے بازاروں سے میں پلیٹ کر ڈراونی الوہ اندھیری کوٹھڑی میں آن پہنچا۔

شاید اس آدمی نے جو مجھے رفع حاجت کے بعد ملا تھا، میرا پیچھا کیا ہو، مجھ پر نظر رکھی ہو، میرے اور میرے خدا کے علاوہ کسی کو میری یہاں موجودگی کا علم نہ تھا۔ اس کھیت میں گھبر جانے کے بعد میرے دماغ میں وہاں سے بھاگنے کی کوشش کا خیال بھی نہ آیا۔ ان سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہوں جن کا توں وہیں لیٹا رہا۔ شاید وہ کسی اور بات کے لیے چلا رہے ہوں صرف یہی امید تھی، جس کا مجھے ہلکا سا سہارا تھا، کئی گھناؤنے خیال دماغ میں آئے۔ پکڑنے کے بعد یہ لوگ کیا مجھے بے رحمی سے قتل کریں گے؟ برچھیوں اور بھالوں سے میرے جسم کو چھلنی کریں گے۔ میری موت کا وقت قریب آچکا ہے، اگر انہوں نے مجھے یہیں قتل کر دیا۔ تو کسی کو خبر تک نہ ہوگی کہ میں کہاں ہوں، زندہ ہوں یا مر چکا ہوں۔ میرے بیوی بچے، بہن بھائی، ماں اور دوسرے عزیز واقارب کتنے عرصے تک یہی اُمید دل میں لیے میرا انتظار کرتے رہیں گے کہ میں کسی نہ کسی دن واپس آؤں گا مجھے اپنے مرنے کا زیادہ افسوس نہ ہوگا، لیکن انتظار کرنے والوں کے حال پر بے حد رنجیدہ خاطر ہوا۔ کیا میں ایسے انجام کا حقدار ہوں؟ اپنی طرف سے تو میں نے نیک زندگی کے دن گزارے تھے۔ کسی سے زیادتی نہ کی تھی، پھر کیونکر میرا ایسا انجام ہو سکتا ہے؟ پھر مجھے اپنی والدہ کی دعاؤں کا خیال آیا۔ ایسی نیک سیرت ماں کی تمام عمر کی نمازیں اور عبادت کیسے رائیگاں جا سکتی ہیں؟ ان کی دعائیں اگر میرے شامل حال ہوں تو یہ مصیبت بھی ٹل جائے گی۔ اس خیال کے آنے سے مجھے بڑا حوصلہ ہوا، پریشان کن خیالات کم ہو گئے۔

کئی منٹ وہ لوگ یونہی شور مچاتے رہے۔ کیا وہ مجھے باہر نکلنے کے لیے کہہ رہے تھے؟ میں اسی طرح چپ چاپ لیٹا رہا۔ پھر باہر ایک فائر ہوا۔ پھر دھڑا دھڑ فائر۔ کچھ آدمی کھیت میں گھس کر مجھ تک پہنچے۔ مجھے دیکھ کر ایک نے شور مچایا۔ جیسے کہہ رہا ہو یہاں ہے ——— یہاں ہے

اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ اشارے سے اس نے مجھے اُٹھنے کے لئے کہا۔ اتنی دیر میں تین اور پھر شاید آٹھ دس آدمی وہاں آن پہنچے۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے قریب نہ آئے بلکہ کچھ فاصلے سے ہی جنگالی میں مجھے باہر نکلنے کے لئے شور مچاتے رہے۔ میں نے پوچھا کہ تم میں سے کوئی اُردو جانتا ہے۔ انہوں نے کسی کو بلایا۔ اس نے آتے ہی مجھے اُردو میں باہر نکلنے کے لئے کہا۔ میں نے اس سے کہا دیکھو میں ایک مسلمان ہوں، تم سب مسلمان ہو، مجھے کافروں کے حوالے مت کرو۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کی مدد کرے۔" لیکن وہ میری بات یا تو نہ سمجھ سکا یا سمجھنا نہ چاہتا تھا۔ میں نے اپنا ٹرانسمٹر دلدل میں مارا اور اللہ اکبر کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا کماد کے کھیت سے باہر آیا۔ ان سب نے مجھے گھیر لیا۔ اُس اُردو جاننے والے سے میں نے مخاطب ہو کر پھر کہا، مجھے بھارتی فوج کے حوالے مت کرو۔ میں کافروں کی قید سے موت کو ترجیح دیتا ہوں۔ میرا ٹرانسمٹر لے لو اور مجھے جانے دو۔ ان میں شاید چند ہندو بھی تھے سب نے مل کر میرے ہاتھ میری پُشت پر رسی سے باندھ دیئے اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ناچار میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے جوہاڑنگا لے آئے جہاں مکتی باہنی کے کچھ اور مسلح آدمی موجود تھے۔ ہم سڑک کے کنارے کھڑے تھے کہ مہر پور کی طرف سے ایک جیپ آئی۔ اس میں سے ایک بھارتی افسر نے اُترتے ہی میرے ساتھ تلخ کلامی بھی کی اور کچھ بد تہذیبی کا ثبوت بھی دیا۔ میری آنکھوں پر اس نے پٹی باندھی اور مجھے جیپ میں بٹھایا اور جیپ چل دی کچھ دیر کے بعد جیپ رُکی۔ مجھے ایک خیمہ کے اندر لے جایا گیا۔ اور میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ دو اور افسر آئے، جنہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ میں کیوں بھاگا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرا یہ فرض تھا۔ اور یہ جنیوا کنونشن کے تحت اس کی اجازت تھی اور یہ کہ میرے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی ہے۔ اس پر ایک افسر آگے بڑھا۔ گالی گلوچ کے بعد درخت کی ٹہنی سے جو اس کے ہاتھ میں تھی ایک دو سانٹے بھی رسید کئے۔ مجھے اپنی بے بسی پر بڑا ترس آیا۔ اس لمحہ مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ہتھیار ڈالنے سے موت ہر سپاہی کے لئے مقدم ہونی کتنی ضروری ہے۔ ایک اور رسی سے انہوں نے میرے پاؤں بھی اکٹھے باندھے اور زمین پر بٹھا دیا۔ میں

نے پھر احتجاج کیا کہ یہ سلوک جنیوا کنونشن کی سراسر خلاف ورزی ہے جس کا جواب مجھے چابک کے ایک وار اور شٹ اپ، کی چیخ سے ملا۔ وہ بھارتی افسر بولا "کنونشن بھول جاؤ۔ ہم ابھی تمہاری موت کا بندوبست کرتے ہیں۔" میں یہ جانتا تھا کہ یہ محض کھوکھلی دھمکی ہے، مجھے وہیں زمین پر پڑا چھوڑ کر سب چلے گئے۔

خیمہ چاروں طرف سے بند تھا۔ میں زمین پر رسیوں میں جکڑا ہوا آدھا بیٹھا اور آدھا لیٹا ہوا تھا اور اپنی بدقسمتی پر آنسو بہا رہا تھا۔ اپنے اس عقیدے سے کہ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت کارفرما ہوتی ہے اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا، کماد کے کھیت میں خوابوں کی دنیا میں کھو کر میں کسی لحاظ سے بھی شیخ چلی سے کم نہ نکلا۔ آخر انڈوں کی ٹوکری کو ٹھوکر مار کر میں اب حقیقت کی دنیا میں واپس آ چکا تھا۔ اس سے مجھے خود پر ہنسی آ رہی تھی۔ مشکل میں گھرنے کے ڈر سے انسان زیادہ ڈرتا ہے۔ لیکن جب مشکل سر پر آن پڑے تو ڈر جاتا رہتا ہے اور مشکل سے پیدا شدہ تکلیف کو برداشت کرنے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حالت میری تھی۔ سوائے اس کے کہ میں ایک تکلیف دہ حالت میں تھا، مجھے اور کسی بات کی فکر نہ تھی۔ ڈرامے کا تمام تذبذب ختم ہو چکا تھا۔ اندازاً گھنٹہ یا اس سے زائد وقت تو یہ حالت قدرے پرسکون رہی۔ مگر اس کے بعد میری بے چینی بڑھنے لگی۔ میں کس جگہ لایا گیا ہوں۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید جنیدا کا گرد و نواح ہو۔ جکڑی ہوئی حالت میں میری بے چینی جان لیوا بننے لگی تو میں نے اونچی آواز میں "کوئی ہے" کی صدا لگائی۔ وقتاً فوقتاً میں ایک ایسا آوازہ کس دیتا، جس کا جواب خاموشی کے سوا اور کچھ نہ ملتا۔ خیمہ کے باہر ایک دو سنتریوں کے چلنے کی آواز آتی رہتی۔ تین چار گھنٹے تک تو اضطراب کی حالت رہی۔ لیکن اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنی حالت سے مانوس ہونے لگا۔ تین چار گھنٹے مزید یونہی گذر گئے۔ سورج ڈھلنے کے ساتھ خیمہ کے اندر جو ہلکی سی روشنی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ مجھے سردی محسوس ہونے لگی۔ ایسی حالت کا کبھی زندگی میں گمان بھی نہ ہوا تھا۔ بھوک بھی سخت لگ رہی تھی۔ بھارتی فوج کے اس کے ظالمانہ

اور خلافِ انسانیت رویتے پر میں دل ہی دل میں تف کہہ رہا تھا۔ کس ذلیل اور درندہ صفت فوج سے پالا پڑ گیا تھا۔ کرنل لوربی اور اس کے حسنِ سلوک میں سراہ رہا تھا۔ مگر اب جس حال میں مجھے ہندوستانی فوج نے رکھا تھا وہ سپہ گری کی ذلیل ترین مثال تھی۔ میں نے کوئی ڈاکہ نہ مارا تھا کوئی چوری نہیں کی تھی۔ یہ گھٹیا اور ناجائز سلوک ان کی بُری ذہنیت کا ثبوت کامل تھا۔ ساری رات کا ہر لمحہ میں نے ننگی زمین پر ٹھٹھرتے اور شکنجے میں جکڑے ہوئے کاٹا۔ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ چند لمحوں کے لیئے آنکھ لگی مگر اس انداز میں سونا بھی محال تھا۔ پوری رات میرے لیئے قیامت بن چکی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ یہ کبھی بھی نہ کٹنے پائے گی مگر وقت کی رفتار مشکلات اور آسانیوں میں برابر برقرار رہتی ہے۔

خدا خدا کر کے دن چڑھا۔ باہر جیپ کے ٹھہرنے کی آواز آئی تو میری جان میں کچھ جان آئی کہ اب کوئی تو آئے گا۔ وہ کیا سلوک کرے گا۔ اس سے تو میں ناواقف تھا۔ بہر صورت موجودہ حالت سے ہر طرح کا تغیر مجھے منظور تھا۔ ایک لیفٹننٹ کرنل اندر آیا۔ اس نے میرے ہاتھ پاؤں کھولے اور مجھ سے یوں گویا ہوا "دیل کرنل جو کچھ تم سے سلوک ہوا۔ میں اس پر نادم ہوں اور افسوس کرتا ہوں، زمین پر گرے ہوئے دودھ پر رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جس افسر نے تمہارے ساتھ اس قدر زیادتی کی ہے وہ نااہل بے وقوف اور ناتجربہ کار ہے۔ اُسے جینیوا کنونشن کی دفعات کا علم نہیں۔ میں خود تمہارے فرار کے بعد جہلور گیا ہوا تھا، جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا وہ میری غیر موجودگی میں ہوا ہے لیکن تم جانتے ہو کہ اگر تم فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے تو میرے خلاف انکوائری ہوتی۔ میں نے ابھی تک تمہارے فرار کی رپورٹ اپنے بالا ہیڈ کوارٹر کو نہیں کی خدا کا شکر ہے کہ تم پکڑے گئے ورنہ اپنی خیریت نہ تھی۔ بہر حال جو ہو چکا سو ہو چکا، تم نے اپنا فرض ادا کیا جو سلوک تمہارے ساتھ کیا گیا ہے وہ بالکل ناجائز تھا۔ اس کا مجھے افسوس ہے میں تمہارے ساتھ ایک سپاہی کی حیثیت میں بات کر رہا ہوں۔ آج صبح جب میں لوٹا تو مجھے تمہاری گرفتاری کی اطلاع ملی تو میں سیدھا یہاں چلا آیا۔ امید ہے تم میری اس معافی کو قبول کرو گے اور

میرے ساتھ وعدہ کرو گے کہ جب تک تم بھارت میں ہو اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہ کرو گے۔ نہ ہی کسی کو اپنے بھاگنے، گرفتاری اور پھر اس برے سلوک کی رپورٹ کرو گے۔ جب اپنے ملک میں چلے جاؤ تو جو مرضی ہے کرنا۔ دیکھو! میں ایک صاف گو آدمی ہوں۔ امید ہے تم بھی میرے ساتھ صاف گوئی سے کام لو گے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک اچھے افسر اور سپاہی ہو، مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کرو گے ورنہ میں تمہیں متنبہ کروں گا کہ اگر تم یہ وعدہ کرنے کے لئے تیار نہیں تو میرے لئے یہ مشکل نہ ہو گا کہ میں تمہیں گولی مارنے کے بعد رپورٹ کر دوں کہ تم فرار کی کوشش کرتے وقت گولی کا نشانہ بنا دیئے گئے ہو، میں جھوٹی دھمکی نہیں دے رہا۔ وہ دونوں میں سے جو بات قبول ہے وہ مجھے بتا دو"۔

پچھلے چوبیس گھنٹوں کی تکلیف دہ حالت کے بعد میری جسمانی اور دماغی حالت کافی خراب تھی۔ نقاہت کی وجہ سے میں کھڑا ہونے میں بھی دقت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اس معاملہ پر غور کرنے کی بھی کوشش نہ کی۔ آخری میری اٹھائی ہوئی تکلیف کا رپورٹ کرنے سے مجھے معاوضہ تو نہ مل سکتا تھا۔ میں نے اسے کہا "میں ایسے رویہ کی کبھی امید نہ کر سکتا تھا۔ میرے ساتھ بہت زیادتی کی گئی ہے۔ یہ نہ صرف جنیوا کنونشن بلکہ انسانی قدروں کی سراسر خلاف ورزی تھی۔ میں ان تکلیف دہ واقعات کو زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔ لیکن ان حالات میں میرے پاس تمہارے ساتھ وعدہ کرنے کے اور کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ میں ایک پاکستانی سپاہی ہوں، مجھے وعدے کا پاس رہے گا"۔ اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور مجھے جیپ میں بٹھا کر ساتھ لے آیا۔ جیپ گھنٹہ بھر چلتی رہی۔ میں نے اسے سوال کیا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "تم بالکل محفوظ ہو۔ اس بات کا بالکل غم نہ کرو"۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ مجھے ہندوستانی سرحد کے پار لے جا رہا ہے۔

جیپ ایک جگہ پر رکی۔ مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ وہاں دو کرسیاں پڑی تھیں۔ ہم ان پر بیٹھ گئے۔ گھنٹہ بھر گزرا ہو گا کہ ایک فوجی سپاہی ایک ٹفن کیریر میں ناشتہ لے کر آ گیا۔ ہم دونوں نے ناشتہ کیا۔ وہ میرے ساتھ بڑے دوستانہ انداز میں باتیں کرتا رہا۔ میرے لئے یہ معلوم کرنا مشکل تھا

کہ یہ سب بدسلوکی اس کے حکم سے ہوئی تھی یا واقعی اس کے علم کے بغیر ہوئی تھی۔ باتوں کے انداز سے وہ ایک شریف، مخلص اور ایک اچھا افسر معلوم ہوتا تھا۔ ایک چارپائی لائی گئی اور اس کے ساتھ ہی میرا مختصر بستر اور وردی کا جوڑا بھی وہاں لایا گیا۔ میری فوجی ٹوپی نہیں تھی۔ میں نے کرنل کو بتایا کہ ایک تو میری ٹوپی نہیں ہے، دوسرے وہ افسر مجھے خیمہ میں باندھنے کے بعد میرا ٹرانسسٹر لے گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ٹرانسسٹر تو واپس مل جائے گا۔ ٹوپی اگر وہ نہ ملی تو دوسری مہیا کر دی جائے گی جانے سے پہلے اس نے مجھے کہا "یہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو گی۔ لیکن یاد رکھو کہ باہر بڑا کڑا پہرہ ہے اس لئے فرار کی کوشش نہ کرنا"۔ میرا بستر اور ناشتہ لانے والے فوجی گورکھے تھے۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے اغلباً جبنیدا واپس لایا گیا۔ اگلے روز سنتری سے بات چیت کے دوران میں نے محسوس کیا کہ میرا اندازہ درست تھا۔ اگرچہ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔

دوپہر کو میں نے کھانا کھایا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ مگر باوجود اس تھکاوٹ کے میں نے وضو کر کے نماز پڑھی۔ پھر بستر میں گھس کر سو گیا۔ میرے جسم کا ہر حصہ درد کر رہا تھا۔ شام کو جب میں اٹھا تو میز پر میرا ٹرانسسٹر اور ایک عدد جنگلی کیمپ پڑی ہوئی تھی، ریڈیو لگا کر میں نے کچھ خبریں اور گانے سنے۔ جس سے تنہائی کا احساس کم ہوا۔ اس دن ۹ دسمبر تھا۔ میرا کمرہ بالکل بند تھا۔ ساتھ والے چھوٹے سے سٹور روم کو غسل خانہ بنایا گیا تھا۔ جس میں ایک ٹوٹا پھوٹا سا کموڈ بھی رکھا تھا کمرے میں ایک کھڑکی اور ایک روشن دان تھا۔ جن کو تختوں کے ساتھ پکی طرح بند کر دیا گیا تھا۔ دروازے اور کھڑکی پر باہر کی طرف کمبل لٹکائے ہوئے تھے۔ اس لئے باہر دیکھنا ممکن نہ تھا۔ کمرے میں باہر کی روشنی کی ایک کرن بھی نہ پڑتی تھی۔ کمرے کو بجلی کا ایک قمقمہ روشن کئے ہوئے تھا۔

تین دن میں نے اسی کمرے میں گزارے۔ اس دوران میں نے نہ آسمان دیکھا اور نہ باہر کی روشنی میرے پاس پڑھنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ زندگی میں انسان کئی چیزوں کو کتنا معمولی سمجھتا ہے۔ ان کی ضرورت کا احساس بھی نہیں ہو پاتا اور نہ ہی ان کی ذرہ بھر قدر ہوتی ہے۔ ان بظاہر غیر ضروری اور معمولی چیزوں کی اہمیت کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ دو ہی دنوں میں آسمان دیکھنے کی اتنی خواہش پیدا ہوئی کہ کافی

دیر کوٹھڑی کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے آسمان کی ایک جھلک دیکھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا، سنتری جب اندر آنے کے وقت دروازہ کھولتا تو میری آنکھیں دروازے پر جم جاتیں کہ شاید دن کی روشنی دیکھ پاؤں۔ کھانا مجھے باقاعدگی سے ملتا تھا اور مجھے کوئی جسمانی تکلیف نہ تھی۔ مگر ذہنی کوفت ضرور تھی، شاید یہ تنہائی کا اثر تھا، اس کے علاوہ بے چینی کی ایک اور وجہ بھی تھی، مجھے معلوم نہ تھا، کہ میں کہاں ہوں؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے دل و دماغ میں مسلسل ایک اضطراب سا تھا۔ ۲۹ دسمبر کی شام کو جب میں اٹھا تو طبیعت بوجھل سی تھی، لیکن نیند کے خمار اور جسم کے درد کے باوجود میں تسکین محسوس کر رہا تھا۔ زیادہ مشکل حالات کے بعد کم مشکل والا ماحول تسلی بخش محسوس ہوتا تھا۔ اتنی مشکلیں پڑی تھیں کہ اب سب آسان معلوم ہوتی تھیں۔ وقت مصائب بھرے اوقات کو کس سرعت سے بھلانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ وقت کی رفتار رنج اور تکلیفوں کو بھلا کر راحت اور خوشیاں لے آتی ہے۔ ابھی صرف پندرہ بیس گھنٹے بیشتر میں کیسے شکنجے میں جکڑا پڑا تھا اور اب مجھے اس تکلیف کا احساس تک نہ تھا۔ کبھی کبھی دل ہی دل میں مسکراتا۔ زندگی کے بڑے حسین دن دیکھے تھے، ان کی حقیقی قدر صرف ایک بھیانک دن نے ایسے عیاں کی جو شاید کبھی کسی اور طریق سے نہ ہو پاتی۔ زندگی میں فراز کی قدر نشیبوں سے گزرنے کے بعد ہی آتی ہے۔ باہر کی ہر چیز کو میں ترس رہا تھا۔ مجھے یاد ہے باہر کوؤں کی کائیں کائیں اور کتوں کا بھونکنا یا کسی گاڑی کی آواز میرے لئے تسکین کا باعث ہوتے ان سے میرا باہر کا رشتہ وابستہ ہوتا۔ سنتری کو میں نے سگریٹ لانے کے لئے پیسے دیئے۔ وہ تین ڈبیاں لے آیا۔ میں سگریٹ پینے کا زیادہ شوقین نہیں۔ جو مزہ سگریٹ پینے کا مجھے تین دنوں میں آیا شاید ساری عمر کبھی نہ آئے۔ سگریٹ کے ہر کش میں ایک لطافت اور خمار سمٹ آیا تھا۔ تنہائی کو توڑنے کے لئے میں ریڈیو لگا لیتا۔ گانے سنتا، خبریں سنتا۔ بس یہی میری کائنات تھی۔ ایک تاریک کمرہ جس میں بجلی کا ایک بلب جل رہا تھا اور جس میں کبھی کبھی ریڈیو کی آواز نکلتی تھی۔ میرے لئے یہ ایک تجربہ تھا۔ ایک نئے ماحول سے واقفیت تھی جس میں بے چینی بھی تھی اور سکون بھی تھا۔ مجھے بار بار محسوس ہوتا کہ میں شاید ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔ جانتے ہوئے بھی میں دل کو یقین نہ دلا سکا

کہ یہ سب کچھ زندگی کی ایک زندہ حقیقت ہے۔ نہ ہی یہ خواب ہے اور نہ ہی سینما سکرین پر اترنے والی کسی فلم کی کوئی کہانی اور نہ ہی کوئی کتابی ڈرامہ۔ جب امیدوں کی دنیا پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو دماغ میں ماضی کے تاریک پہلو اُبھر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے میرے لئے تین دن کافی تکلیف دہ بنے رہے۔ تین دن تھے جو تین مہینوں کی رفتار سے گزرے۔ مشرقی پاکستان کے پچھلے چند ماہ کے واقعات دماغ میں چکر کاٹتے۔ تخریب کار کہیں یا مکتی باہنی یا مجاہدین آزادی، یہ سب بھارت کے ہاتھ میں آلۂ کار بن کر اپنے ہی ملک کی تباہی میں مصروف تھے۔ کتنے پُل انہوں نے تباہ کیے۔ کتنی ریل گاڑیاں اور ان کی پٹڑیوں کو نقصان پہنچایا۔ کتنے ہی سمندری جہاز اور سٹیمر ڈبو دیئے۔ خواہ مسلم بنگال پاکستان کا حصہ رہتا یا آزاد ہوتا۔ ہر صورت میں وہاں کے پُل، وہاں کی ریلوے، سٹیمر اور کارخانے یہ سب مسلم بنگال یا بنگلہ دیش ہی کی ملکیت رہنے تھے۔ یہ تو رفاہِ عامہ کی چیزیں تھیں۔ چونکہ مسلم بنگال کا ایک تباہ کن اور تباہ حال آزاد ریاست بن کر معرضِ وجود میں آنا بھارت کے مفاد میں تھا تاکہ وہ اس کی بدحالی سے اقتصادی اور سیاسی فائدے اٹھا سکے۔ اس لئے اس نے تباہی کے لئے ہر وہ حربہ استعمال کیا جو وہ کر سکتا تھا۔

---

# سنہ ۱۹۷۲ء

## (۷)

یکم جنوری ۱۹۷۲ء کا نیا سال چڑھا تو باہر نئے سال کا سورج طلوع ہوا۔ میرے کمرے کے اندر وہی بلب روشن تھا جو کمرے کو بلا امتیاز دن اور رات ایک ہی انداز میں روشن کیے ہوئے تھا۔ میں جانتا تھا کہ آج یکم جنوری ہے لیکن اس بند کمرے کے اندر نہ دن بدلا او نہ سال بدلا۔ دن اور رات کا فرق صرف ناشتے اور کھانے کے ملنے سے معلوم ہوتا تھا۔ صبح میں نے ناشتہ ختم ہی کیا تھا کہ وہ لیفٹیننٹ کرنل اندر آیا اور اچھی طرح ملا۔ میرا حال پوچھا۔ اس سے ایک روز پہلے سنتری میری وردی دھلوا اور پریس کروا کر رکھ گیا تھا۔ کرنل نے مجھے تیار ہونے کے لئے کہا۔ میں نے شیو بنائی۔ نہایا اور نماز ادا کرنے کے بعد تیار ہوگیا۔ ایک اور کیپٹن اندر آیا۔ دونوں نے آپس میں بات کی، پھر کرنل نے مجھ سے کہا کہ تم دوسری جگہ منتقل کیے جا رہے ہو، جہاں سے تم ہندوستان بھجوا دیئے جاؤ گے۔ امید ہے تم اپنا وعدہ یاد رکھو گے۔ اپنے فرار ہونے کا ذکر جب تک ہندوستان میں رہو نہ کسی دوست سے کرنا اور نہ کسی اتھارٹی سے۔ تمہارے ساتھ کی گئی بدسلوکی کا مجھے سخت افسوس ہے۔ اللہ کرے تم جلد ہی واپس پاکستان بھجوا دیئے جاؤ۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میں کہاں لے جایا جا رہا ہوں۔ جس کے جواب میں اس نے کہا کہ تم کو وہاں پہنچنے پر معلوم ہو جائے گا۔ وہ کیپٹن میری آنکھوں پر پٹی باندھنے کے لیے آگے بڑھا، تو میں نے اس سے کہا، دیکھو! میں نے پچھلے تین روز سے دن کی روشنی نہیں دیکھی آج نیا سال ہے، یہ دروازہ کھولو تاکہ کچھ تازہ ہوا اور قدرتی روشنی سے فیض یاب ہو سکوں۔ کرنل نے کہا کہ مجھے افسوس ہے یہ ممکن نہیں کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد تمہاری آنکھوں کی پٹی کھول دی جائے گی۔ مجھے جیپ میں سوار کر دیا گیا اور جیپ چل دی گھنٹے بھر کی مسافت کے بعد ایک جگہ جیپ رکی تو کیپٹن نے کسی سے پوچھا کہ کھلنا کو کون سا راستہ جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ میری آنکھوں کی پٹی کھولو میں تمہیں بتاتا ہوں،

اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میرے ذہن میں اس جگہ کا نقشہ ابھر آیا۔ کھلنا کا نام سننے سے پیشتر میرا اندازہ تھا کہ شاید میں جنید امیں ہوں۔ جب جیپ چلتی رہی اور راستے میں تین جگہوں پر جیپ کو آہستہ اس طرح گزرنا پڑا جیسے کہ وہ کسی مرمت شدہ پل پر سے گزر رہی ہو تو اس سے مجھے یوں گمان ہوا کہ جیپ جیسور کی طرف جا رہی ہے، اور جبکہ وہ کیپٹن کھلنا کا راستہ پوچھ رہا تھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ میرا اندازہ ٹھیک تھا۔

کیپٹن نے میری آنکھوں سے پٹی کھولی تو جیپ جیسور چھاؤنی کے قریب کھڑی تھی جہاں ہماری ملٹری پولیس کا بانکا جوان کھڑا ہوا کرتا تھا وہاں بھارتی ملٹری پولیس کے سپاہی کھڑے تھے، اُف! کتنی بڑی تبدیلی تھی۔ جو راستہ ہمارے دفتروں کو جاتا تھا۔ اور اتنا مانوس لگا کرتا تھا اب بیگانہ بن چکا تھا، مجھے بے حد کوفت ہوئی۔ میں نے اُسے کھلنا کا راستہ بتایا اور جیپ چل دی۔ ساری راہ میں ایک طرح کی اذیت میں گرفتار ٹکٹکی باندھے راستے اور راستے کی عمارتوں کو دیکھتا رہا، اس راہ کا ہر قدم مجھے ماضی کی یاد دلاتا۔ میں ان خیالات میں گم تھا کہ جیپ کھلنا آکر رکی۔ یہ وہی شہر تھا جہاں کی ہزارہا خواتین نے ۲۹؍نومبر ۱۹۷۱ء کو بھارتی جارحیت کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا تھا۔ ان ہی سڑکوں سے وہ جلوس کی شکل میں بھارت مردہ باد کے نعرے لگاتی گزری تھیں ان میں سے بیشتر خواتین بنگالی تھیں، یہی سڑکیں اور دکانیں پاکستانی پرچموں سے آراستہ ہوا کرتی تھیں اور اب وہاں بنگلہ دیش کے جھنڈے تھے اور پاکستان کے نام لیواؤں کے منہ پر قفل لگا دیئے گئے تھے۔

مجھے ایک بریگیڈ ہیڈکوارٹرز میں لے جایا گیا۔ غالباً یہ بھارتی ۷ بریگیڈ کا ہیڈکوارٹرز تھا۔ اس کے بعد مجھے کھلنا جیٹی پر لایا گیا۔ جیٹی پر پاکستانی فوج کے سپاہی اور افسر موجود تھے جو اب جنگی قیدی تھے۔ اُن کو دیکھ کر اور اُن کے ساتھ مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ تنہائی اور اپنوں سے علیحدگی کتنی ہی تکلیف دہ ہوا کرتی ہے اس کا اندازہ مجھے گزشتہ بارہ دنوں میں ہوا۔ وہاں لیفٹیننٹ کرنل سلطان احمد ۲۱ بلوچ اور بریگیڈیر اسلم نیازی جن سے میری پہلے کی واقفیت تھی اُن سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایئرفورس کے چند افسر بھی وہاں موجود تھے، ان میں سے چند بمعہ اہل و عیال تھے۔ اس خستہ حالت

میں اپنی برقعہ پوش عورتوں اور بچوں کو دیکھ کر دل کو بے حد دکھ ہوا۔ فوجی ہونے کی حیثیت سے ہم تو جنگی قیدی تھے مگر ان عورتوں اور بچوں کا کیا قصور تھا؟

رات وہیں شیڈ کے اندر زمین پر بستر لگا کر گزاری اور دوجنوری کا بیشتر حصہ بھی، جیٹی پر بھارتی فوج کا مسلح پہرہ تھا۔ وہاں کا غذات تیار کئے گئے اور دو جنوری کو بعد از دوپہر ہمیں پہرہ داروں کے نگرانی میں کھلنا ریلوے سٹیشن پر لایا گیا۔ کھلنا ریلوے پلیٹ فارم کے سامنے لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا جو "جے بنگلہ" کے نعرے بلند کر رہا تھا۔ ان نعروں میں ہر طرح کے نعرے تھے لیکن پاکستانی فوج یا پاکستان مردہ باد کے کسی نے نعرے نہ لگائے جس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے دلوں میں اگر پاکستان کے لیے پیار نہیں تو نفرت بھی نہیں تھی،

ایک گاڑی کلکتہ سے آکر پلیٹ فارم پر رکی۔ یہ بھارت سے پناہ گزین لے کر آئی تھی، گاڑی سے سینکڑوں عورتیں، مرد اور بچے اُترے وہ اپنا مختصر سامان سر پر اُٹھائے باہر کی طرف جانے لگے۔ یہ سب اپنے گھروں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ نو ماہ بعد وہ در در کی ٹھوکریں کھا کر واپس آرہے تھے، اُن کا ملک چھوڑ کر جانا بھی میرے لیے افسوس ناک تھا اور اس طرح واپس لوٹنا بھی وہ منظر جس میں ہماری بیچارگی تھی اندوہگیں تھا۔ حکومت نے تو ان کی واپسی کے لیے ہر طرح کی پیش کش کی تھی مگر بھارت نہ مانتا تھا، مانتا بھی کیسے؟ انہی کی موجودگی کا بہانہ کر کے وہ جارحیت کے منصوبے بنا رہا تھا۔ یہ تو سب سیاسی کشمکش تھی لیکن ان غریب عوام کا اس میں کیا قصور تھا۔ نو ماہ وہ بارشوں اور طوفانوں میں کیمپوں میں رہے۔ یہاں سے وہ دہشت زدہ ہو کر بھاگے تھے اور وہاں انہوں نے ان گنت تکلیفیں اٹھائی تھیں خستہ حالت عورتوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے والے بھارتی کیمپوں میں موجود تھے۔ کیا زندگی تھی ان لوگوں کی۔ ہماری شکست کیا انہی دکھی لوگوں کی بددعاؤں کا نتیجہ تھی؟ سپاہی کے لیے جنگ کرنا جہاں مقابلے میں مرنے مارنے کا دھندہ چلتا ہے سپہ گری ہے، لیکن آج کل کی جنگ میں بوڑھے بچے سبھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں وہ دن بھی تو تھے جب دونوں فوجیں کسی کھلے میدان میں اپنی طاقت کے جوہر دکھا کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کیا کرتی تھیں، اس قسم کی

خیالات میرے ذہن میں چکر کاٹ رہے تھے۔ گزرتے ہوئے پناہ گزینوں کی آنکھیں ہمیں گھور رہی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے گھروں کو چھوڑ کر جانے میں حکومت کی نااہلیت، سیاسی چکو اور ہم سب کا ہاتھ تھا، ان کو آخر کیوں اتنے بُرے دن دیکھنے پڑے۔ اس کا کون قصور وار تھا، کیا قصور واروں کو کبھی سزا مل سکے گی یا اس تمام المیہ کے حقیقی قصور واروں کا کبھی تعین نہ ہو سکے گا، ان کی جگہ دوسرے قصور وار ٹھہرائے جائیں گے۔ اور ان کو سزا ہو گی۔ لیکن میرا یقین اور ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بے جا سزا نہیں دیتا۔ جب کسی قوم کے خصائل اور اخلاق گر جائیں تو ان پر ویسے ہی حکمران مقرر فرما دیتا ہے۔ یہ ہمارے بُرے اعمال کا نتیجہ تھا کیونکہ خدا جہاں مہربان ہے وہاں بڑی جلد حساب لینے والا بھی ہے۔

اسٹیشن پر مجھے پولیس کا ایک ڈی ایس پی ملا جو کلکتہ سے انہی دنوں لوٹ کر واپس آیا تھا اور کھلنا میں متعین ہوا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ بولا کرنل صاحب یہ سب کچھ کیا ہو گیا، یہ ایسے کیوں ہوا؟ ہم تو کبھی علیحدگی کا خواب بھی نہ دیکھتے تھے۔ اگر عوامی لیگ کے کچھ لیڈر ایسا سوچ رہے تھے تو ان کو سزا دینی چاہیئے تھی۔ آپ کی فوج نے غیر ضروری سختی سے کام لے کر وحشت پھیلا دی۔ کلکتہ میں میں نے اذیت کے دن گزارے ہیں، آپ نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا ہمیں ہندو بھارت کا دست نگر اور مطیع بننا پڑا۔ میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے بتایا کہ عوامی لیگ کے لیڈروں نے آپ کے اور ہمارے درمیان اس قدر زہر پھیلایا کہ یہاں کے لوگ ہمیں دشمن سمجھنے لگے۔ بہاریوں اور غیر بنگالیوں کے ساتھ جو ظلم ہوئے ان سے آپ واقف ہیں۔ اس اندھیر نگری کو ختم کرنے کے لیے فوج نے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی۔ غلطیاں دونوں طرف سے سرزد ہوئیں۔ دعا کرو کہ ہم ماضی کو بھول کر پھر ایک دوسرے کے قریب آنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس ڈی ایس پی نے جواب دیا کہ اب ہندوستان ہمیں پھر کبھی ایک دوسرے کے قریب نہ آنے دے گا۔ بہر صورت اگر ہم پھر سے بھائیوں کی طرح رہنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ ہم سب کی خوش نصیبی ہو گی۔ یہ دشمنی کی لہر نہ تھی بلکہ دیوانگی کی لہر تھی، اسی اثناء میں ایک بھارتی فوجی افسر آیا اور اس نے بنگالی پولیس افسر کو ایک حقارت آمیز لہجے میں جانے کا حکم دیا

اس پر پولیس افسر غصے میں بولا ہم آپ کے غلام نہیں، یہ ہمارا ملک ہے اور یہ ہمارے بھائی ہیں۔ میں ان کو الوداع کہنے آیا ہوں۔ لیکن اُس افسر نے اس کو زیادہ سختی سے جانے کا حکم دیا۔ وہ بیچارہ ڈبڈبائی آنکھیں لئے میرے ساتھ بغلگیر ہوا اور وہاں سے چل دیا۔ کیا وہ حالات کے ہاتھوں اتنے مجبور ہوئے کہ وہ فائدہ سوچے سمجھے بغیر بھارت کے ہاتھوں میں کھیلنے لگے۔

ہماری گاڑی میں زیادہ حصہ ۳۱ بلوچ رجمنٹ کا تھا۔ ہم ستر افسر تھے اور تقریباً سات سو جوان اور جے سی او صاحبان، افسروں کو اور جے سی او صاحبان کو ایک بوگی میں بٹھا دیا گیا۔ یہ بوگی فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹس پر مشتمل تھی۔ ہر کمپارٹمنٹ میں برتھوں کی تعداد کے مطابق ہمیں تقسیم کر دیا گیا۔ کونے والا کمپارٹمنٹ فوجی گارڈ کے لئے تھا۔ گارڈ جو سنتریوں پر مشتمل تھی۔ ان تمام کمپارٹمنٹوں کے سامنے غلام گردش تھی جیسے کہ ہماری ائیر کنڈیشن کوچ میں ہوتی ہے۔ کوچ کے ایک سمت کے دونوں دروازے مکمل طور پر بند کر دیئے گئے تھے اور دوسری سمت سنتری ڈیوٹی پر تعینات کیا ہوا تھا۔ اس طرح فرار کے لئے یا تو پہلے سنتریوں کو قابو میں کرنا ضروری تھا یا کھڑکی کے راستے باہر چھلانگ لگائی جا سکتی تھی۔ لیکن ہر کھڑکی کے باہر تین موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں ماسوائے ایک کمپارٹمنٹ کی کھڑکی کے جس کی درمیان والی ایک سلاخ نہیں تھی اور اس میں سے باہر نکلنا ممکن تھا۔ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا تھا، یہ تو ہم جانتے تھے کہ ہم ہندوستان لے جائے جا رہے ہیں۔ لیکن کس مقام پر اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔ میں خود زیادہ تر افسروں سے ناواقف تھا صرف لیفٹیننٹ کرنل سلطان سے کچھ واقفیت رکھتا تھا۔ دبی زبان میں کچھ افسر فرار کی باتیں کر رہے تھے جو ۳۱ بلوچ بٹالین کے تھے باقی تمام اس موضوع پر خاموش تھے۔

گاڑی رات کے بارہ بجے کے قریب جیسور ریلوے سٹیشن پر پہنچی اور وہاں کافی دیر کھڑی رہی، باوجود سخت تھکاوٹ کے میں پیہم اپنے آپ کو بیدار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا، درمیان میں ذرا آنکھ بھی لگ جاتی جیسور سے گاڑی کالی گنج آئی، وہاں کچھ دیر رکی رہی، پھر ورسنا پہنچی۔ آخر رات کے تین بجکر پچیس منٹ پر گاڑی نے سرحد پار کی۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے اپنے ملک میں ایک حصے کو خدا حافظ کہا ایسے ہی جیسے کوئی اپنے لختِ جگر کو کسی لمبے سفر پر جاتے وقت کہتا ہے۔ گاڑی صبح سات بجے ڈم ڈم ریلوے سٹیشن پر آن پہنچی۔ ڈم ڈم

کلکتہ کے قریب بلکہ کلکتہ کا ہی ایک حصّہ ہے۔ وہاں بڑی بھیڑ تھی کلکتہ کی طرف چند منٹ کے وقفہ کے بعد گاڑیاں جا رہی تھیں، لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی گاڑی کے باہر آزادی تھی مگر اس کے اندر اسیری، کتنا فرق تھا دونوں میں، جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہو۔ اس میں شک نہیں کہ کامیابی کے ساتھ ایک دفعہ گاڑی سے باہر نکل جانے کے بعد کلکتہ جیسے بڑے شہر میں گم ہو جانا بڑا سہل کام تھا، اس کے بعد گرفتار ہونے کا بالکل امکان نہ تھا۔ آیئے اب دیکھیں کہ کوچ کے اندر فرار کے متعلق کس قسم کے خیالات تھے۔ ماحول کیسا تھا اور کیوں تھا؟ میں خود فرار کی کوشش کے حق میں تھا۔ کرنل سلطان اور اس کی ٹبالین کے چار پانچ افسر فرار کے منصوبے بنا رہے تھے، ان کے پاس بھارت کا پورا نقشہ تھا۔ کیپٹن ندیم احسن ۱۵ بلوچ فرار کے لئے سب سے زیادہ بے چین تھا۔ میرے پاس پاکستانی نوٹ تھے۔ باقی تقریباً سب افسروں کے پاس ہندوستانی کرنسی تھی۔ جو انہوں نے ڈھاکہ میں اپنی ذاتی چیزیں بیچ کر حاصل کی تھی۔ تمام مشرقی پاکستان میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارتی کرنسی لیگل ٹینڈر بن چکی تھی، سب کے پاس سویلین کپڑے موجود تھے لیکن زیادہ تر افسر جن میں دو لیفٹیننٹ کرنل بھی تھے، فرار کے حق میں نہ تھے، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ سب سے مشکل کام فیصلہ کرنا تھا کہ فرار کی کوشش کرنی ہے یا نہیں۔ باقی سب کام سہل ہو جاتا ہے جبکہ کام کرنے میں یقین محکم موجود ہو۔ فیصلے کے بغیر یونہی ہوائی باتیں کرنے سے کچھ بن نہیں پڑتا۔ بہر صورت قطعی فیصلے کی فضا غیر یقینی تھی جس کی خاطر خواہ وجوہات تھیں۔ ہر کوئی بڑا پر امید اور رجائیت پسند تھا۔ ان کے خیال میں اگر چند ہفتوں کے اندر نہیں تو دو تین ماہ کے اندر ہمیں واپس پاکستان بھیج دیا جائے گا۔ کچھ تو اتنے رجائیت پسند تھے جن کا خیال تھا کہ گاڑی شاید سیدھی واہگہ بارڈر پر جا کھڑی ہوگی اور ہمیں پاکستان جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔

میں اس خیال سے اغلباً زیادہ قنوطی تھا یا میری اپنی رائے کے مطابق حقیقت پسند تھا۔ میرا نقطہ نظر یہ تھا کہ بین الاقوامی تنازعات اتنی آسانی سے طے نہیں ہو پاتے۔ ہمارے سامنے اسرائیل اور عربوں کی لڑائی کا معاملہ اچھی مثال۔ اور ان تنازعات میں حریف اپنے قبضہ میں سودا بازی کے لئے جنگ میں حاصل کئے گئے علاقے اور قیدی استعمال کرتے ہیں۔ بھارت کا ماضی کا رویہ اگر ہمیں سبق سکھاتا ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ بنیا قوم جنگی قیدیوں کو سودا بازی کے لئے ضرور استعمال کرنے کی کوشش کرے گی۔ دوسروں کی دلیل تھی کہ جنیوا کنونشن

کے تحت بھارت ایسا نہیں کر سکے گا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ بین الاقوامی معاملات میں قوانین اور اصولوں کی طاقت ور ممالک کبھی پرواہ نہیں کرتے۔ تنازعوں میں وہ اپنے مفاد کا خیال رکھتے ہیں۔ نہ کوئی بین الاقوامی رائے عامہ کا اور نہ ہی انسانیت اور قانونی اصولوں کی کوئی پرواہ کرتا ہے۔ یہ تمام قانون کمزور قوتوں پر لاگو ہوتے ہیں طاقت ور کے لئے نہیں ہوتے۔ میں بار بار یہ کہتا کہ معاملہ طول پکڑے گا۔ ہمیں شاید پانچ سال تک کیمپوں میں زندگی گزارنی پڑے۔ بھارت ضرور شائی لاک یہودی کی طرح قیدیوں کے عوض ہمارے ملک سے گوشت کا پونڈ بھر ٹکڑا مانگے گا۔ اپنی مانگ پر دیر تک مصر رہے گا خواہ آخر میں شائی لاک کی طرح ذلیل ہی کیوں نہ ہو۔ جو افسر یہ سوچ رہے تھے کہ ہم مارچ سے پہلے واپس چلے جائیں گے وہ شاید احمقوں کی دنیا میں رہ رہے تھے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ہم فرار کی کوشش کریں یا نہ کریں، لیکن نہ کرنے کی صورت میں ہم بے حد پچھتائیں گے۔ کرنل سلطان، کیپٹن ندیم اور راجہ گستاسپ کے دل میں فرار کا کافی ارمان تھا اور صرف یہی نکلنے کی بات چیت کر رہے تھے، میں خود قطعی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے ٹھان رکھی تھی کہ اگر کوئی نادر موقع ملا تو اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ پھر جن کا بالکل بھاگنے کا خیال نہ تھا انہوں نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا کہ اگر چند فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو باقی ماندہ افسروں کے ساتھ برا سلوک کیا جائے گا۔ ان کو اس سے کافی گھبراہٹ تھی، لیکن سوائے ایسے خیال کے اظہار کرنے کے کسی کو روکنے یا منع کرنے کی کوشش نہ کی۔ اس لئے اس کا کسی کو ذمہ دار ٹھہرانا جائز نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر سب ہم خیال ہوتے تو شاید فرار کے حق میں فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا۔

باوجود اپنے خیالات کے میں دوسروں کے خیالات سے کافی حد تک متاثر ہوا۔ شاید یہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہوں۔ اگر چند ہفتوں ہی کی بات ہے تو پھر فرار کی کشمکش اور گاڑی سے کودنے کا خطرہ مول لینے کی جواز نہ تھا۔ چلتی گاڑی سے چھلانگ لگاتے وقت جان بھی جا سکتی تھی۔ کسی جرأت مندانہ قدم اٹھانے کے لئے گروپ کا ہر فرد ایک دوسرے کی ہمت بڑھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ہر کسی کے دل میں ڈر اور خوف ضرور ہوتا ہے۔ خوف کے اس عنصر کو گھٹانے کے لئے ساتھیوں کے چند ہم خیال الفاظ بڑی مدد دیتے ہیں اس کے برعکس جرأت مندانہ اقدام کے خلاف ڈھیلی ڈھیلی دلیل بے حد اثر رکھتی ہے۔ انسان قدرتی طور پر سہل راہ پر

گامزن ہونے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس لئے مشکل کام اور مشکل راہ پر گامزن ہونے کے لئے اسے اپنے ارادے کی تقویت کے لیے ہر ایک کی مدد کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ میں خود گزشتہ ناکامی کی وجہ سے زیادہ وثوقانہ رویّہ نہ رکھتا تھا۔ جب میں جنید آبیڈیٹ کالج میں اکیلا قید تھا تو میرے لئے فیصلہ کرنا آسان تھا، اگرچہ اس وقت میرے دل میں زبردست خواہش تھی کہ میرے ساتھی ساتھ ہوتے تو ان کے ساتھ مشورہ کرتا۔ لیکن اب ساتھیوں میں مختلف رائیں فیصلہ کرنے میں زیادہ حائل تھیں۔ اگر آپ اپنے گروہ کے تمام ممبروں سے ناواقف ہوں تو ہر ایک کی شخصیت اور ان کی مخلصی اور دانش کا اندازہ لگانے کے لئے کافی عرصہ درکار ہوتا ہے میں اس حالت میں موجود ساتھیوں میں سے بعض سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا۔ اور ان کی قدر و قیمت میرے دل میں پیدا ہوئی۔ لیکن شخصیتیں بڑا دھوکہ دیتی ہیں۔ مخلصی کا اندازہ لگانا اتنا آسان نہیں جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ بعد میں کافی مدت اکٹھا رہنے پر میری رائے ان کے متعلق مختلف تھی۔ خیر ایسا تجربہ حالات سے گزرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

لیفٹننٹ کرنل سلطان کو یہ رائے بھی دی گئی کہ بحیثیت کمانڈنگ افسر کے اس کی ڈیوٹی ہے کہ وہ اپنی بٹالین کے ساتھ رہے۔ اگرچہ یہ رائے مخلصی پر مبنی نہ تھی بلکہ نہ بھاگنے والوں نے ایک بہانہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ خود بھی کچھ ہچکچاہٹ کے عالم میں تھا، چنانچہ اس دلیل سے مان گیا اور اس کے ماننے کے بعد فرار کے منصوبے بھی ٹھنڈے پڑنے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم سب جو فرار پر بڑا زور دے رہے تھے بعد میں دوسروں کی ہنسی کا سبب بھی بنے کہ ہم سب گفتار کے غازی تھے کردار کے نہیں۔ شاید وہ حق بجانب تھے۔ کام کرنے والے کام کر ڈالا کرتے ہیں۔ کام کرنے کے عزم کا ڈھول نہیں پیٹا کرتے اور نہ ہی کئے جانے والے کام کے متعلق ہر کسی سے مشورہ کرتے ہیں۔ کسی نے فرار کی کوشش نہ کی۔ بعد میں جب واپسی کا سہانا خواب عذاب بننے لگا تو ہر ایک کو سخت افسوس تھا کہ واقعی ریل سے فرار سب سے آسان کام تھا اگرچہ اس وقت زیادہ تر افسر اسے بڑا مشکل بتا رہے تھے۔ ہم نے اس موقعہ سے فائدہ نہ اٹھایا۔ لیکن زمین پر گرے ہوئے دودھ پر رونا فضول ہوتا ہے۔

تین دن اور تین راتیں یونہی سفر جاری رہا۔ میں سارا دن کھڑکی کے پاس بیٹھ کر باہر دیکھنے میں گزارتا۔ سارا

راستہ یہی خیال آتا کہ دیکھو باہر آزادی ہے اور ہم اندر مقید جیل کی چار دیواری کے اندر جانے کے قریب جا رہے ہیں۔ اقبال کا طائر لاہوتی والا شعر اور اس طرح سبق آموز جذباتی شعر دماغ میں آتے اور دل کہتا کہ بھائی اس رزق سے جس سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو موت اچھی ہے کہنا آسان ہے اس پر عمل کرنا کتنا مشکل ہے جرأت مندی کی راہ میں کتنی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں اور اپنی کمزوری اور بزدلی کو چھپانے کے لئے انسان کتنے حیلے اور بہانے تراشتا ہے۔

راہ جاتے بھارت کے لوگوں، ان کی کٹیاؤں اور ان کے لباس سے غربت ٹپکتی دکھائی دیتی تھی ہمارے پاکستان میں بھی بڑی غربت ہے مگر انہیں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ ہمارے غریبوں کی حالت یہاں کے غریبوں سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

ہمیں اپنی منزل کا پتہ نہ تھا۔ کبھی سنتے کہ ہم ساگر جا رہے ہیں، پھر کسی کا خیال تھا کہ رانچی یا جبلپور لے جائے جا رہے ہیں مگر کسی کو صحیح معلوم نہ تھا، اور یہ بات آخری دم تک ہم سے خفیہ رہی۔ گاڑی الہ آباد سے ہوتی ہوئی ۱۴ جنوری کی شام کو کانپور کے سٹیشن پر کھڑی ہوئی۔ دوسرے پلیٹ فارم پر گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ جنگی قیدیوں کو دیکھنے کے لئے کافی لوگ پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو گئے۔ ہم نے اپنے کمپارٹمنٹ کے اندر کی بجلیاں گل کر دیں۔ ہماری یہ حالت ہمارے لئے باعث شرم تھی جس کا ان لوگوں کے جمگھٹے کی وجہ سے احساس اور شدید ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کے دلوں پر تو ہماری فوج کی دھاک بیٹھی ہوا کرتی تھی۔ اب شاید وہ خود شش و پنج میں تھے کہ ان کو فتح کیسے ہوئی۔ پولیس لوگوں کو ٹرین کے قریب آنے سے روک رہی تھی۔ لوگ ہنس رہے تھے ان کی ہنسی سے وہ سب کچھ عیاں ہوتا تھا جو ایک قوم کے لوگ ہاری ہوئی دشمن کی فوج کے لئے ہوتی ہے بعض لوگوں نے ناپسندیدہ آوازے بھی کسے تو ہمارے سپاہیوں میں سے کسی نے گالی کا جواب گالی سے دیا۔ اس پر ٹرین کمانڈر سے تکرار بھی ہوئی۔ اس ہجوم میں عورتیں بھی تھیں جو بڑھ بڑھ کر دیکھنے کی کوشش میں مصروف تھیں ہجوم سے ہٹ کر ایک طرف ایک سفید ریش سفید دستار پہنے بزرگ کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ایک برقع پوش عورت بھی کھڑی تھی۔ ان صاحب کو میں نے غور سے دیکھا تو ان کی آنکھیں پرنم پائیں۔ رنج و ملال ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ اور ان کا چہرہ ان کے ٹوٹے ہوئے دل کی ترجمانی کر رہا تھا۔ ہماری حالت پر یقیناً ان کو افسوس تھا،

شاید ہمیں خود بھی نہ تھا۔ ہماری کامیابی کے ساتھ بھارت کے تمام مسلمانوں کی امیدیں وابستہ تھیں انہوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بھارت کے باشندے ہی رہیں گے بڑھ چڑھ کر تحریک پاکستان میں حصّہ لیا۔ اور قربانی دی تھی، اس غرض سے کہ اگر پاکستان بنے گا تو مسلمان زندہ و پائندہ رہیں گے۔ ان کی سلامتی ایک مضبوط پاکستان ہی میں مضمر تھی۔ انہی کے رشتہ دار بہار سے مشرقی پاکستان ہجرت کر کے گئے تھے، لیکن پھر سے اُن کا وہاں بھی رہنا محال و ناممکن بنا دیا گیا۔ اس مردِ مومن کی آنکھوں میں ایک سوالیہ نشان تھا۔ یہ آخر کیوں؟ اور کیسے ہوا۔ پاکستانی فوج کو کیونکر شکست ہوئی لیکن یہ شکست ایک حقیقت بن چکی تھی ہماری کامیابی کا راز اسے تسلیم کر لینے میں ہے تاکہ ہم اس سے سبق حاصل کریں۔ اپنی کمزوریاں کا دور کر کے مستقبل قریب کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔

چند لوگ جو بار سوخ تھے ٹرین کمانڈر کی اجازت سے اندر آئے۔ وہ ۱۹۴۷ء سے پہلے لاہور اور سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ ایک ریٹائرڈ سکھ لیفٹننٹ کرنل جو چکوال کے رہنے والے تھے ہمارے ایک چکوال کے افسر سے مل کر اپنے گاؤں کا حال پوچھتے رہے جو پولیس کے سپاہی پلیٹ فارم پر ڈیوٹی دے رہے تھے اُن میں سے ایک مسلمان تھا جس کا نام عبدالحمید تھا وہ بڑا غمگین دکھائی دیتا تھا۔ اس کے تھانیدار نے اس کو طعنہ دے کر کہا "حمید دیکھ تیری قوم کے آدمی ہیں" اس کا لہجہ طنزیہ اور متعصبانہ تھا۔ یہ بات نشتر بن کر میرے دل میں چبھی اور دُعا نکلی کہ اللہ کرے گا ایک دن ہم بھارت کی فوج کو ایسی شکست دیں گے کہ عبدالحمید اور اس سفید ریش مولانا کی حسرتوں کے کیے گئے خون کی تلافی ہو سکے اور عبدالحمید سر اُٹھا کر کہہ سکے کہ تھانیدار صاحب یہ میری قوم کے جیالے جوان ہیں۔

جب لوگوں کا ہجوم ٹرین کے ذرا قریب ہونا شروع ہوا تو وہ مولانا اور برقع پوش عورت بھی ذرا آگے بڑھے۔ ایک پولیس کے سپاہی نے مولانا کو زور سے پیچھے دھکیلا اور دوسرے نے اس برقع پوش عورت کو اپنی لاٹھی سے اس انداز میں پرے دھکیلا کہ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بھارت میں مسلمانوں کی حالت اور بھارتی حکومت کے سیکولرازم کے ڈھول کا پول جیسے کھل گیا ہو۔ پاکستان کی مضبوطی خوشحالی ہی میں بھارت کے چھ کروڑ مسلمانوں کی عزت کا راز پنہاں ہے۔ کیا ہم ان خوابوں کو شرمندہ تعبیر ہونے دیں گے؟

ہماری گاڑی پلیٹ فارم پر کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے رُکی رہی۔ کچھ دیر کے بعد لوگوں کا گروہ ہمارے کمپارٹمنٹ کے بالکل قریب آگیا۔ اور ان کے عقب میں میں نے دیکھا کہ وہ سفید ریش مولانا کھڑے ہیں۔ ان میں سے بعض نے ہمارے چند ساتھیوں کے ساتھ ہاتھ ملانے کی خواہش ظاہر کی۔ ان کو دیکھ کر مولانا نے بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے اپنا بازو باہر نکال کر راہ کے دوسرے ہاتھوں کو پرے کرتا ہوا ان کے ہاتھ کو تھام لیا۔ انہوں نے السلام علیکم کہا اور کچھ دعائیں دیں۔ میں نے ان کے ہاتھ کو دبا کر یہ پیغام دینے کی کوشش کی کہ دعا کریں کہ مستقبل قریب میں ہم آپ کی تمناؤں کو پورا کر آئیں اور میدانِ کارزار میں سرخرو ہو کر آپ سب کو بھارت میں رہتے ہوئے بھی سربلند کر کے چلنے کے قابل بنائیں۔ بھارت کا سیکولرازم محض دکھاوا اور بناوٹی کہانی ہے۔ اس کا ثبوت بھارتی افواج میں مسلمانوں کی قریباً غیر موجودگی ہے۔ وہ بھارت کی کل آبادی کا دس فیصد حصہ ہیں اور فوج میں محض ½ فیصد بھی نہیں یہی حال باقی تمام سرکاری اور نجی شعبوں کا ہے۔

گاڑی رات کو آٹھ بجے کانپور سے روانہ ہوئی۔ وہ سفید ریش بزرگ دُور تک گاڑی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ حسرت و یاس سے گھرے چہرے سے مایوسی ٹپک رہی تھی مگر لبوں پر شاید دعائیں تھیں، ہماری فوج کی شکست پاکستان کے لوگوں کے لئے سانحہ تو تھی ہی اس سے بھارت کے مسلمانوں اور تمام عالمِ اسلام کے عوام کے دلوں کو ٹھیس پہنچی تھی۔ ہم کتنے ہی برائے نام مسلمان کیوں نہ ہوں، ہم سب مسلمانوں میں اور اُن کے ہاتھوں کسی مسلمان قوم کی شکست یا تکلیف کا سہنا آسان نہیں۔ یہی جذبات جو تمام اسلامی ممالک کے لوگوں کے دلوں میں پائے جاتے ہیں۔ اگر صحیح طریقوں سے ڈھال کر حکومتی اور سیاسی سطح پر پیدا کیے جائیں تو عالمِ اسلام کس قدر خوش قسمت، مستحکم اور خوشحال بن جائے۔ بنیادی اجزا موجود ہیں صرف تحریک اور منصوبے کی ضرورت ہے۔ کانپور سے آٹھ دس میل باہر تک ہماری گاڑی کوئی دس بارہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی رہی، یہ کود جانے کا نادر موقع تھا۔ لیکن موقع محض موقع ہی تھا ہم میں سے کسی نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ صبح چھ بجے گاڑی جھانسی کے سٹیشن پر کھڑی ہوئی۔ یہاں سے کہاں جائے گی ہمیں اس کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ گھنٹہ بھر ٹھہرنے کے بعد گاڑی چلی تو اس کا رخ شمال کی طرف تھا۔ زیادہ رجائیت پسند حضرات کا خیال تھا کہ اب یہ آگرہ دہلی سے ہوتی ہوئی واہگہ بارڈر کی طرف چل دے گی میں بار بار یقین دلانے کی کوشش

کر رہا تھا کہ بین الاقوامی معاملات اتنی آسانی سے طے نہیں ہو پاتے۔ ہر چیز کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ چار پانچ سال تک بھارت کی قید میں رہنے کے لئے دماغی طور پر تیار رہنا چاہئے۔ میں ساتھیوں کی ہمت نہیں گھٹا رہا تھا بلکہ میری کوشش تھی کہ وہ حقیقت شناسا بنیں۔ سیدھا واگہ پہنچنا تو درکنار آئندہ چند ماہ میں بھی واپس پاکستان پہنچنے کا خواب دیکھنا چھوڑ دیں تاکہ بعد میں ان کو زیادہ مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ بیشتر ساتھیوں نے میری رائے کو مضحکہ خیز تصور کیا۔ ناامیدی یقینی طور پر گناہ ہے، لیکن بے حقیقت پُر امیدی حماقت ہے۔ کیمپ میں ایک سال کا عرصہ گزرنے کے بعد زیادہ تر ساتھیوں پر حقیقت کا انکشاف ہوا۔ مگر پھر بھی بعض حضرات ہر چھوٹی سی خبر ملنے پر عنقریب واپسی کی امیدیں وابستہ کرنے کے عادی بنے رہے لیکن ہر دفعہ ان کو سراب کا سامنا کرنا پڑا۔

پانچ جنوری کو دوپہر کے وقت ہماری ٹرین گوالیار کے اسٹیشن سے گزری۔ سامنے گوالیار کا مشہور قلعہ نظروں سے گزرا، اور اس کے ساتھ تاریخ کے وہ حقائق بھی دماغ میں چکر کاٹنے لگے جو اس شہر اور قلعہ سے وابستہ ہیں۔ سلطان محمود غزنوی نے گوالیار کے راجہ کی فوجوں کو اس قلعہ کا محاصرہ کر کے اطاعت گزاری پر مجبور کیا تھا اور آج شاید ہمیں اس قلعے کے اندر نظر بند کیا جانا ہے۔

ٹرین برلانگر ریلوے سٹیشن پر جا کر رُکی۔ یہ گوالیار کا ایک چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ اور گوالیار سے چار کوس دُور تھا۔ باہر دیکھنے سے معلوم ہوا یہی ہماری منزل ہے، کیونکہ باہر بھارتی فوج کے افسر اور سپاہی کھڑے تھے۔ ریلوے سٹیشن کے اِردگرد فوجی گارڈ کھڑی تھی۔ کرنل ڈھلوان جو بیراسنٹر کمانڈر اور سکھ افسر تھا بمعہ لیفٹننٹ کرنل منصور یار خاں جوان کا سیکنڈ ان کمانڈر تھا۔ مجھے پلیٹ فارم پر ملا۔ ہمیں لبسوں میں بٹھا کر کیمپوں میں لایا گیا۔ افسروں کو علیحدہ جے سی او اور جوانوں کو علیحدہ علیحدہ کیمپوں میں پہنچا دیا گیا۔

چند بارکوں کے اِردگرد جہاں پہلے بھارتی غیر شادی شدہ افسر رہا کرتے تھے کانٹے دار تار لگا کر افسروں کا کیمپ بنایا گیا تھا۔ ان بارکوں کے درمیان میس تھا۔ کانٹے دار تاروں کی باڑیں دو تھیں اور اِردگرد سنتری تعینات تھے۔ کیمپ میں پہنچنے سے ذرا پہلے سڑک سے گزرتے

ہوئے بس میں بیٹھے میں نے چند پاکستانی افسر کیمپ کے اندر ایک بارک میں دیکھے۔ جب بس اندر آن کر رکی تو میں نے ایک بھارتی افسر سے پوچھا کہ وہاں کون کون پاکستانی افسر ہیں اس نے بتایا کہ وہ چٹاگانگ سے ایک روز پیشتر وہاں لائے گئے تھے۔ اور ان میں نیوی کے ایک کموڈور بھی تھے۔ میں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے مجھے اجازت دیدی۔ میں آگے بڑھا تو اپنے بڑے بھائی کموڈور اکرام الحق ملک کو سامنے پایا، ہم دونوں کیلئے یہ حیرت، غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات کا مقام تھا ہم دونوں بغلگیر ہوئے اس سے پہلے ہمیں ایک دوسرے کی سلامتی تک کا علم نہ تھا۔ ہمارا اس جگہ یوں آن ملنا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ میرے بھائی چٹاگانگ پورٹ ٹرسٹ کے چیئرمین تھے۔ وہ ۱۹ نومبر ۷۱ء کو پندرہ دن کی چھٹی پر کراچی گئے تھے۔ مگر دو روز کے بعد جب ان کو مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کی خبر ملی تو فرض شناسی کا جذبہ انہیں واپس کھینچ لایا۔ اور وہ ۲۵ نومبر کو واپس چٹاگانگ آن پہنچے۔ لیکن قسمت میں نظربندی لکھی تھی۔ وہاں پر بریگیڈیئر میاں تسکین الدین بھی تھے، ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس کے علاوہ کرنل محبوب (آرڈیننس) کیپٹن سلام (نیوی) لیفٹننٹ کرنل آفتاب حسین (بلوچ رجمنٹ) سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان تمام افسروں کو چٹاگانگ سے وہاں لایا گیا تھا ان کے علاوہ تین اور میجر بھی تھے۔ ان سب نے ہمیں بتایا کہ کلکتہ سے گوالیار تک کس بری حالت میں لایا گیا، گاڑی کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی گئیں اور چار روز تک نہ کچھ کھانے کو اور نہ پینے کو دیا گیا اور نہ ہی کھڑکیاں کھولنے کی اجازت دی گئی، یہ بڑا غیر انسانی سلوک تھا بقا بلتاً ہم اس لحاظ سے خوش قسمت رہے کیونکہ راستے میں ۲۱ بلوچ بٹالین کے جوان کھانے کا بندوبست کرتے رہے تھے اور کھڑکیاں کھلی رہی تھیں۔

میں نے اپنی چارپائی اپنے بڑے بھائی کے کمرے میں لگوائی۔ ہماری تلاشی لی گئی۔ چیزوں کی لسٹیں بنائی گئیں۔ باقی دن ایک دوسرے کو آپ بیتی سنانے میں گزر گیا۔ چٹاگانگ میں میری بیوی کا بھائی تھا۔ جو مشرقی پاکستان شپنگ کارپوریشن میں افسر تھا۔ میرے بڑے بھائی نے اس کے بارے میں بتایا کہ وہ ۱۴ دسمبر کو چٹاگانگ میں تھا جب حالات بالکل دگرگوں نظر آئے تو اسے ایک یونانی تجارتی جہاز میں بٹھا دیا گیا۔ لیکن جب اکرام کلکتہ لایا گیا تو انہوں نے وہی جہاز کلکتہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز دیکھا۔ میری بیوی کا بھائی اس پر کھڑا تھا۔

یونانی جہاز کو بھارتی نیوی نے پکڑ لیا تھا۔ میری بیوی کے بھائی کا رنگ اور نقش یونانیوں سے ملتے جلتے تھے چنانچہ وہ گوئن گا یونانی بن کر اس جہاز پر کام کرتا رہا۔ آخر جنوری کے آخر میں اس تجارتی جہاز کو حکومتِ ہند نے جانے کی اجازت دی تو وہ سنگاپور اُتر کر پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن کے جہاز پر کراچی پہنچا۔

میرا ایک اور بھائی میجر منظور الحق ملک سقوط کے وقت ڈھاکہ میں تھا۔ اُسی کے متعلق ہم دونوں بھائیوں کو سخت تشویش تھی۔ میں بار بار کہوں کہ وہ بھی انشاء اللہ خیریت سے ہوگا۔ اور یہاں ہی ہمیں ملے گا۔ ۹ر جنوری کو پندرہ افسر ڈھاکہ سے آئے، بارہ جنوری کو پچیس افسروں کا ایک گروپ وہاں پہنچا، ہم دونوں بھائی غور سے ان کو دیکھ رہے تھے اور ہماری نظریں اس بات کی جستجو کر رہی تھیں کہ شاید ان میں میجر منظور بھی ہو، آخر میں ایک افسر عینک لگائے بس سے نمودار ہوا۔ ہمارے لئے یہ کسی معجزے سے کم نہ تھا کہ وہ منظور ہی تھا۔ ہم تینوں کا تین مختلف مقامات سے تین مختلف تاریخوں کو بھارت کے پچاس کیمپوں میں سے ایک کیمپ میں اکٹھا ہونا واقعی ایک معجزہ ہی تھا۔ اسے بھی ہمارے کمرے میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ منظور سے ڈھاکہ کے سقوط کے حالات معلوم ہوئے، ہم تینوں ایک ہی کمرے میں رہنے لگے۔

جب ہم یہاں پہنچے تو پہلے چار روز کھانے کا کوئی بندوبست نہ تھا، صبح ناشتہ کافی روز نہ ملا دوپہر اور شام کا کھانا چند روز برائے نام رہا۔ میجر صاحب سنگھ جو بیر اسنٹر کا افسر تھا اور ہمارے کیمپ کا عارضی طور پر انچارج تھا کافی مہذب انسان تھا۔ اس کا معاون میجر پرتھوی پال سنگھ (ڈھلون) تھا، یہ بھی ایک افسر تھا وہ بھارتی ہاکی ٹیم کا کھلاڑی بھی تھا۔ اس کا رویہ بھی اچھا رہا، ایک اچھے فوجی افسر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اور خوبیوں کے علاوہ متعصب نہ ہو اور صاف دل ہو، جنگ میں فتح یا شکست ہوا کرتی ہے۔ جہاں اچھا سپاہی تندہی اور دلیری سے لڑتا ہے وہاں لڑائی کے خاتمے پر بھی وہ اپنی دلیری اور شجاعت کا عکس اپنے رویئے میں برقرار رکھتا ہے۔ نظر بندی کے دوران میں نے محسوس کیا کہ سکھ افسروں جن سے ہمارا واسطہ پڑتا رہا اور جن کے آباؤ اجداد سپاہیانہ پیشہ نہ رکھتے تھے ان کی ذہنیت متعصبانہ اور اُن کا سلوک بے حد ناروا سلوک تھا اس کا اندازہ آگے چل کر آپ خود

لگا سکیں گے ۔ واپسی پر دوسرے کیمپوں کے آئے ہوئے قیدیوں کی رائے اس بارے میں مختلف تھی کیونکہ سکھ فوجی جوانوں اور این سی او نے ہمارے جوانوں کے ساتھ زیادہ سختی برتی ۔

ہماری رہائش کی جگہ خاطر خواہ تھی ۔ چند روز میں کھانے کا بندوبست بھی ٹھیک ہو گیا ۔ البتہ دو کمبلوں میں رات کے وقت کافی سردی محسوس ہوتی تھی ۔ بعض افسروں کے پاس صرف ایک کمبل تھا ۔ وہ رات ٹھٹھرتے ہی گزارتے تھے ۔ ہمارے سپاہیوں کا حال بے حد برا تھا کیونکہ زیادہ تر کے پاس صرف ایک کمبل تھا اور سونے کے لئے سرد فرش گوالیار میں تین کیمپ تھے ۔ یعنی ۵۹، ۶۰، ۶۱ نمبر ۶۱ کیمپ کے تین کیج تھے ۔ ایک افسروں کا ، ایک جے او سی کا ایک جوانوں کا پہلے دس دن تو میجر صاحب سنگھ سے ہمارا واسطہ رہا ۔ اس کے بعد گوالیار کے تینوں کیمپوں کا گروپ کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل مدن لال مقرر ہوا ۔ اور ہر کیمپ کا ایک کمانڈر اور اس کے نیچے ہر کیج کا ایک کیج افسر مقرر رہا ۔ ہمارے کیمپ کمانڈر میجر دکرم چوہان اور کیج افسر کیپٹن جاتلے تھا ۔ جس دن صاحب سنگھ کی جگہ ان افسروں نے لی تو ہمیں ایک پیشہ ور افسر اور گھٹیا اور تنگ نظر افسروں میں فرق محسوس ہوا ۔ مدن لال ایک لمبا بے ساختہ اور بے ہنگم سا افسر تھا ۔ افسر نہیں بلکہ کسی پان کی ایک دوکان کا مالک دکھائی دیتا تھا ۔ بات چیت کا انداز دوکاندارانہ تھا ۔ پہلے ہی روز اس نے طعنہ بازی سے کام لیا ۔ ہم نے کہا ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا دالا معاملہ معلوم ہوتا ہے ۔ میجر چوہان ظاہراً شریف لیکن اندر سے بالکل مختلف قسم کا انسان تھا ۔ وہ کمزور اہلیت کا مالک ہونے کی وجہ سے اپنے ماتحتوں پر کنٹرول نہ کر سکتا تھا ۔ بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ۔ اس کے ماتحت اسے اپنے زیر اثر رکھے ہوئے تھے ۔ کیپٹن جاتلے اگرچہ سمارٹ افسر تھا لیکن بے حد بدتمیز تھا ، چشمہ لگاتا اور بڑی بڑی مونچھیں رکھے ہوئے تھا ۔

۲۰ جنوری کو لیفٹیننٹ جنرل بھگت سنگھ جن کو دوسری جنگ عظیم میں وکٹوریا کراس ملا تھا اور سنٹرل کمانڈ کا کمانڈر تھا ۔ ہمارے کیمپ میں آیا وہ خود ایک پرانی جیپ میں بمعہ ایریا کمانڈر سب ایریا کمانڈر اور سٹیشن کمانڈر کے ہمارے کیمپ میں پہنچا ۔ اس کی کفایت شعاری قابل تعریف تھی ۔ دوسری فوجوں کو مجھے دیکھنے کا اتفاق ہو چکا ہے جو اس رینک اور عہدے کے افسر شاندار کاروں سے کم سفر کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں ۔ اچھی

بات خواہ دشمن میں ہی کیوں نہ ہو اس سے سبق سیکھنا چاہیئے۔

ہمارے کپڑوں، کمبلوں، چادروں اور تولیوں پر P.O.W کا نشان لگانے کا حکم آیا، اس کے لئے کالا رنگ لایا گیا۔ پتلون پر لگایا جانے والا نشان ناموزوں جگہ پر تھا۔ کیمپ اتھارٹی کو سمجھایا گیا کہ اگر نشاندہی کا مقصد محض سکیورٹی ہے تو پھر یہ نشان پتلون کے کسی اور حصہ پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا مقصد سپاہی کی ہتک اور بے عزتی کرنا ہے تو یہ جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی ہوگی لیکن وہ ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ لیفٹیننٹ کرنل سلطان نے بمعہ اپنے چند افسروں کے یہ حکم ماننے سے انکار بھی کیا، ایسے ماحول میں نافرمانی اسی وقت کارگر ثابت ہو سکتی تھی جبکہ سب کے سب احتجاجاً نافرمانی کے لئے تیار ہوتے کرنل سلطان کے اس انکار میں جرأت تھی اور دلیری تھی۔ میجر راجہ گشتاسب اور کیپٹن ندیم، لفٹیننٹ منیر اور سکینڈ لیفٹیننٹ اسد بھی سلطان کے ساتھ تھے۔ بعض کا خیال تھا کہ سلطان اور اس کے ساتھیوں کا یہ اقدام احمقانہ تھا۔ میری رائے میں نتیجہ کی پرواہ کیے بغیر ان کا ایسا دلیرانہ انکار جرأت مندی کی دلیل تھی۔ ہر جگہ پر ہر طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ اور ایک ہی ماحول میں مختلف خیالات پائے جاتے ہیں، مشکل کام کے لئے ہم خیالی پیدا کرنا مشکل کام ہے اور اس کا تجربہ مجھے باقی ماندہ نظر بندی کے دوران کافی ہوا۔

فل کرنل اور بریگیڈیئر کے رینک کے افسروں کو رام گڑھ اور بریلی کے کیمپوں میں علیحدہ رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ ۲۰ جنوری کو ہمارے کیمپ کے چار سینئر افسروں کو رام گڑھ لے جایا گیا۔ اپنے بڑے بھائی کموڈور اکرام الحق کے وہاں سے جانے پر ہم دونوں بھائیوں کو افسوس ہوا۔ کیونکہ ہمیں اکٹھے رہنے میں ڈھارس تھی۔ میجر ڈھلوان اُن کے ساتھ ان کو چھوڑنے کے لئے گیا۔ واپسی پر وہ میرے چند کپڑوں کے جوڑے جو میں فرید پور چھوڑ آیا تھا اور جو کرنل خوشدل خان آفریدی اپنے ساتھ لے گیا تھا لے آیا۔

افسروں کے کیمپ کے حصے تھے ایک حصہ جو تین بارکوں پر مشتمل تھا ہمارے والے حصہ سے چار سو گز دور تھا۔ ہم گیارہ لیفٹیننٹ کرنلوں کو ۲۹ جنوری کو میس کے قریب والی ایک بارک میں منتقل کر دیا گیا۔ بیرک پانچ کمروں پر مشتمل تھی، اس لئے ہر ایک کمرہ میں دو دو افسر ہو گئے۔ ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم تھا اس ادلی بدلی میں میجر منظور کو کیمپ کے دوسرے حصہ میں بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد اس سے میری

ملاقات جب وہ کھانے کے لئے آتا ہو جایا کرتی۔ ویسے ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ میں اور لیفٹیننٹ کرنل سلطان کرنے والے گوشے میں اکٹھے ہو گئے اور پھر ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اس دوہری کانٹے دار باڑ کے ہر کونے پر اور درمیان میں پہرہ دار متعین تھے، باڑوں کو پار کر کے فرار ممکن نہ تھا۔ اس لئے فرار کے کسی خاطر خواہ منصوبے کی تصویر دماغ میں نہ بن پائی۔ صرف لیفٹیننٹ کرنل سلطان احمد تھا جو گاہے بگاہے کہتا رہتا کہ فرار کی کوئی ترکیب سوچنی چاہیئے۔ معاملہ باتوں ہی میں ختم ہو جاتا رہا۔ وہ کہتا کہ سرنگ کھود کر نکلا جائے۔ کھودنے کے اوزاروں کے بغیر یہ مشکل تھا۔ جنوری کے آخر میں ایک روز سلطان میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شوآرم تھا، جو کمرہ ملازم جاتے ہوئے اسے دے گئے تھے۔ مجھ سے کہنے لگا "جبتل" (ہم ایک دوسرے کو جبتل کہہ کر پکارا کرتے تھے: یہ ایک فلم میں کسی ہیرو کا نام تھا جو ہم دونوں نے پاکستان میں ۱۹۶۲ء میں اکٹھی دیکھی تھی) بس کام بن گیا میں نے پوچھا کیا اور کیسے بن گیا؟ کہنے لگا کہ کھودنے کی چیز مل گئی اور مجھے ہاتھ میں پکڑا شوآرم دکھانے لگا۔ میں بے حد ہنسا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے، جب اس نے اپنی بات دو تین دفعہ دہرائی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا بلکہ بے حد سنجیدہ ہے، دل میں اس کی بیوقوفی پر ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ رجائیت پسندی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ شوآرم سے ستر اسی فٹ لمبی سرنگ کیسے کھد سکتی ہے اگرچہ بعد میں میں اس کے مصمم ارادے کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا میں نے اس سے کہا کہ اس سے بہتر اوزار کی ضرورت ہے، میرے اس مشورے سے وہ کافی مایوس ہوا، اس کی تسلی کے لئے میں نے اس سے کہا کہ آؤ تمہاری تسلی کرا دوں۔ ہم غسل خانے میں گئے۔ ایک ٹائل اتاری اور شوآرم سے فرش میں سوراخ کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر نیچے سیمنٹ میں دو انچ سوراخ بھی نہ ہو پاتا تھا چنانچہ اسے ناقابلِ عمل سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔

کرنل سلطان بظاہر تو مان گیا مگر اس کا دل نہ مانا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے بات کی۔ اس کی بٹالین کے دو افسروں کے سوا باقی سب اس کے اشاروں پر چلنے کے لیے تیار تھے۔ ان کے علاوہ کیپٹن طارق سعید بھی اس کے ساتھ تھے، چنانچہ دوسری بارک کے ایک غسل خانے سے جہاں ۳۱ بلوچ کے تین افسر

رہتے تھے ٹائی اتاری گئی اور بھاری پتھر مار کر اُن افسروں نے فرش توڑنے کے بعد ایک پتلی سلاخ سے ایک فٹ کے قریب گہرا گڑھا کھودا، ان کے غسل خانے کے باہر سنتری پوسٹ تھی، مگر ہمارے کمرے کے باہر باڑ کے قریب ہی سنتری پوسٹ تھی۔ اس لیے یہاں سے فرش توڑنے کی آواز اُس سنتری تک جا سکتی تھی۔ اس لیے سلطان نے مجھے بتایا کہ دوسرے غسل خانے سے کام چالو کر دیا گیا ہے اور دو تین فٹ نیچے تک کام ہو گیا ہے۔ سلطان کے ارادے کی پختگی سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اُسے مشورہ دیا کہ اس غسل خانے کی جگہ غیر موزوں ہے کیونکہ وہاں سے سو فٹ لمبی سرنگ کھودنے کے بعد بھی سنتریوں کی نظر سے بچ کر نکلنا پڑے گا۔ سب سے مناسب جگہ ہمارا والا غسلخانہ تھا کیونکہ اس جگہ سے صرف ساٹھ فٹ لمبی سرنگ دوسری کانٹے دار تار کے باہر پہنچا دے گی جہاں سے آگے نکلنا سہل ہو گا۔ اس نے مجھ سے اتفاق کیا اور دوسرے روز پہلے والے گڑھے کو بند کروا کر اوپر ٹائلیں نصب کر دی گئیں۔

اپنے کمرے میں ٹرانسسٹر بلند آواز سے لگایا اور غسل خانے کے فرش کی چھ ٹائلیں نکالنے کے بعد نیچے کو سلیں اور پتھر مار مار کر توڑ دیا گیا۔ آدھ انچ قطر کے سریا کو آگ میں گرم کر کے اور اس کے ایک طرف کو پتھر سے مار کر فلیٹ کیا گیا تاکہ کھودنے کے لیے خاطر خواہ چیز بن سکے۔ پہلے ایک ہفتے کھدائی کا کام کیپٹن ندیم، لیفٹیننٹ منیر، میجر گستاسب، کیپٹن جلال الدین، سکینڈ لیفٹیننٹ اسد سب سے جونیئر ۳۱ بلوچ کا افسر تھا۔ وہ پی ایم سے پاس ہونے کے بعد ۲۹ نومبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان میں اس بٹالین میں تعینات ہوا۔ اور محض دو ہفتوں کی کل سروس کے بعد جنگی قیدی بن گیا وہ اکثر کہتا کہ میں نے چند روز تو کل سروس کی ہے اور اس سے کہیں زیادہ جنگی قیدی رہنا پڑا ہے، یہ سروس اور قید کا کوئی خاطر خواہ تناسب نہیں، باوجود کم عمر اور ناتجربہ کار ہونے کے وہ بڑا جرأت مند اور دلیر افسر ثابت ہوا۔ نظر بندی کے ایام میں میں نے ہمیشہ اُسے ثابت قدم اور نڈر پایا۔ جب میں نے پہلے اسے کیمپ میں دیکھا تو وہ سکول کا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ سرنگ کھودنے میں وہ بڑا پیش پیش رہا۔

کیپٹن دید ایک ہکلانے والا آرٹلری کا افسر تھا اور ہمارے کیمپ میں کوارٹر ماسٹر کی ڈیوٹی کرتا تھا۔ کچھ تکبر کچھ بے وقوفی اس کے دماغ میں گھسی ہوئی تھی اور کافی احمقانہ باتیں کرتا تھا اور ہمارے

افسروں پر آتے ہی اس نے رعب جمانے کی کوشش کی۔ مگر کچھ بن نہ پائی۔ ایک روز اس نے لیفٹننٹ اسد کو بلایا۔

وید: ددددیکھو لہ لیفٹننٹ ای ای ادھر آآ آدمی، تہ تہ تمہارا نہ نہ نام کیا ہے

اسد: (ہکلاتے ہوئے) مہ مہ میرا نہ نہ نام آآ اسد ہے۔

یہ سن کر وید کو سخت غصہ آیا اور کہنے لگا۔

وید: مہ مہ مہ میرے سہ سہ ساتھ مہ مہ مذاق مت کہ کہ کرو میں بہ بہ بہت بہ بہ بڑا آدمی ہوں،

اسد: تہ تہ تہ تم بھی مہ مہ میرے سہ سہ ساتھ مذاق مت کرو، مہ مہ میں بھی بہ بہ بہت بہ بہ بڑا آدمی ہوں۔

وید: مہ مہ میں کہتا ہوں اااا انسانوں کی طہ طہ طرح بہ بہ بات کرو۔

اسد: مہ مہ کہتا ہوں کہ تہ تم بھی انسانوں کی طہ طہ طرح بہ بہ بات کرو

یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہا، تُو تُو میں میں بڑھتی چلی گئی، وید غصے میں آگ بگولا ہو کر پاگل ہو جاتا تھا زور زور سے شور مچانے لگا اور آپے سے باہر ہوا جاتا تھا۔ غصے میں وہ اور زیادہ ہکلاتا اور اسد اسی انداز سے ہکلاتے ہوئے اسے جواب دیئے جاتا۔ شور سن کر ہم میں سے کچھ افسر بھی وہاں جمع ہو گئے۔ وید جل بھن کر کہنے لگا "یہ میری نقلیں اتار رہا ہے۔ میں اسے سیدھا کر دوں گا۔ اسد نے بھی چلا کر جواب دیا کہ تم خود میری نقلیں اتار رہے ہو، تم خود آدمی بنو۔

ہم نے وہاں پہنچ کر معاملہ معلوم کرنے کی کوشش کی وید پکارے چلا جا رہا تھا کہ میں اسے سیدھا کروں گا۔ اس کو ایسی سزا دوں گا کہ یہ عمر بھر یاد رکھے گا وغیرہ وغیرہ، جب ہم نے اس کو بتایا کہ غصے کی کوئی بات نہیں اسد بھی ہکلاتا ہے۔ تمہاری نقل نہیں اتارتا تو وہ اس قدر شرمندہ ہوا کہ مزید ایک بات بھی کہے بغیر وہاں سے چلتا بنا۔

۲۸ جنوری کو عید الاضحیٰ تھی۔ ان حالات میں کیسی عید عید تو خوشیوں کا پیغام لاتی ہے۔ ایک طرف ملک کے ایک حصے پر دشمن کا قبضہ کو دوسری طرف نظربندی اور وہ بھی ناپاک عزائم رکھنے

والے ہمسایہ ملک کی ہے ۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ کے جذبۂ ایثار کی یاد میں دو رکعت نماز پڑھنی ضروری تھی، سامنے لان میں ہم تمام افسر مع اردلیوں کے اکٹھے ہوئے میں نے اس سے پہلے کبھی امامت نہ کی تھی لیکن اس عید پر زندگی میں پہلی دفعہ میں نے نماز بحیثیت امام کے ادا کی، خطبہ تو آتا نہیں تھا اس کی جگہ پر حضرت ابراہیمؑ کے جذبۂ اطاعت و ایثار پر مختصر سی تقریر کی ۔ آج کی عید ہم خوشی کے طور پر نہیں منا رہے منا بھی کیسے سکتے ہیں، ہمارا آدھا ملک جارحیت کا شکار ہو کر ہم سے چھن گیا ۔ ہمیں جنگ میں شکست ہوئی اور اب دشمنوں کے ہاتھوں میں ندامت اور شرمساری کے دن گزار رہے ہیں ۔ ہمارے ملک کے حالات سے ہمیں ناواقفیت ہے جو غالباً زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ہے ۔ ہمارے لئے یہ اندوہگیں ایام ہیں ۔ اس لئے خوشی منانے کا تصور بھی ہم دماغ میں نہیں لا سکتے، لیکن اپنے غموں میں ہم حضرت ابراہیمؑ کے جذبۂ اطاعت و ایثار کو کبھی بھی نہیں بھول سکتے، آج کے دن انہوں نے سب سے پیاری چیز خدا کی راہ میں قربان کرنے کا مظاہرہ کیا، افسوس کا مقام ہے کہ ہم نے اُن کی قربانی کے جذبے کو اپنے لئے ایک رسمی یادگار بنا لیا، اُن کے جذبہ کی آگ سے چنگاری بھی حاصل نہ کی ان کی جذبہ کی رُوح کو تو بھول گئے لیکن محض بکرے کی قربانی ضیافت کے لئے یاد رکھی ۔ اطاعت اور قربانی کا وہ جذبہ اگر ہمارے دلوں کو گرمائے رکھتا تو آج ہم اس قدر رسوا اور شرمندہ حال نہ ہوتے ۔

آیئے ہم آج اپنے دل سے وعدہ کریں کہ ایثار و اطاعت کی اس مثال کو اپنی زندگی کے لئے مشعلِ راہ بنائیں گے، اگر ہم سنتِ ابراہیمی کو ادا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمارا، ہمارے ملک اور ہماری قوم کا مستقبل درخشندہ ہو گا ۔ باقی دن دوسرے دنوں سے مختلف نہ گزرا ۔

کیمپ میں پہنچنے کے چند روز بعد جب ایک دوسرے کو آپ بیتی سناتے سناتے تھک گئے تو دن گزارنے مشکل ہو گئے ۔ سارا دن دھوپ میں بیٹھتے بیٹھے تھک جاتے، ذہنی مشق ان حالات میں ضروری تھی، نہ اخبار ملتا اور نہ ہی کوئی کتاب ابھی ٹرانسسٹر رکھنے کی اجازت نہ ملی تھی ۔ میں نے ایک کاغذ پر شطرنج کے لئے خانے بنائے پھر سفید اور کالے پتھر اکٹھے کر کے ان سے شطرنج کے مہرے تیار کئے ۔ اس طرح روزانہ ایک دو بازیاں آپس میں لگ جاتیں ۔ چند ہفتوں کے بعد بازار سے

شطرنج کے دو تین سیٹ خرید لئے گئے۔ پھر ایک وقت آیا، کہ شطرنج اس قدر مقبول ہوئی کہ سارا دن ہر طرف شطرنج کھیلی جانے نظر آنے لگی۔ سارے کیمپ میں قریباً ہر افسر اس کا ماہر بن گیا۔ جولائی اگست کے مہینے میں شطرنج کے میس نے مقابلے کروائے۔ انہی دنوں دنیا میں شطرنج کی چمپئین شپ کے لئے روس کے سپاسکی اور امریکہ کے کھلاڑی کے درمیان مقابلہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ ان کی چالوں پر خوب بحث ہؤا کرتی۔ کچھ دن ان مقابلوں میں گزر گئے۔

آیئے پھر واپس اپنی سرنگ کی مہم کی طرف چلیں۔ ۲۹ جنوری کو جب تمام لیفٹنٹ کرنلوں کو علیحدہ علیحدہ بارک میں منتقل کیا گیا (ہم کل گیارہ لیفٹنٹ کرنل تھے) تو اس ردو بدل کے وقت ندیم۔ منیر اور گستاسپ کو کیمپ کے دوسرے حصے میں بھیج دیا گیا۔ اس سے سرنگ کے کام کے لئے کارکنوں کی کمی ہوگئی۔ لیکن اس کے باوجود کھدائی کا کام جاری رہا۔ نکالی ہوئی مٹی بوریوں اور بالٹیوں میں ڈال کر چارپائی کے نیچے چھپا دی جاتی۔ بالٹی وہاں سے باورچی خانے میں عنصر اور نذر لے جاتے اور وہاں سے باورچی خانہ کے باہر گڑھے میں پھینک کر اس کے اوپر راکھ پھیلا دی جاتی۔ کھودنے سے مٹی کو باہر پھینکنے کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ تھا۔ کبھی شام کو وقت نکال کر کیاریوں میں ڈالتے۔ کبھی پتلون کے اندر اور جیبوں میں ڈال کر باہر لان میں بکھیرتے، سلطان اور افسروں کو بھی اس کام میں شامل ہونے کی ترغیب دیتا رہتا۔ لیفٹنٹ کرنل شیخ محمد شریف بھی ہم خیال ہوئے۔ اس طرح اب ہم پانچ کرنل منصوبے کے متعلق صلاح مشورے کرتے۔ یہ حوصلہ بڑھانے والی فضا تھی۔ لیکن تاحال ہم پانچوں کام کرنے والے تھے، ۶ فروری تک سات فٹ گہری اور گیارہ فٹ لمبی سرنگ تیار کی جا چکی تھی۔ کام کرنے کے لئے اندر روشنی کی ضرورت تھی میس میں لگی ہوئی ٹیلیفون کی فالتو تار اتاری گئی۔ ایک بلب کو توڑ کر اس کے اندر کی تاروں کے ساتھ دو سرے جوڑے گئے۔ ایک سٹور روم سے ہولڈر اور بلب اتارا گیا۔ یہ سب کام جعفری نے بڑی مہارت سے کیا۔ سرنگ کے اندر گھس کر میں نے بجلی کی تار نصب کی اور بلب اندر لٹکایا۔ دوسرا سرا جس میں بلب کا پیتل والا حصہ تھا وہ غسل خانے کی بتی کا بلب اتار کر کام کرنے کے وقت لگا دیا جاتا۔ کام کے بعد اُسے اتار کر سرنگ کے اندر رکھ دیا جاتا۔

غسلخانے کے فرش سے چھ ٹائلیں نکالی گئی تھیں۔ اُن کو ہر روز کام ختم کرنے کے بعد جوں کا توں بند کرنا ضروری تھا، تاکہ چیکنگ کی صورت میں راز فاش نہ ہو جائے۔ عبدالستار چوہدری اور میں نے مل کر دو سلاخوں کو موڑا اور انہیں یوں فٹ کیا کہ اُن کو ایک دوسرے کے اُوپر رکھنے کے بعد ٹائلیں بالکل ویسے ہی فٹ ہو جاتیں۔ کچھ سیمنٹ اور کیچڑ ہر وقت تیار رکھا جاتا اور جب کوئی بھارتی افسر اندر آتا تو چند منٹوں کے اندر ٹائلیں اس صفائی سے اپنی جگہ پر واپس لگا دی جاتیں کہ دیکھنے والے کو شبہ تک نہ ہوتا۔ نیچے سلاخیں لگانے سے یہ فائدہ بھی ہُوا کہ اگر کوئی ٹائلوں کے اُوپر بھی کھڑا ہو جائے تو وہ اس کا بوجھ سہارلے۔ جب مَیں بجلی کی تار سرنگ کے اندر لگانے گیا تو یہ میرا پہلا موقعہ تھا۔ تار لگانے کے لئے کوئی آدھ گھنٹہ لگا۔ سرنگ کے اندر ہلکی سی سانس گھٹنے کے باوجود بڑا سکون ملا۔ گریٹ اسکیپ (GREAT ESCAPE) انگریزی فلم کے سین آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ اس فلم میں دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریز جنگی قیدیوں نے جرمن کی قید سے فرار کے لئے سرنگ کھود کر فرار کی راہ اختیار کی۔

سرنگ کھودنے کی خبر کیمپ میں اپنے افسروں اور جوانوں میں سے کسی سے پوشیدہ نہ تھی اور ایسی بات پوشیدہ رکھی بھی کیسے جا سکتی تھی۔ کیمپ میں افسروں کے اس ضمن میں تین گروہ تھے۔ ایک وہ جو سرنگ میں کام کر رہے تھے یعنی وہ جو ہمارے ہم خیال تھے کہ قید سے ہر جنگی قیدی کا بھاگنا فرض ہے اور ہمیں ہر فرض کی ادائیگی میں ہر مشکل کا سامنا کرنے اور ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار رہنا چاہئے جنیوا کنونشن کے تحت بھی یہ جنگی قیدی کا حق ہے کہ وہ فرار کی کوشش کرے اگرچہ پکڑے جانے کی صورت میں اُسے زیادہ سے زیادہ ۲۸ دن قید (CONFINEMENT TO LINES) دی جا سکتی ہے۔ دوسرا گروپ اس کے برعکس فرار کے ہر منصوبے کے خلاف تھا۔ وہ بجائے ہماری ہمت افزائی کرنے کے ہمارے حوصلے پست کرنے میں مصروف تھے۔ بقول اُن کے واپسی جلدی ہونے والی ہے خواہ مخواہ تکلیف اٹھانے کا کیا فائدہ۔ پکڑے جانے کی صورت میں سب کو گولی مار دیں گے، سب کو بڑا ماریں گے۔ بے عزتی کروانے کا کیا فائدہ۔ جب تک دانہ پانی ہے یہاں رہیں گے۔ اب چوں کہ جنگ بند ہو چکی ہے۔ واپس جانے میں کیا جلدی ہے۔ جنگی قیدیوں کے لئے فرار کا فرض صرف اُس

صورت میں عائد ہوتا ہے جب جنگ جاری ہو۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ ایک صاحب نے فتویٰ صادر کر دیا ہے کہ ہتھیار ڈالنے کے بعد یہ شریعت کے خلاف ہے کہ فرار کی کوشش کی جائے۔ اور اور مزید یہ کہ:۔

جب لڑائی کا وقت تھا اُس وقت نہیں لڑے اب یہ سب کوشش فضول ہے، ہمیں مروا دو گے۔ سرنگ کھود کر نکلنا ناممکن ہے۔ بے وقوفوں کا منصوبہ ہے۔ یہ سب پاگل اکٹھے ہو گئے ہیں۔

ہمارے خیال میں ان لوگوں کی ذہنیت بالکل شکست خوردہ ہو چکی تھی: وہ نہ ہی کسی قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار تھے۔ اور نہ ہی کوئی خطرہ مول لینے کی ہمت رکھتے تھے وہ وہ دل ہی دل میں مانتے تھے کہ یہ ان کا فرض ہے۔ مگر اس کی ادائیگی کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ ان اس رویّے سے ہمیں سخت دکھ ہوتا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہم اس منصوبے میں سب مل کر برابر کا حصہ لیتے۔ ہمہ یاراں دوزخ و ہمہ یاراں بہشت کی ہمنوائی ہوتی۔ اتحاد میں بڑی برکت ہے۔ یہ سنتے آئے تھے مگر اب اس کی سچائی روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔

تیسرا گروپ جس کی اکثریت تھی وہ غیر جانبدار تھا، وہ خود اس بکھیڑے میں نہ پڑنا چاہتے اور نہ ہی اس میں حصہ لینے کے خواہشمند تھے۔ لیکن ان دونوں گروپوں کو اس بات کی سخت تشویش تھی کہ کہیں یہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو بعد میں گت ان کی بنے گی۔ اس لئے ان کی دعائیں ہمارے ساتھ نہ تھیں۔ کچھ موقع پرست بھی تھے، کہ جب منصوبہ کامیابی کے نزدیک پہنچنے لگے گا تو اس میں شامل ہو جائیں گے۔ وہ اپنا اظہارِ خیال کرنے کے قائل ہی نہ تھے۔ کل چوسٹھ افسروں میں سے سترہ افسر منصوبے کے حق میں تھے۔ دس بارہ مخالف اور باقی غیر جانبدار تھے۔ یہ صرف چند افسروں میں فرض شناسی کے احساس کی عدم موجودگی کا سوال نہ تھا۔ ہم اپنی قوم کا ایک حصہ تھے۔ ایک اہم تعلیم یافتہ اور سمجھدار لوگوں پر مشتمل ایک حصہ۔ اس صاف معاملے میں ہمارے مخالف خیالات رکھنے والے لوگوں کے مابین تناسب شائد پوری قوم کی عکاسی کرتا ہو اگر یوں ہے تو پھر بڑی تشویشناک بات ہے یہ تناسب افسوس ناک ہے بلندی پر پہنچنے والی قوموں میں سعی۔ کوشش۔ کشمکش اور خطرات سے دوچار

ہونے کی آگ بھڑکتی ہے۔ وہ خطرات سے گھبراتے نہیں مقابلہ کرتے ہیں۔ فرض کی ادائیگی میں مشکل راہوں کو اختیار کرنے سے گھبرانا میری رائے میں بزدلی ہے۔ اس بارے میں منطق سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ ورنہ جرأت اور بہادری کا ہر عمل انسانی منطق کی روشنی میں بے وقوفانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ سپاہی کا گولیوں کی بوچھاڑ میں بڑھنا احمقانہ عمل قرار دیا جائے گا۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل تھی محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

ہر درخشاں منزل کی راہوں میں اَن گنت کانٹے ہوتے ہیں۔ ان کانٹوں سے گزرنے کے بعد ہی ایسی منزلیں ملا کرتی ہیں۔ سہل منزل جس پر پہنچنا آسان ہو اور جس پر پہنچنے کے لئے نہ کسی خطرے سے دو چار ہونا پڑے اور نہ ہی کسی مشکل سے نبرد آزمائی کرنا پڑے منزل نہیں ہوتی دھوکہ ہوتا ہے سراب ہوتا ہے، زندہ رہنے کی خواہش رکھنے والی قوموں کی منزلیں زمین کے پتھر نہیں ہُوا کرتے آسمان کے ستارے ہُوا کرتے ہیں، وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ نہیں بہا کرتیں بلکہ اُس کے مخالف سمت میں تیرتی ہیں۔

اگر یہی ہماری قوم کے مختلف خیالات کے گروہوں کا تناسب ہے تو پھر ہمیں اپنی قوم میں ایسے انقلاب لانے کی ضرورت ہے جو پست حوصلہ رکھنے والوں کو یا تو بلند حوصلہ کر دے یا اُن کو نیست و نابود کر کے رکھ دے۔

اُن کی یہ دلیل کہ کشمکش کا اصل وقت ہتھیار ڈالنے سے پہلے تھا ضرور بجا تھی۔ مگر موجودہ حالات میں منفی خیالات کا حامل، ایک غلطی کے بعد، ایک شکست کے بعد، ایک ناکامی کے بعد یہ اندازِ فکر کہ مزید کشمکش لاحاصل ہے شکست خوردہ ذہنیت کی دلیل ہُوا کرتی ہے یا اُن کا یہ کہنا کہ یہاں نہیں واپس پاکستان جا کر کام کریں گے اور ولولے کا مظاہرہ کریں گے۔ محض خود کو دھوکہ دینے کے برابر ہے۔ جو انسان درپیش مسئلے اور مشکل کا جوانمردی اور اصولوں کی بناء پر مقابلہ کرنے سے ہچکچاتا اور دل کو یہ تسلی دیتا ہے کہ اب نہیں پھر کبھی۔ وہ ہمیشہ مشکلات سے گریز کرتا رہے گا۔ پاکستان میں واپس پہنچ کر کسی بھی پیش آنے والی یا آئندہ جنگ میں جان اور آرام کو خطرہ کے باوجود فرض شناسی کے عمل کے لئے اتنی ہی جرأت کی ضرورت ہوگی جتنی کہ یہاں پر تھی۔ جرأت پاکستان کے بازاروں میں فروخت نہیں ہوتی اس کے پیدا کرنے اور حصول کے لئے عمل

کی ضرورت ہے۔ ہر قدم پر اصولوں کے لئے سچائی، فرض کی ادائیگی کے لئے ایثار و قربانی کے جذبات اور ان جذبات کو عملی رنگ میں ڈھالنے سے ہی جرأت پیدا ہوتی ہے اور فروغ پاتی ہے۔ غرض ان پست حوصلہ ساتھیوں نے اپنی رخنہ اندازیوں سے ہمارے دلوں کو کافی ٹھیس پہنچائی۔ کچھ میرے پاس آئے اور مجھے اس منصوبے سے باز رہنے کی تلقین کرنے لگے مگر اپنا شیوہ تو یہ تھا ؎

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

کرنل سلطان نے دو افسروں سے اُن کا تعاون حاصل کرنے کے لئے بات کی تو انہیں سخت دل شکن جواب ملا۔ اُن کے ساتھ والے کمرے میں ہمارے سامان کا سٹور تھا۔ اُس میں سے وقت آنے پر غیر نشان شدہ سویلین کپڑے نکالنے کے لئے اُن کے کمرے کی (FALSE CEILING) چھت کے ذریعے اندر جانے کا خیال تھا، مگر انہوں نے ٹکا سا جواب دیا۔ بہر صورت خاموشی کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا جن کو فرض کا احساس نہ ہو اُن سے تعاون کی امید نہیں کی جاسکتی۔

فرض کی ادائیگی کے علاوہ آزادی کی جستجو بھی تو ایک نیک عمل تھا۔ حکومتوں کے مابین تصفیہ ہونے پر مل جانے والی آزادی اور اپنے زور بازو سے حاصل کردہ آزادی میں بڑا فرق ہے۔ ان کانٹے دار تاروں کے اندر انسانی چڑیا گھر کے سے ماحول میں دم گھٹ رہا تھا۔ چند گزوں پر آزادی تھی اور ان تاروں کے اندر غلامی سے بدتر قید۔ جہاں افسروں پر ہندوستانی سپاہیوں کا حکم چلتا تھا۔ کتنی دیر ان کے اندر مقید رہنا ہوگا۔ اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ جب بھارتی افسروں کے طعنوں اور توہین آمیز باتوں سے نجات حاصل کی جاسکتی تھی تو کیوں نہ ان سے چھٹکارا حاصل کیا جاتا۔ سلاخوں کے اندر بھی رہ کر آزادی کا جذبہ برقرار رکھنے کے لئے آزادی کی کشمکش ضروری ہوا کرتی ہے، خواہ ایسی کشمکش کامیابی کی منزل تک پہنچائے یا نہ پہنچائے۔ کامیابی اور ناکامی تو اللہ کے ہاتھ میں ہوا کرتی ہے۔ انسان کو کوشش کئے جانا چاہیئے، اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اصولوں کو چھوڑنا، اپنے حقوق سے کسی ڈر کی وجہ سے دستبردار ہونا غلط کاری سے مغلوب ہونا اور بغیر کوشش کئے حالات کو قسمت پر چھوڑ دینا اصل ناکامی ہے۔

دلوں میں آزادی اور اصولوں کی بناء پر زندگی بسر کرنے کی آگ جلائے رکھنے کے لئے مسلسل کوشش اور

کشمکش ضروری امر ہے۔

دو تین دن یونہی گذرے۔ کھدائی کا کام جاری رہا۔ حکم آیا کہ لیفٹننٹ کرنل اور جونیئر افسر آپس میں ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ چند جونیئر افسر جو دِن کو کھدائی کرتے تھے۔ اُن کا آنا جانا بھی بند ہو گیا۔ چوری چھپے وہ کبھی کبھار آ جاتے۔ میس میں ہمارے جانے اور کھانے کے مختلف اوقات مقرر کر دیئے گئے۔ اردلی تو پہلے ہی سے شام ڈھلے ایک قریب کی بارک میں لوٹا دیئے جاتے۔ وہ ہر صبح پانچ بجے واپس لائے جاتے۔ دن کے وقت اگر موقع ملتا تو عنصر اور نذر کچھ کھدائی کر لیا کرتے۔ اس لئے اب یہ ضروری ہو گیا کہ کھدائی کا کام ہم خود کریں۔ چنانچہ سلطان اور میں نے فیصلہ کہ کھدائی کا کام ہم خود کریں اور عنصر اور نذر مٹی باہر پھینکنے کا کام سرانجام دیں گے۔ مٹی کو باہر لے جا کر غائب کرنا کارِ دارد تھا۔ روزانہ دو تین بوریاں مٹی نکل آیا کرتی۔ ہمارے کمرے کی فالس سیلنگ گتے کی بنی ہوئی تھی۔ کچھ مٹی اس کے اُوپر پھینکی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ۱۰ فروری سے مَیں نے اور سلطان نے دن رات کام کرنا شروع کر دیا۔ کچھ مٹی علی الصبح جب عنصر اور نذر آتے وہ باورچی خانہ کے قریب والے گڑھے میں پھینکتے اور کچھ چھت پر پھیلا دی جاتی۔ لیفٹننٹ کرنل شریف ہلکے پھلکے آدمی تھے۔ اگرچہ ساخت میں کچھ کمزور اور کچھ بیمار سے بھی تھے لیکن ایکدفعہ شمولیت کا فیصلہ کرنے کے بعد میں نے اُن کو بیحد جرأت مند فرض شناس اور مستعد پایا۔ بعد میں بھی ہر مشکل فیصلے کے وقت انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ اُن کے اس خلوصانہ رویے کا میں بیحد مدّاح ہوں۔ میں اور سلطان باری باری کھدائی کرتے، ایک کھدائی کرتا دوسرا مٹی پیچھے کھینچتا جعفری اور ستار مٹی کی بالٹیاں اوپر پکڑ کر کمرے کے اندر چھت پر چڑھے ہوئے کرنل شریف کو پکڑا دیتے۔ یہ دونوں باہر بھی نظر رکھتے کہ کیپٹن جاتلے یا کوئی اور بھارتی افسر اندر تو نہیں آ رہا۔ چھت کے اندر کرنل شریف نے بستر کی دو دریاں بچھا کر لکڑی کے چوکھٹے پر نصب کیں۔ تاکہ مٹی کا وزن گتے کے بورڈوں پر نہ پڑے، ورنہ بورڈوں کے نیچے لیک جانے کا خدشہ تھا۔

قریباً ساری رات مَیں اور سلطان کھودنے کا دھندا جاری رکھتے۔ رات کی جمع شدہ مٹی بوری میں ڈال کر چارپائی کے نیچے رکھ دی جاتی جو علی الصبح عنصر اور نذر بالٹیوں میں ڈال کر باہر لے جاتے۔ چند روز

یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔ مٹی کے غائب کرنے کے لئے ہر طریقہ استعمال کرنا ضروری تھا کچھ مٹی کے گولے بنا کر شام کے دھندلکے میں تاروں سے باہر پھینکتے جو زمین پر گرنے کے ساتھ ہی ٹوٹ کر مٹی میں مل جاتے۔ بے شمار مٹی ہم نے اس طرح غائب کی۔

ہمارے کمرے سے ہمارے کیمپ کے اندر آنے والا دروازہ کوئی دو سو گز دُور تھا کیونکہ دو کانٹے دار باڑیں لگی ہوئی تھیں۔ اس لئے دو دروازے تھے جن کو تالا لگا ہوتا۔ جب بھی کوئی بھارتی افسر آنے لگتا تو اُس کے دروازے کے اندر گھُسنے سے کمرے تک آنے میں ہمیں اتنی مہلت مِل جاتی کہ مٹی کو سرنگ میں پھینک، بجلی کی تار اُتار اور ٹائلیں فِٹ کر کے کسی دوسرے کام میں مصروف ہو جاتے۔ ایسا دن میں دو تین مرتبہ ہو جایا کرتا۔ ہر لمحہ (SUSPENSE) میں گزرتا۔ ہر گھڑی خطرے سے بھرپور رہوتی۔ سُرنگ کے اندر کام کرنے سے پہلے چند روز میں تو ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے کھودنے کا آلہ دو انچ قطر کا ایک فٹ لمبا نوکدار لوہا تھا۔ اگرچہ یہ اچھا اوزار نہ تھا لیکن پھر بھی کھدائی کا کام تسلی بخش طریقے سے جاری رہا۔ ایک دن میں ایک فٹ کے قریب سُرنگ کھُد جاتی۔ دو تین گھنٹے لگاتار کام کرتے۔ اندر آکسیجن کی کمی ہونے کی وجہ سے سانس پھول جاتی۔ ایک ایک انچ کر کے کام آگے بڑھ رہا تھا۔ ہر انچ کھودنے کے بدلے سینکڑوں پسینے کے قطرے زمین میں جذب ہوتے رہتے۔ جب چند منٹوں کی کھدائی کے بعد سانس پھول جاتی تو ذرا سانس لینے کے لئے اور کمر سیدھی کرنے کے لئے دم لیا جاتا، لیکن ندا آتی کہ جلدی کرو وقت ضائع مت کرو۔ آزادی کی منزل اس سرنگ کے دوسرے کنارے پر ہے۔ تو بازوؤں میں بجلی کوند جاتی۔ تھکے ہوئے ہاتھ لوہے کی سلاخ اُٹھا کر پھر سے سرگرم ہو جاتے۔ سرنگ کا قطر مشکل سے ڈیڑھ فٹ کے قریب ہو گا۔ اس لئے بیٹھ کر کام نہیں کیا جا سکتا۔ کھدائی لیٹ کر ہی کرتے۔ کبھی بجلی بند ہو جاتی تو کام بند کرنا پڑتا۔

پکڑے جائیں گے تو کیا ہو گا؟ اس کا کم ہی خیال آتا۔ جب ایک کام کرنے کی ٹھان لی تو پھر اس کے پورا کرنے کی راہ میں جو خطرات حائل ہوں اُن سے نپٹنا جوانمردی ہے، اُن کے ڈر سے خوف زدہ ہونا بے سُود ہے۔ وردی کے دو جوڑے اور دو ٹوپیاں کھدائی کیلئے سرنگ کے اندر ہی چھپا دی جاتیں، کیونکہ وہ

مٹی اور کیچڑ سے لت پت ہوتیں۔ جہاں سرنگ کے آگے بڑھنے سے ہر روز ہماری ہمت بڑھتی وہاں کیمپ میں مخالف ساتھیوں کی چہ میگوئیاں، طعنے اور عدم تعاون کا رویہ تکلیف دہ ثابت ہوتا، ہم تو صرف یہ چاہتے تھے کہ کم از کم اُن کی دعائیں ہمارے شامل حال ہوں۔ اگر سب پوری طرح تعاون کرتے تو جہاں ہم ایک دوسرے کے لئے ڈھارس کا باعث بنتے وہاں کام کی رفتار تین سے چار گنا ہوسکتی تھی رات کو چھ سات گھنٹے کھودنے کے بعد دن کو بھی کھدائی کرنا مشکل ہوتا۔ شروع کے پندرہ بیس منٹ تو کام تیزی کے ساتھ ہوتا اس کے بعد تھکاوٹ کی وجہ سے کھدائی کی رفتار ڈھیلی پڑتی جاتی جعفری کا عذر تھا کہ اُسے (CLAUSTROPHOBIA) (تنگ جگہ میں گھبراہٹ کی بیماری) ہے۔ چنانچہ وہ سرنگ کے اندر نہ جاسکتا تھا۔ اس لئے وہ اور ستار مٹی غائب کرنے میں مدد دیتے۔ شریف کمزور بھی تھا اور کچھ بیمار بھی اُسے ہم نے سُرنگ کے اندر گھُسنے کے لئے کہنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ چھت پر چڑھ کر مٹی بکھیرنے کا کام کرتا۔ دوسرے چھ لیفٹننٹ کرنل جو ہماری بارک میں تھے وہ ہمارے منصوبے کے حق میں نہ تھے، وہ سارا دن دھوپ سینکنے میں گزارتے اور دبی زبان سے ہمیں کوستے رہتے۔

جس جگہ پر سرنگ کا مُنہ باہر نکلنا تھا وہاں ایک دن گارڈ نے اپنا خیمہ نصب کرلیا۔ اس لئے یہ ضروری ہوگیا کہ سرنگ کی سمت اور باہر نکلنے کی جگہ کو بدلا جائے۔ کرنل ستار کے پاس گراف پیپر تھا۔ اُس کے اوپر ہم دونوں نے مل کر پوری سکیل کے تناسب سے اُس پورے علاقے کا نقشہ بنایا اور سرنگ کی نئی سمت مقرر کرکے کام شروع کیا۔ اس تبدیلی سے سرنگ پندرہ فٹ کے بعد مڑ گئی اور یہ موڑ مٹی کے پیچھے پیچھے کھینچنے میں کافی مشکلات کا باعث بنا۔

پندرہ فروری کی رات کو ایک سنسنی خیز واقع پیش آیا۔ مَیں اور سلطان نے حسب معمول رات کے نو بجے کے قریب سرنگ کی کھدائی شروع کی۔ جعفری اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹا باہر دروازے کی طرف دھیان رکھے تھا ہم نے اپنے کمرے کے اندر چٹخنی لگا رکھی تھی اور غسل خانے کا دروازہ تھوڑا سا کھول رکھا تھا جعفری سے یہ اشارہ مقرر کیا ہوا تھا کہ اگر کپتان جاتیلے یا کوئی اور آئے تو وہ برآمدے میں آن کر ہمارے کمرے کی کھڑکی سے اندر غسلخانے کے دروازہ پر ٹارچ سے روشنی پھینکے۔ سرنگ میں

گھسنے سے پہلے ہم دونوں نے اپنے خالی بستروں کو یوں بنا دیا تھا جیسے معلوم ہو کہ اندر ہم سوئے ہوئے ہیں نو بجے سے بارہ بجے رات تک سلطان نے کھدائی کی اور میں بیٹھ کر مٹی پیچھے کھینچتا رہا اور باہر نکالتا رہا۔ بارہ بجے رات میں آگے گیا اور سلطان پیچھے آگیا۔ رات کے پونے تین بجے برآمدے سے ٹارچ کی روشنی دیکھ کر سلطان نے سرنگ کے اندر سے اچھا کی آواز دی اور مجھے جلدی سے باہر نکلنے کو کہا۔ پھر کیپٹن جاتلے کی آواز آئی کہ رول کال کے لئے باہر نکلو۔ یوں رات کو کبھی کبھی رول کال پہلے بھی ہوا کرتی تھی۔ ہوا یوں کہ جعفری لیٹے لیٹے سو گیا۔ جاتلے اندر آکر کھڑکی سے ہمارے کمرے کے اندر ٹارچ کے لشکارے مار رہا تھا۔ غسلخانہ مٹی سے بھرپور تھا میرے کپڑے کیچڑ سے لت پت تھے۔ سرنگ سے اُلٹے لیٹ کر باہر نکلنے میں اور کپڑے بدلنے میں کافی وقت درکار تھا۔ جاتلے باہر کھڑا شور مچا رہا تھا۔ سلطان کی آواز اتنی رات گئے غسلخانے کے اندر سے سُن کر اسے ضرور کچھ شبہ ہوا۔ وہ غسلخانے کی پچھلی سمت آیا، ٹارچ مار کر ادھر اُدھر دیکھا۔ سلطان باہر آکر جاتلے کو باتوں میں لگانے کی کوشش کرنے لگا تاکہ مجھے تیار ہو کر باہر نکلنے کا موقع مل سکے۔ میں نے بڑی سرعت سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ ٹائلیں لگانے کا وقت نہ تھا انہیں یونہی چھوڑ کر باہر فال ان ہو گیا۔ اس وقت میرے ہاتھ مٹی سے لت پت تھے۔ ہمیں فال ان کرنے کے بعد جاتلے غسلخانے کے پچھلی سمت پھر گیا۔ ہر لمحہ سنسنی خیز تھا۔ بس وہ کمرے کے اندر گیا غسلخانے میں جھانکا اور سارا ماجرا ختم۔ ایسے وقت میں خدا کی مدد کیلئے ہمارا پورا دل و دماغ دعا میں مشغول تھا۔ دل سے عجز و انکساری کے ساتھ بس یہی دُعا نکل رہی تھی کہ اے اللہ میاں تو ہی ہے جو ہماری مدد کرے، اور اس ناہنجار کی آنکھوں پر پردہ ڈال دے، دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا کیسے ضائع جا سکتی تھی۔ اللہ کو ہماری کامیابی منظور تھی، ہم نے اتنی محنت کی تھی اور اُسے اللہ میاں کیونکر رائگاں جانے دیتا جاتلے پارک کے عقب سے واپس آیا ہمیں گنا اور پھر کمروں میں واپس جانے کا حکم دیکر واپس چلا گیا ہم کمرے میں آئے، دروازے کو اندر سے بند کیا۔ جان میں جان آئی۔ اللہ میاں کا شکر ادا کیا دو عدد رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔ رات کے سوا تین بج چکے تھے۔ ہم دونوں کافی تھک چکے تھے۔ اس کے علاوہ ضروری تھا کہ مٹی کو غائب کرنے اور ٹائلوں کے لگانے کا کام صبح ہونے سے پہلے ختم ہو جائے کیونکہ جاتلے کو شبہ تو ہو چکا

تھا اس لئے چیکنگ کا خدشہ تھا۔ گھنٹہ بھر اسی کام میں گذر گیا۔ پھر ایک گھنٹہ کے لئے نیند سی کی۔ عنصر اور نذر آ گئے۔ مٹی کو باہر لے جا کر انہوں نے گڑھے میں پھینکا۔ غسلخانہ بالکل صاف ستھرا کر کے تیار کر دیا گیا۔ ہم نے ایک پتھر کی سل غسلخانے میں رکھی تھی۔ اس کو ان ٹائلوں کے باقی حصہ پر رکھا جن کو اب نصب کر دیا گیا تھا۔ ایک پانی کی بالٹی بھر کر ان ٹائلوں کے باقی حصہ پر رکھی۔ ایک تولیہ۔ تکیے کا غلاف اور بنیان بھی اُن کے اُوپر رکھیں۔ اور اُن کو صابن مل کر یوں چھوڑ دیا جیسے وہ دھونے ہوں۔ چھ بجے کے قریب ہم دونوں سو گئے۔

ہمارا خیال ٹھیک نکلا۔ نو بجے کے قریب کیپٹن جاتلے آیا۔ اس کے ساتھ دو اور این سی او تھے اور وہ ہمارے کمرے کی چیکنگ کے لئے آیا تھا۔ ساری رات شائد اُس کو یہ خیال ستاتا رہا تھا کہ اتنی رات گئے غسلخانے میں کیا ہو رہا تھا۔ اگر وہ رات کو ہی غسلخانے کو پوری طرح دیکھ لیتا تو اس کو سب کچھ معلوم ہو جاتا۔ مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ ہمارے لئے پھر امتحان شروع ہو گیا۔ ہم دونوں بیٹھے شطرنج کھیلنے میں محو تھے۔ وہ کمرے میں آیا چارپائیوں کے نیچے دیکھا۔ ہمارے غسلخانے میں گئے۔ ہماری تمام تر توجہ شطرنج سے ہٹ کر اس طرف مبذول ہو چکی تھی۔ شبہ ہونے کے بعد ایسی چیکنگ میں ہمارے راز کا فاش ہونا قریباً یقینی تھا۔ غسلخانے میں بالٹی کے ہٹانے کی آواز آئی پھر سل کھسکائی گئی تو ہم دونوں کا جسم سُن اور خون منجمد ہو گیا۔ نبض جیسے رُک گئی۔ این سی او نے غسلخانے کی چند ٹائلوں کو ڈنڈے سے ٹھونکا بجایا۔ چند منٹوں کے بعد دونوں کمرے میں آ گئے۔ میری چارپائی کے نیچے ایک ڈنڈا پڑا تھا اُسے اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے کہ یہ ڈنڈا یہاں کیا کر رہا ہے جاتلے کھسیانہ سا ہو کر باہر چلا گیا اور اُس کے پیچھے این سی او بھی باہر نکل گئے۔ ہم نے ایک لمبی سانس لی اور دل سے خدا کی تعریف کی اور ہمارے دل سے نکلی ہوئی دعائیں آسمان کی بلندیوں کی طرف پرواز کر گئیں۔ اللہ نے اُن کو اندھا کر دیا تھا۔ ورنہ ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ظاہر تھا کہ چند روز ہماری حرکات پر نظر رکھی جائیگی اس لئے ہم سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ کام چند روز کیلئے ملتوی کر دیا جائے۔ چنانچہ آئندہ سات روز کیلئے کام بالکل بند رہا۔ اُس وقت تک سات فٹ گہری اور بائیس فٹ لمبی سرنگ تیار ہو چکی تھی۔ باہر والی فینس کا فاصلہ ساٹھ فٹ

تھا اور ہمارا ارادہ اس سے بارہ فٹ آگے نکلنے کا تھا یعنی کل ۲ ، فٹ لمبی سرنگ کھودنے کا منصوبہ تھا۔ گراف پیپر پر بنائے ہوئے نقشے پر ہر روز کی کھدائی کے بعد سرنگ کی نشان دہی کر دی جاتی تاکہ نقشے کی مدد سے زمین پر سرنگ کا ٹھیک ٹھیک پتہ چلتا رہے اگرچہ یہ کافی مشکل لیکن ضروری کام تھا۔ کرنل ستار اس کو بڑی خوبی سے نبھا رہے تھے کیونکہ ٹھیک جگہ پر نکلنے کے لئے اس نقشے کا احتیاط سے تیار کرنا لازمی تھا۔

۲ ، فٹ پر نکلنے کی بہترین جگہ تھی۔ اس سے کم ساٹھ فٹ پر نکلنا ممکن تھا۔ حوالدار پریتم جنوری کے وسط سے ہمارے کیمپ کی سیکورٹی کا انچارج تھا۔ وہ ہر روز صبح آٹھ نو بجے آتا اور تین چار بجے واپس چلا جاتا۔ زیادہ وقت میس کے عقب میں بیر کے درخت کے نیچے بیٹھ کر گزارتا۔ ہماری مٹی کی بالٹیاں اس کی موجودگی میں کمروں سے نکل کر باورچی خانے کے راستے گڑھے میں جاتی رہیں، دراصل وہ مٹی اس کی آنکھوں میں پڑتی رہی۔ اُسی رات کے حادثہ اور دوسری صبح کی چیکنگ سے بچ نکلنے کے بعد دل کو مکمل یقین ہو گیا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ یہ بچاؤ غائبانہ مدد کے علاوہ کسی اور وجہ سے نہ تھا لیکن احتیاط سے کام کرنا لازمی سمجھ کر چند روز کے لئے کھدائی بند کرنا مناسب سمجھا۔

## ۹

۲۳ فروری کا ذکر ہے۔ سامنے گیٹ کے قریب کیپٹن جاتلے کسی پر غصے ہو رہا تھا اُس کے سامنے ہمارا ایک سپاہی خوشی محمد کھڑا تھا۔ بات چیت کچھ یوں ہوئی۔

جاتلے :۔ تم نے سر کے بال کیوں نہیں بنوائے اتنے لمبے ہو گئے ہیں۔

خوشی محمد :۔ جناب یہاں پر حجام نہیں جب آئیگا تو بنوا لوں گا۔

جاتلے :۔ کیا بکواس کرتے ہو۔ یہاں پر حجام موجود ہے۔ جھوٹ بولتے ہو۔ اس کے بعد اُس نے خوشی محمد کی ایک نہ سُنی اور ہانکتا چلا گیا۔ میں تمہیں سزا دلوا کر چھوڑوں گا۔ ایک تم نے حجامت نہیں بنوائی دوسرے جھوٹ بولا ہے۔ بے چارا خوشی محمد جناب اور حضور ہی کہہ پاتا اور جاتلے پھر سے

اپنے جلال میں ہاں ہاں شروع کر دیتا اور اُس کو اپنی صفائی کا موقع نہ دیتا۔ بڑک پر سٹیشن کمانڈر گذر رہا تھا یہ سُن کر اُس نے اپنی کار روکی اور اندر آیا اور جھگڑے کا سبب پوچھا۔ جا تلے نے خوشی محمد کی شکایت کی اور کہا کہ وہ اسے سخت سزا دیگا۔ سٹیشن کمانڈر نے خوشی محمد سے اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے کہا۔

خوشی محمد:۔ جناب یہ خواہ مخواہ گالیاں دے رہے ہیں میری بات سنتے ہی نہیں اور سارا کیمپ سر پہ اٹھا رکھا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ میں نے بال نہیں کٹوائے۔ میرا یہ کہنا بھی درست ہے کہ یہاں حجام آئیگا تو اُس سے کٹواؤں گا۔ اور ان کپتان صاحب کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ یہاں کیمپ میں حجام موجود ہے۔ میری گذارش صرف اتنی ہے کہ وہ حجام میں خود ہوں اور اپنے بال خود کاٹنے سے قاصر ہوں۔ اتنی دیر میں ہم میں سے کچھ افسر وہاں اکٹھے ہو چکے تھے۔ اس بات پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور بے چارہ جا تلے اپنا سا مُنہ لے کر رہ گیا۔ اس کے بعد جب بھی وہ آتا تو شرمندہ نظر آتا اور خوشی محمد اُسے دیکھ کر مسکرایا کرتا۔ اور وہ دانت پیس کر رہ جاتا۔

جب ہم گوالیار پہنچے تو چند روز تک ہمارے ٹرانسسٹر ہمارے پاس رہے پھر جمع کر لئے گئے گھڑیاں۔ ٹوپیاں۔ پیٹیاں اور کرنسی بھی جمع کر لی گئی۔ پھر ٹرانسسٹر چند روز کے لئے ملے اور تین چار روز بعد واپس لے لئے گئے۔ اس طرح پہلے چار ماہ کے دوران کوئی دس مرتبہ ریڈیو رکھنے کی اجازت اور منسوخی کے حکم صادر ہوتے رہے۔ اس طرح ہم سے ہمارے بلیڈوں کے پیکٹ یہ کہہ کر لے لئے کہ اُن کو خدشہ ہے کہ ہم ان سے کہیں اپنے آپ کو ضرر نہ پہنچائیں کیا ہی احمقانہ دلیل تھی، صرف ایک ایک بلیڈ رکھنے کی اجازت دی گئی۔ اس طرح قریباً ایک سو بلیڈوں کے پیکٹ جمع ہو گئے۔ حقیقت میں کیپٹن جا تلے اور اُس کے ساتھیوں کی نظر 7,0.CLOCK پر بلیڈوں پر تھی جو انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ وہ پیکٹ افسروں کو پھر کبھی واپس نہ دیئے گئے۔ ظاہر ہے کہ بھارتی افسروں نے انہیں آپس میں بانٹ لیا تھا۔ اس طرح کی جنیوا کنونیشن کی خلاف ورزیاں وہ اکثر کیا کرتے۔

گوالیار پہنچتے ہی ہمیں آزادی اور جمہوریت اور اسی کے انگریزی ترجمے کا اخبار (FREEDOM AND DEMOCRACY) مہیا کیا جانے لگا۔ شروع مہینہ بھر کے قریب اور کوئی اخبار نہ ملا۔ یہ

ہفتہ وار اخبار صرف جنگی قیدیوں کے لئے شائع ہوتا، اور بھارتی پروپیگنڈہ سے بھرپور رہتا۔ بھارت میں مسلمان بادشاہوں کے قصوں اور اسلامی تاریخ کی جھلکیوں کے ساتھ بھارت کا نقطہ نظر بڑی ہوشیاری سے پیش کیا جاتا۔ برصغیر کی تمام تر خرابیوں کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہرایا جاتا۔ اخبار کا مقصد یہ تھا کہ جنگی قیدیوں کو دماغی اور قلبی طور پر اس بات کی یقین دہانی کروائی جائے۔ کہ مذہب کی بناء پر ہندوستان کی تقسیم غلط عمل تھا اور یہ کہ بھارت اور پاکستان کے عوام ثقافتی، معاشی، تہذیبی اور تاریخی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس ہفت روزہ میں پاکستان کے حالات کی بُری تصویر پیش کر کے ہمارے خیالات اور مورال پر اثر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اس کے لاؤڈ سپیکر پر جنگی قیدیوں کے لئے خاص پروگرام براڈ کاسٹ کیا جاتا۔ جس کا مقصد بھی اس ہفت روزہ اخبار کی طرح بھارت کی منصفانہ اور دوستانہ روش کا طوطی بجانا اور پاکستان کو دشمنانہ رویہ اور ماضی کی جنگوں کا موردِ الزام ٹھہرانا ہوتا۔ ہمارے نوجوان افسر اور جوان جنہیں کبھی ہندو کے ساتھ واسطہ نہ پڑا تھا اور نہ ہی وہ اس کی ذہنیت سے واقف تھے۔ غیر شعوری طور پر ایسے پروپیگنڈے کا شکار ہو سکتے تھے۔ یہ فکر کی بات تھی۔ اپنے ساتھ رہنے والے ساتھیوں کو تو صحیح اندازِ فکر سے آگاہ کیا جا سکتا تھا، مگر سپاہیوں کے کیمپوں کے لئے کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آتا۔ ایم آئی روم میں آنے والے جوانوں کے ذریعے باقی کو مختصر طور پر ہدایت دی جایا کرتی کہ وُہ دشمن کے پروپیگنڈے سے ہوشیار رہیں اور اس ہفت روزہ اخبار کے پڑھنے سے پرہیز کریں۔

وقتاً فوقتاً مسلمان مقررین کو ہمارے کیمپوں میں تقریریں کرنے کے لئے بھی لایا جاتا۔ ان کا ذکر آئندہ صفحات پر آپ پائیں گے۔ ان سے کچھ ایسے سوال و جواب ہوئے کہ بھارتی حکام نے ان مقررین کے لانے کو بے اثر سمجھ کر اس طریق کار کو ترک کر دیا۔

مارچ کے آخر تک پاکستان سے کوئی خط نہ آیا۔ وہاں عزیز و اقارب ہمارے بارے میں لاعلم تھے۔ کون جنگی قیدی ہوا ہے؟ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ کون سے کیمپ اور کس حال میں ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے چار ماہ گذر جانے کے بعد تک وہ عجب کشمکش میں مبتلا ہوں گے۔ جنوری کے

وسط میں ہمیں خط لکھنے کی اجازت دی گئی۔ ہمارا اندازہ تھا کہ شروع کے خط کم از کم تین چار ماہ کا عرصہ لیں گے۔ وہ سنسر کے جھمیلوں سے گذر کر پاکستان پہنچیں گے، یہ اندازہ درست نکلا۔ جو خط پاکستان لکھے ان میں اشارتاً یہ بتایا جا سکتا تھا کہ ہم گوالیار میں ہیں۔ کیونکہ تمام خط سنسر ہوتے تھے چنانچہ پہلے ہی خط میں مَیں نے اشارہ کرنے کی کوشش کی جو سنسر والوں نے پھاڑ دیا۔ "اگر ہماری گاڑی کوئی ۷۵ میل مزید شمال کی طرف چلتی تو تاج محل کی جھلک دیکھنے کا موقع مل جاتا۔"

(گوالیار آگرہ سے ۷۵ میل جنوب میں واقع ہے) دوسرے خط میں یوں لکھا میری رائے میں گوالمنڈی اور یار محمد والے مکانوں کے پہلے حصوں کو ملا کر قیام کی جگہ تجویز کرنے سے مسئلہ حل ہو جائیگا۔ چنانچہ اس طرح میرے گھر والوں کو پتہ چل گیا کہ میں گوالیار میں ہوں۔ آزادی اور جمہوریت اخبار کے ایک شمارے میں ۳۱ بلوچ بٹالین اور اُس کے کمانڈنگ افسر کرنل سلطان احمد کی جنگ کے دوران کارکردگی کی بڑی تعریف کی گئی تھی۔ ہماری یہ بٹالین کمال پور اور جمال پور میں بڑی بہادری سے لڑی۔ اخبار میں کہانی کچھ اس طرح شائع تھی۔ بھارتی بریگیڈ کمانڈر نے کسی بنگالی کے ہاتھ کرنل سلطان کو جمالپور میں پیغام بھیجا کہ اُس کی بٹالین بالکل گھر چکی ہے اس لئے وہ ہتھیار ڈال دیں ورنہ آئندہ چالیس بمبار جہاز اُن کی پوزیشنوں پر گولہ باری کر کے انہیں تباہ و برباد کر دیں گے۔ اسی مراسلے میں انہوں نے یہ بھی لکھا کہ اُسے امید ہے کہ مراسلہ دینے والے کو کوئی تکلیف نہ دی جائے گی۔ اس خط کے جواب میں کرنل سلطان نے اپنے مراسلے کے ساتھ ایک رائفل کی گولی بھیجی۔ اس نے خط میں یہ لکھا کہ تمہاری چٹھی کا جواب یہ گولی ہے جو ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی نہ کہ یہ خطوط نویسی تم نے لکھا ہے کہ جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہے اور میں کہتا ہوں کہ جنگ ابھی شروع ہی نہیں ہوئی۔ اور ہاں میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ آئندہ روز محض چالیس بمبار جہازوں سے کام نہ بن پائے گا۔ کوئی چار سو کا بندوبست کرو اور ہاں ایک فوجی کی حیثیت سے یہ تمہیں خیال بھی کیونکر آیا کہ تمہارا مراسلہ لانے والے کو ہم تکلیف دیں گے۔ مہربانی کر کے اس سے ذرا پوچھو تو کہ ہماری پُر تکلف چائے کیسی تھی۔

کیمپ کے سامنے سے پختہ سڑک گذرتی تھی جس کے پار پیرا سنٹر کا افسر میس تھا۔ اس میں

کبھی کبھار پارٹی ہوتی تو فوجی بینڈ بجتا۔ فاتح فوجیں رنگ رلیاں منانے کی حقدار تھیں۔ سامنے سڑک سے کبھی کوئی تانگہ یا تین پہیوں والی گاڑی گذرتی۔ مزدور صبح شام سامنے سے گزرتے دکھائی دیتے اتوار کو بھارتی فوجی ہمارے کیمپ سے مشرق کی جانب فیملیز کوارٹرز میں رہتے تھے۔ سائیکلوں پر اپنے بیوی بچے بٹھائے گوالیار شہر کو آتے جاتے دکھائی دیتے۔ افسروں کے کیمپ کے دونوں حصوں کے درمیان یعنی ہمارے اپنے کیمپ کے عقب میں ایم ای ایس کی دو تین کوٹھڑیاں تھیں جس میں اُن کا سامان پڑا ہوتا۔ اصل میں یہ کوٹھڑیاں ریاست گوالیار میں راجہ کی حکومت کے وقت مورار ریلوے سٹیشن کی عمارت تھی۔ چھوٹی گیج کی پٹڑی اکھاڑ لی گئی تھی۔ ہمارے پہنچنے پر کیمپ کے ارد گرد دو رویہ کانٹے دار تار لگی تھی۔ مگر ایک ماہ کے اندر ہر کونے پر پچاس فٹ اونچی مچانیں تیار کی گئیں۔ جن کے اوپر سرچ لائٹ نصب تھی۔ دونوں بازوؤں کے درمیان ہر پچیس فٹ کے فاصلے پر کھمبے لگا کر بجلی لگائی گئی اور ہر کھمبے پر دو دو فلورسینٹ ٹیوبز لگائی گئیں جن سے رات بھی دن کی طرح روشن بنا دی گئی، رات کو ہر پچاس فٹ کے فاصلے پر دونوں باڑوں کے درمیان سنتری ڈیوٹی پر ہوتے۔ ان کے علاوہ فوجی کُتے بھی رات کو گاہے گاہے گھمائے جاتے، الغرض سیکورٹی کا اچھا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ کانٹے دار تاروں کو پھاند کر یا اُن کے بیچ میں سے گزر کر باہر نکلا جا سکے۔

آٹھ جنوری کو شیخ مجیب کو جب صدر بھٹو نے غیر مشروط طور پر رہا کر کے لندن روانہ کر دیا تو قیدیوں کا وثوق اور بڑھ گیا کہ اب ہماری واپسی بالکل نزدیک ہے اس وجہ سے بھی سرنگ کے مخالفین زیادہ تھے۔ اس قید اور سیکورٹی کے باوجود یہاں سے بھاگ نکلنے میں اور چیزوں کے علاوہ ADVENTURE بھی تو تھا۔ ایک چیلنج کا مقابلہ، اس لئے اس مہم میں اُن تمام جذبات کی تسکین کا راز مضمر تھا جو انسان ایک چیلنج کو قبول کرنے میں حاصل کرتا ہے۔ لہو کو گرم رکھنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا، ایسے ماحول میں کچھ مدت کے بعد خون کے سرد پڑ جانے کا خطرہ تھا۔ فکر و عمل کا چراغ روشن رکھنے کے لئے تگ و دو۔ جھپٹنے۔ پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے کی ضرورت ہوتی ہے ان کے بغیر جسم مفلوج اور دماغ شل ہو جاتا ہے۔

رہنے اور کھانے کا بندوبست خاطر خواہ تھا۔ راشن سپاہیوں کے سکیل پر تھا۔ تول کر نہ دیا جاتا بلکہ اندازے سے ملتا۔ اس لئے اکثر کم ہو جایا کرتا۔ ہفتہ میں دو دفعہ گوشت اور باقی وقت دال یا سبزی ہوتی۔ پیٹ بھر جایا کرتا۔ شام ڈھلنے کے بعد کمروں سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ فروری کے سرد مہینے میں بھی کمروں کی کھڑکیاں کھول کر سونے کا حکم تھا۔ تاکہ ہم بند کمروں کے اندر کوئی فرار کا کام شروع نہ کر دیں۔ صبح اور شام گنتی کے لئے فال اِن ہونا پڑتا اس کے علاوہ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ آدھی رات کو بھی فال اِن ہونا پڑتا۔ بھارت کے مہاشوں کا خیال تھا کہ ہمیں آرام و آسائش سے رکھنے سے ہم بھاگنے کی کوشش کا خیال بھی دماغ میں نہ لائیں گے۔ شائد وہ کچھ حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے کیونکہ جو فرار کے حق میں نہ تھے ان کو یہ بھی خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ پکڑے جانے کی صورت میں یا ہماری کامیابی کے بعد ان دی گئی مراعات کے چھن جانے کا امکان تھا، ان مراعات سے ہمارا ضمیر اور فرض شناسی کا جذبہ خریدنے سے بھارتی افسر قاصر رہے، ان مراعات سے ہمیں آزادی پیاری تھی۔ اپنے فرض کی ادائیگی کا زیادہ پاس تھا۔

ہزیمت کا ہم سب کو برابر کا رنج تھا۔ کم از کم گفتار میں ہر کسی کے عزائم بلند تھے۔ اپنے وطن کی قدر کا احساس اس حالت میں اچھی طرح ہوا۔ زندگی کی وہ معمولی معمولی اشیاء جو اپنے وطنِ عزیز میں مل سکتی ہیں اور وہاں ہوتے ہوئے جن کا کبھی خیال تک نہیں آتا ان کا شدت سے احساس ہوتا۔ لاہور۔ پشاور۔ پنڈی۔ کراچی اور کوئٹہ جنت سے کم نہ معلوم ہوتے، نظر بندی کی زندگی خوردبین کا سا کام دیتی ہے جس سے انسانی قدروں۔ اصولوں، اپنی کمزوریوں اور صلاحیتوں کو دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ فراغت کی وجہ سے ہر پہلو کا بغور مطالعہ کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ان پہلوؤں کے مطالعہ کی جھلکیاں علیحدہ عنوان کے تحت کتاب کی شکل میں تحریر کی ہیں، جسے خدا نے چاہا تو عنقریب شائع کروں گا۔

## ۱۰

سات روز کے وقفہ کے بعد کھدائی کا کام پھر سے شروع کر دیا گیا۔ دو تین دن کوئی قابل ذکر

واقعہ پیش نہ آیا۔ پھر ۲۳ فروری کو غیر متوقع طور پر چیکنگ پارٹی آوارد ہوئی۔ دن کے کوئی دس بجے ہو گئے، ہم کھدائی کر رہے تھے ایک مٹی کی بھری بوری اور بالٹی چارپائی کے نیچے تھی۔ کچھ مٹی غسلخانے میں بکھری پڑی تھی اور پارٹی ہمارے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وقت کم تھا اور کام زیادہ، غسلخانے میں پڑی مٹی سرنگ میں پھینک دی گئی۔ ٹائلیں لگ گئیں اور مٹی کی بوری اور بالٹی کمرے کی چھت کے اندر پھینک کر ہم کرسیوں پر بمشکل بیٹھے ہی تھے کہ پارٹی پہنچ گئی۔ کیپٹن جاتلے اور اُس کے ساتھیوں نے ہمارے کمرے کا کونہ کونہ چیک کیا۔ غسلخانے میں گیا۔ بھارتی حوالدار ٹائلوں کے عین اوپر کھڑا غسلخانے کا معائنہ کرتا رہا۔ میں اُسے دیکھ دیکھ کر سہما جا رہا تھا کہ یہ ابھی گڑھے میں گرا کہ گرا۔ مگر ہماری قسمت اچھی تھی وقت ٹل گیا۔ ہماری رُکی ہوئی سانسیں پھر سے آنے لگیں، ہماری کوششوں نے تیسری دفعہ زندگی پائی تھی۔ قریب تھا کہ اُن کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا۔ ایسے لمحات جہاں سنسنی خیز تھے، وہاں روح پرور بھی، دو چار روز اور کام جاری رہا۔ ۲۷ فٹ لمبی سرنگ تیار ہو چکی تھی، ۲۶ فروری کو کیپٹن جاتلے آیا اور کرنل سلطان کو تیار ہونے کا حکم صادر کر گیا اور یہ بتایا کہ اُسے دوسرے کیمپ میں منتقل کیا جا رہا ہے، میرے لئے خاص طور پر صدمے کی بات تھی، پچھلے ایک ماہ میں ہم دونوں نے بڑی محنت سے کام کیا تھا۔ ایک دوسرے کو "جبل ہُو" کہہ کر پکارا تھا۔ "براوی بلوچ سگنلز" کا نعرہ ہر مشکل کام سے پہلے اور بعد میں اکثر بلند کیا کرتے اُس کے جانے کے بعد وہ تمام افسر جو سرنگ کھودنے میں ہمارے ہم خیال نہ تھے کافی خوش معلوم ہوتے تھے کہ اس کے جانے کے بعد شائد یہ کام بند ہو جائیگا۔ آدھ گھنٹے میں سلطان جانے کیلئے تیار ہو گیا اس کی بٹالین کے ایک افسر نے اُسے بھارتی دس روپے کا نوٹ دیا تاکہ راستے میں شائد کام آسکے۔ باہر نکلے تو ایک اور افسر نے سپاہی عنصر کے ہاتھ سو روپے کا نوٹ بھیجا جو گلے ملتے ہوئے اُس نے سلطان کی جیب میں ڈال دیا۔ کیپٹن جاتلے باہر چھپ کر سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ سلطان کو جس وقت باہر لے گئے تو اُس کی تلاشی لی گئی اور اُس کے جوتوں میں سے دونوں نوٹ برآمد کر لئے گئے۔ اس کے فوراً بعد ہماری تمام چیزوں کی تفصیل سے تلاشی لی گئی۔ میرے اور جعفری کے پاس کچھ رقم تھی وہ ہم نے یوں چھپائی کہ اس چیکنگ سے بچ گئی، سلطان کو اغلباً آگرہ کے کسی کیمپ میں لے گئے بعد میں اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ آگرے

کے کیمپ نمبر ۸۸ میں ہے، جہاں اُس نے اُسی جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کیا اور بھارتی افروں کیخلاف مزاحمت کا مظاہرہ کرتا رہا۔ جس کے عوض اُسے کئی بار قید تنہائی کاٹنی پڑی۔ ۲۶ فروری کو ہم نے کام جاری رکھا۔ مَیں اُس روز کھودتا رہا اور کرنل ستار مٹی پیچھے کھینچتا رہا۔ جن لوگوں کا خیال تھا کہ سلطان کے چلے جانے سے یہ پراجیکٹ بند ہو جائیگا، اُن کو کافی مایوسی ہوئی۔ ۲۷ فروری کو ایک نیا بم پھٹا۔ جا تلے آیا اور ہمیں بتایا کہ سامان اکٹھا کر کے تیار ہو جائیے ہم دس کرنلوں کو کیمپ کے دوسرے حصے میں منتقل کیا جا رہا ہے اور وہاں سے تمام افسر ادھر آرہے تھے۔ اس حصہ میں دو بارکوں کو ہمارے اور ہمارے اردلیوں کے رہنے کیلئے مخصوص کر دیا گیا۔ چند روز میں کھانے کا بھی وہیں علیحدہ بندوبست کر دیا گیا۔ چنانچہ علیحدہ خانساماں ہمارا کھانا وہیں باورچی خانے میں پکانے لگا۔ ہماری سرنگ بھی وہیں ادھوری رہ گئی۔ مجھے تسلی تھی کہ ہم نہ سہی جونیئر افسر ہی اس سے فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ منیر۔ گت سپ، ندیم وغیرہ ہماری بارک میں منتقل ہو کر آ رہے تھے۔ اس نقل و حرکت سے سرنگ کے مخالف لیفٹننٹ کرنل بے حد خوش معلوم ہوتے تھے کہ اس ساری بکواس سے چھٹکارا ہوا۔ شاید وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ اس نئے حصّے میں کھدائی کا کام زیادہ آسان ہوگا۔ سلطان کے چلے جانے کا مجھے کافی افسوس رہا۔ اس کے علاوہ سرنگ کو خیرباد کہتے وقت دُکھ کا ہونا لازمی تھا کیونکہ اس کے کھودنے میں کافی پسینہ بہایا تھا۔ اب زندگی بھی دس افسروں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، اس لئے نئے کیمپ کا ماحول مختلف تھا۔ کیمپ کا یہ حصہ کسی زمانے میں قبرستان تھا کیونکہ اُس کی تاروں کے باہر ملتی ہوئی قبروں کے نشانات تھے، چند پختہ قبریں بھی تھیں۔ جن کے ساختہ پتھر کبھی کبھی چھکڑ والے اکھیڑ کر لے جاتے دکھائی دیا کرتے۔ شمال کی جانب چار سو گز کے فاصلہ پر گنبد نما عمارت تھی جو اب ویران پڑی تھی۔ غالباً جنازہ گاہ یا مسجد تھی۔ باڑ کے بالکل ساتھ ساتھ کچا راستہ تھا جس پر سارا دن مزدور پیشہ لوگ گذرتے رہتے۔ پہلے یہ حصہ تین بارکوں پر مشتمل تھا، لیکن سب سے مغرب والی بارک کو ہمارے آنے کے بعد جنگلے کے باہر کر دیا گیا تھا۔ صحن میں تین عدد درخت تھے، دو نیم کے اور ایک کیکر کا۔ نیم کے ایک درخت پر طوطوں کے گھونسلے تھے، دونوں بارکوں کے عقب میں ایک طرف باورچی خانہ تھا اور دوسری طرف اردلیوں کے رہنے کے لئے دو کمرے،

دونوں بارکوں کے درمیان سیمنٹ کی باڑ بنی ہوئی تھی۔ ہم مغربی سمت کی بارک کے پانچ کمروں میں دو افسر ہر کمرہ میں رہتے تھے۔ مشرقی سمت کی بارک کے پانچ کمروں میں سے ایک کمرے میں کھانا کھایا کرتے اُس کے ساتھ والے میں مارچ کے وسط میں لیفٹننٹ کرنل محمد خاں عامل (ریٹائرڈ) جو کومیلا کینٹ سکول کے پرنسپل تھے وہ آ گئے۔ اپریل کے شروع میں اردلیوں کو باقی تین کمروں میں شفٹ کر دیا گیا۔

کرنل عامل ایجوکیشن کور کے ریٹائرڈ عمر رسیدہ افسر تھے۔ عمر ۵۹ سال۔ رونقی طبیعت، البتہ خواہ مخواہ اس حال میں گھر جانے کی وجہ سے زیادہ فکرمند دکھائی دیتے تھے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو فوجی کارروائی شروع ہونے کے بعد سکول تو بند ہو گئے اس لئے وہ اپریل میں واپس مغربی پاکستان چلے گئے۔ ۲۱ نومبر ۱۹۷۱ء کو عید الفطر کے موقع پر ان کی بیگم نے بچوں کے کپڑوں پر ضرورت سے زیادہ خرچ کر دیا۔ چنانچہ اس وجہ سے قبلہ عامل صاحب ناراض ہو کر کومیلا آن پہنچے کہ جا کر پھر سے سکول کھولنے کا بندوبست کریں مشرقی پر تو ۲۱ نومبر کو ہی بھارتی جارحیت کا آغاز ہو چکا تھا۔ تین دسمبر کو مغربی محاذ پر جنگ چھڑ جانے کے بعد ہوائی جہازوں کے آنے جانے کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور عامل صاحب جنگی قیدیوں میں شامل ہو کر ہمارے ساتھ گوالیار آن پہنچے۔ گھر سے یوں ناراض ہو کر آنے کے متعلق اکثر افسوس کرتے، لیکن کافی خوش فہم اور رجائیت پسند واقع ہوئے تھے، ہر روز واپسی کے متعلق پیش گوئیاں کرتے رہتے۔

ایک دن ریڈیو پر سنا کہ ۲۶ اپریل کو کچھ زخمی جنگی قیدی پاکستان بھیجے جا رہے ہیں۔ ۲۷ اپریل کو عامل صاحب کو بتایا گیا کہ وہ آئندہ روز کہیں جانے کے لئے تیار رہیں، دل کی اُن کو تکلیف رہ چکی تھی اسی بناء پر انہوں نے چند مرتبہ سِک رپورٹ بھی کی تھی۔ اب جانے کی خبر سے اُن کو یقین تھا کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ ان کو بھی واپس پاکستان بھیجا جا رہا ہے۔ میں نے اُن کو بڑا سمجھایا کہ ایسا ممکن نہیں لیکن وہ ماننے والے کہاں تھے، انہوں نے تمام افسروں سے گھروں کے نام خط لئے اور اُن کے عزیز و اقارب کے پتے پوچھے، فون نمبر نوٹ کئے۔ سردار گیانی سنگھ سب انسپکٹر سی آر پی (سنٹرل ریزرو پولیس) نے جو اُن لے ساتھ گیا تھا بتایا کہ گوالیار کے سٹیشن پر جب اُن پر یہ راز فاش ہوا کہ وہ بجائے پاکستان کے الہ آباد جائے جا رہے ہیں تو وہ ہکے بکے اور ششدر رہ گئے۔ الہ آباد میں سویلین کا کیمپ تھا اس لئے اُن کو

وہاں منتقل کر دیا گیا۔ جہاں سے وہ بالآخر ۱۹۷۳ء کو واپس پاکستان پہنچے۔ اُن کے چلے جانے سے ہمیں ان کی غیر موجودگی کا کافی احساس رہا۔ کیونکہ وہ دلچسپ کہانیاں اور قصے سنایا کرتے اور اُن سے خوب گپ شپ رہتی۔

اس کیمپ میں آنے کے بعد جمعہ کی نماز باجماعت پڑھنی شروع کی۔ جس کی امامت میں کرتا رہا۔ خطبہ تو آتا نہیں تھا۔ اس لئے نماز کے بعد مختصر الفاظ میں اسلام کے بتائے ہوئے زندگی کے اہم اصولوں پر روشنی ڈالا کرتا، ایسے اصول جن کو ہم جانتے ہوئے بھی نہیں اپناتے۔ نیک اعمال کی قرآن میں بڑی تاکید کی گئی ہے، محض نماز پڑھنے سے مسلمانی کا حق ادا نہیں ہوتا بلکہ کردار کو اسلام کے اصولوں کی روشنی میں ڈھال کر روزمرہ کی زندگی میں دیانتداری، خلوص، جرأت اور حب الوطنی کے تقاضوں کو پورا کرنے سے مسلمانی کا حق ادا ہوتا ہے۔

جنرل بھگت جب ہمارے کیمپ میں آیا تو اور باتوں کے علاوہ اُس نے ہمیں بتایا کہ ہمیں یہاں ہندوستانی فلمیں دکھانے کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔ کیا وہ اپنی فراخدلی سے ہمیں اپنا مرہونِ منت بنانا چاہتا تھا یا ہمارا مذاق اڑا رہا تھا۔ جو کچھ بھی اس کا خیال تھا مگر اُس کا یوں کہنا دل میں تیر کی طرح چُبھا۔ ہم یہاں پر قیدی بنا کر لائے گئے تھے یا اپنے سُسرال آئے ہوئے تھے، ابھی اُس کی بات کی چُبھن دُور نہ ہوئی تھی کہ ہمارے ایک ساتھی نے جرنیل سے کہا کہ ہمیں مغل اعظم فلم دکھائی جائے۔ غالباً اُس نے یہ غیر ارادی طور کہا لیکن ہماری رہی سہی حمیت کا خون ہوگیا۔ بات کہنے کو کتنی معمولی سی کیوں نہ ہو لیکن اگر ماحول کی مطابقت میں نہ ہو تو کافی تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔ کڑے اوقات میں اپنے ہوش و حواس اور اپنی خواہشات کو قابو میں رکھنا زندگی کا اہم پہلو ہے۔

جب جونیئر افسر کیمپ کے اس حصے میں تھے تو انہوں نے دو تین غسلخانوں سے سرنگ کھودنے کا کام شروع کیا۔ لیکن ہر ایک میں دو تین فٹ کھودنے کے بعد پانی نکل آتا اور ان کو بامرِ مجبوری گڑھے کو بند کرنا پڑتا۔ ہمارے یہاں آنے کے بعد ایک دفعہ پھر نئے سرے سے ضروری ہوگیا کہ سب لیفٹنٹ کرنلوں کو فرار کی کوشش کا ہم خیال بنایا جائے۔ کرنل عامل تو عمر رسیدہ تھے اور آئے بھی چند روز بعد میں۔

ان کے علاوہ ایک خاکروب یعقوب مسیح، دو خانسامے، ایک حوالدار اور گیارہ اردلی تھے باورچی خانہ

تار کی اندرونی باڑ سے صرف دس فٹ دُور تھا اور باہر والی باڑ سے چالیس فٹ۔ باہر نکلنے کے لئے صرف چالیس فٹ لمبی سرنگ سے کام بن سکتا تھا۔ یہاں مٹی کو غائب کرنے کا کام پہلی جگہ کے مقابلے میں زیادہ آسان تھا۔ اگر ہم سب مل کر زور شور سے کام کرتے تو میرے اندازے کے مطابق پندرہ روز کے اندر باہر نکلا جا سکتا تھا۔ مَیں شریف، جعفری اور ستار تو ہم خیال تھے ہی اگر باقی چھ افسر بھی ساتھ دیں تو پھر اردلی وغیرہ خود بخود ساتھ مل جاتے لیکن بڑی کوشش کے باوجود وہ تیار نہ ہوئے بلکہ ہمیں ایسے منصوبے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے اردلیوں کو بھی اس منصوبے کی بیسودگی کے متعلق رائے دیکر اُن کو اس سے کنارہ کشی کی ہی رائے دی۔ یہ بے حد قیمتی وقت تھا جو ضائع ہُوا۔

ان کوششوں اور بحث و تکرار میں چار ہفتے گزُر گئے۔ سوائے سگنل مین طالب کے باقی اردلی بھی ایسا کام کرنے کے حق میں نہ تھے، جب ان کو ہم سے زیادہ تعداد میں افسروں کے نہ کرنے کا بہانہ نظر آتا تھا۔ تو وہ خطرے اور مشکل راہ پر گامزن ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ جب کئی افسر ہی تیار نہ تھے تو اُن کو موردِ الزام ٹھہرانا صحیح نہ تھا۔ طالب حسین، جعفری کا اردلی تھا وہ ہر وقت کام کرنے کے لئے تیار تھا، اس کے علاوہ یعقوب مسیح جو کہ کافی لاغر قسم کا آدمی تھا اپنے ہونٹوں سے نیچے لٹکی ہوئی مونچھوں کو اونچا کرتے ہوئے مجھے کہتا "صاحب جی" کام شروع کریں گولی تو ایک دن لگنی ہے، اگر قسمت میں لکھی ہے تو پھر کوئی نہیں روک سکتا، ڈر کس بات کا ہے۔ صاحب جی شروع بھی کریں، مجھے اُس کی اس بلند حوصلگی پر حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ ایک روز ایک سپاہی میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ صاحب کیا یہ سرنگ کھودنا شریعت کے خلاف ہے، مَیں نے پوچھا کیوں، بولا کسی افسر نے بتایا ہے۔ کہ ہتھیار ڈال دینے کے بعد ہم بھاگنے کی کوشش کرکے بد دیانتی کا ثبوت دیں گے اس لئے یہ اسلامی قانون کے خلاف ہے' بات مضحکہ خیز تھی۔ منفی خیال رکھنے والے کس حد تک جا سکتے ہیں۔ خیر یہ فتویٰ صادر کرنیکا رواج ہمارے ملک میں چلتا ہے۔ مجھے یاد ہے تحریک پاکستان کے وقت آزادی سے پہلے قائدِ اعظم اور تحریک پاکستان کے متعلق کئی فتوے صادر کئے گئے تھے۔ یہ ہمارے اندازِ فکر کا افسوسناک پہلو ہے کہ جب کوئی اور خاطر خواہ دلیل عوام کو متاثر کرنے کے لئے پاس نہ ہو تو مذہب کی آڑ میں فتووں سے کام لیا جاتا ہے۔

دوسری طرف جونیئر افسر جب ہمارے کیمپ میں پہنچے تو اُن میں سے تیرہ افسر ہمارے والی سرنگ پر کام کرنے کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ اور چار پانچ روز کے وقفہ کے بعد انہوں نے کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ اس کیمپ میں ۵۳ افسروں میں سے صرف ۱۳ افسر فرار کیلئے کوشاں تھے۔ باقی کا انداز فکر منفی یا یا غیر جانبدار تھا۔ پھر بھی یہ تیرہ افسر مل کر ہر روز منزل کی طرف بڑھتے رہے، ان کا خون جوان تھا اور حوصلے بلند، ہم جب کبھی اُس کیمپ میں لے جائے جاتے تو ان سے ملاقات ہوتی جہاں یہ سن کر خوشی ہوتی کہ وہ کام جاری رکھ رہے ہیں، وہاں افسوس بھی ہوتا کہ سب کے سب ساتھی ہمخیال کیوں نہیں، ایک ایسی بات کے بارے میں جس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہ ہو۔

آخر تھک ہار کر ۲۸ مارچ کو ہم چاروں نے یہ فیصلہ کیا کہ سرنگ کا پراجیکٹ شروع کر دیا جائے اُس روز باورچی خانے والی سل اٹھائی گئی اور ہم چاروں نے کام شروع کر دیا، طالب اور یعقوب مسیح مٹی باہر پھینکا کرتے۔ ارادہ تھا کہ ۹ فٹ گہرا کھودنے کے بعد شمال کی جانب سرنگ نکالی جائے۔ یہ بھی خیال تھا کہ جب سرنگ کا کام کامیابی کے ساتھ آگے بڑھے گا تو شاید اور ساتھ مل جائیں، دو ہی دنوں میں آٹھ فٹ گہرا گڑھا تیار ہو گیا۔ آئندہ روز جب سل اٹھائی تو ہمیں بیشمار پانی تھا، مختلف سمتوں سے شائد بہہ کر اندر آگیا تھا۔ اس بات کا جب کیمپ کے دوسرے افسروں کو علم ہوا تو بڑے خوش ہوئے، اپنے ساتھیوں کا بھی یہ خیال تھا کہ شاید منصوبہ کامیاب نہ ہو سکے لیکن اتنی جلدی شکست کھانا جوانمردی نہ تھی دو تین روز صبح شام پانی نکالتے رہے مگر ہر روز دو تین فٹ پانی بھر جاتا۔ آخر یہ طے پایا کہ پانی کی سطح سے ذرا اوپر متوازی سرنگ نکالی جائے، اور پانی نکالنے کا کام ساتھ ساتھ جاری رہے، چند روز بعد جب چھ سات فٹ سرنگ آگے بڑھی تو پانی خشک ہو گیا۔

ایک روز بعد جب ہم سب اکٹھے ہوئے تو میں نے دوسرے افسروں سے درخواست کی کہ اگر وہ اس مہم اور پراجیکٹ میں حصہ لینے کیلئے تیار نہیں تو کم از کم ہمارے لئے دعا گو ہوں، ہمیں اُن کی دعاؤں کی ضرورت تھی اور یہ کہ وہ اپنے اردلیوں کو صرف یہ کہہ دیں کہ وہ اپنی اپنی مرضی استعمال کریں۔ اُنکی طرف سے اُن پہ کوئی بندش نہیں ہے۔ ایک صاحب کچھ یوں گویا ہوئے۔ یہاں پہ کوئی ہیرو نہیں۔ آپ لوگ ہیرو بننا چاہتے

ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اُن کا خیال تھا شاید ہم ہیرو بننے کے لئے یہ کام کر رہے ہیں۔ فرض کی ادائیگی پر ایسے فقرات ہرگز نہ پھبتے تھے، بڑے اصرار کے بعد انہوں نے رضامندی ظاہر کی، وہ اپنے اردلیوں کو منع نہیں کریں گے۔ یہ کوئی گیارہ اپریل کی بات ہوگی۔ اس کے بعد جعفری نے اردلیوں کو اکٹھا کیا، اُن کو شرم دلائی کہ کرنل تو کام کر رہے تھے اور وُہ ان کا مُنہ تک رہے تھے۔ آخر سوائے چند کے باقی اردلی کام کرنے پر راضی ہو گئے لیکن پھر اکثر یوں ہوتا کہ اگر کوئی اردلی سرنگ میں کام کر رہا ہوتا تو اُس کا افسر اُسے پہلے اپنے کپڑے دھونے، جُوتے صاف کرنے، کپڑے استری کرنے کے لئے کہتا۔ میرا کام پہلے بعد میں سرنگ یہ زیادہ تعاون کا رویہ نہ تھا۔

ہم چاروں باری باری صبح یا شام کی شفٹ میں کام کرتے اور ہر شفٹ میں دو اردلی ہمارے ساتھ ہوتے صبح نو بجے سے بارہ بجے تک اور ایک بجے سے چار بجے تک کام کیا جاتا۔ روزانہ اوسطاً ڈیڑھ فٹ کے قریب سرنگ کھد جاتی۔ یہاں کرنل شریف کی بلند ہمتی قابلِ ذکر ہے۔ باوجود کمزور اور لاغر ہونے کے میں نے ان کو اپنے کام میں بڑا مستعد پایا۔ اپنی ڈیوٹی پہ خود جاتے اور سرنگ کے اندر گُھس کر خود کھدائی کرتے۔ کرنل ستار نے پہلے چند روز کھدائی کی مگر جب سرنگ آگے بڑھی تو وہ مٹی باہر نکالنے کی ڈیوٹی کرتے رہے جعفری کو CLAUSTROPHOBIA تنگ جگہ میں دم گھٹنے کا احساس تھا اس لئے وہ سرنگ کے اندر نہ گھسنے پائے۔ لیکن اردلیوں کو ڈیوٹی پر بھیجنے، مٹی غائب کرنے میں جعفری کی کوششیں قابلِ تعریف ہیں۔ ہر روز اردلیوں کو لیکچر دیکر ڈیوٹی پر بھیجنا پڑتا۔

باورچی خانے کے اندر بجلی نہیں تھی۔ کام کرنے کے لئے سرنگ کے اندر روشنی کی ضرورت تھی۔ ہم نے ایک شیشہ سرنگ کے دہانے پر باورچی خانے کی دیوار پر لگایا اور دوسرا اندر یوں رکھا کہ اُس کے فوکس سے روشنی REFLECT ہو کر سرنگ کے اندر پڑتی۔ پہلے دس بارہ روز ہم نے یوں ہی کام چلایا لیکن یہ کوئی خاطر خواہ طریق نہ تھا۔ مشرق والی بارک میں بجلی تھی۔ باورچی خانے کا فاصلہ وہاں سے پچاس فٹ کے قریب ہوگا۔ اس بارک کے کمرے سے بجلی کی نئی تار جو گیزر کیلئے لگی ہوئی تھی اور جس کا کنکشن ابھی نہیں کیا گیا تھا صفائی کے ساتھ اتاری۔ بارک اور باورچی خانے کے درمیان نالی کھودی گئی۔ اور یہ

تار زمین کے اندر دبا کر باورچی خانہ تک بچھا دی گئی۔ پھر باورچی خانہ کے اندر سلوں کے درمیان کی مٹی نکال کر اسے دبا دیا گیا۔ اس طرح زمین دوز بجلی کا کنکشن سرنگ کے اندر پہنچا دیا گیا۔ ہولڈر اور بلب ساتھ والی بارک کے غسلخانے سے پہلے ہی اتار کر رکھا ہوا تھا وہ کام آ گیا۔ بارک میں تاریں سوچ کے اندر لگا دی جاتیں اور کام کرنے کے بعد تار کے سروں کو واپس غسلخانے کے باہر زمین میں دبا دیا جاتا۔ یہ سب کام سنتریوں کی آنکھوں تلے اس صفائی سے سرانجام دیا گیا کہ انہیں خبر تک نہ ہوئی، کام بڑی خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔ مٹی گندگی کے لئے کھودے گئے گڑھوں، سبزی اور پھول لگانے کے لئے کھودی گئی کیاریوں میں کھپا دی جاتی۔ بجلی بند ہونے کی صورت میں شیشوں سے کام لیا جاتا۔ نائیک منظور آرٹلری لائنس نائیک طالب حسین سگنل مین آزاد، سپاہی غلام رسول اور یعقوب مسیح نے بڑی محنت سے کام کیا۔

## ۱۱

اس علیحدہ کیمپ میں آنے کے بعد یہ ضروری تھا کہ کسی نہ کسی طرح ہمارا رابطہ جونیئر افسروں کے کیمپ کے ساتھ قائم رہے کیونکہ سرنگوں سے باہر نکلنے کی تاریخ کے لئے آپس کا صلاح مشورہ ضروری تھا اس کے علاوہ ایک دوسرے کو کچھ اطلاع دینے کے لئے کوئی سلسلہ ہونا چاہیئے تھا۔ شروع شروع میں ہمارے اس کیمپ میں کوئی باربر نہ تھا۔ اس لئے ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ جونیئر افسروں کے کیمپ سے حجام خوشی محمد آیا کرتا اور وہ ہمارے پیغام لاتا اور لے جاتا۔ ایک ہفتہ وہ نہ آیا تو میں نے سِک رپورٹ کی اور ایم آئی روم میں آیا، جہاں ہمارے اپنے ڈاکٹر جونیئر افسروں کے کیمپ سے ڈیوٹی پر لائے جاتے تھے، اُن سے حالات معلوم کئے لیکن یہ کوئی معتبر اور مستقل ذرائع نہ تھے۔ جب ہم اس نئے کیمپ میں پہنچے تو چند روز کے بعد ہی ایک کُتّے کا چھوٹا سا بچّہ تاروں کے باہر گزرتا دیکھا۔ میں نے سیٹی بجا کر اُس کو بلایا۔ وہ اندر آیا تو میں نے اُسے پیار کیا۔ دودھ پلایا اور کچھ روٹی کھلائی۔ چند روز میں وہ بہل گیا اور وہیں میرے کمرے کے باہر رہنے لگا۔ اُس کو پالنے میں میرا مقصد پیغام رسانی کے لئے استعمال کرنے کا تھا۔ میں نے اُس کا نام جیکی رکھا اُسے تربیت دی اور وہ کچھ اشاروں پر عمل کرنے لگا۔ ایک دن جب کسی لیکچر کیلئے

ہمیں دوسرے کیمپ لے گئے تو میں جیکی کو بھی ساتھ لے گیا، وہاں جونیئر افسروں میں سے ایک نے اُسے دودھ پلایا بسکٹ کھلائے اس لئے کہ وُہ اُن سے ذرا بہل جائے۔ اور کھانے کی خاطر ہمارے کیمپ میں آنا جانا شروع کر دے اس طرح ایک دفعہ پھر میں اُسے وہاں لے گیا۔ اسے کھانے کو خوب ملا اس کے بعد وہ دونوں کیمپوں میں آنے جانے لگا۔ اُس کیمپ میں مَیں افسروں کو سمجھا آیا تھا کہ جب بھی یہ کُتا ان کے کیمپ کے اندر آئے تو اُس کے پٹے کے اندر پیغام کی پرچی ڈھونڈا کریں اس کے لئے میں نے کپڑے کا خوبصورت پٹہ بنایا جس کے اندر کی طرف کاغذ تہہ کر کے رکھنے کی جگہ بھی بنائی۔

دونوں کیمپوں کے درمیان مواصلات کا سلسلہ میری نظر میں بڑا اہم تھا۔ صرف ایک ایجنسی یعنی کتے پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ میں ایک کبوتر کا بچہ پکڑنے کی فکر میں تھا۔ مگر ہمارے صحن میں لگے ہوئے درختوں پر کبوتروں کا کوئی گھونسلا نہ تھا۔ البتہ طوطوں کے کافی گھونسلے تھے ایک کے گھونسلے میں سے میں نے طوطے کا بچہ نکالا اُسے کمرے کے اندر رکھتا۔ کچھ بہل سا گیا۔ لیکن یہ میں نہ جانتا تھا کہ طوطے ایک جگہ سے اڑ کر دوسری جگہ کبوتروں کی طرح پیغام رسانی کے کام نہیں لائے جاسکتے۔

افسروں کے کیمپ پر کیپٹن جاتلے جو کیج افسر تھا مقرر ہوا تھا۔ اُس کے ماتحت نائب صوبیدار روشن سنگھ اور حوالدار میجر تھاپا مقرر ہوئے تھے جو روزانہ صبح و شام ہماری گنتی کرنے کے علاوہ سیکورٹی اور انتظامیہ کے انچارج تھے۔ دن میں تین چار چکر لگایا ہی کرتے، اس لئے جس وقت سرنگ میں کھدائی کی اپنی ڈیوٹی نہ ہوتی تو میں برآمدے میں بیٹھ کر ساری دوپہر گرمی میں سنتری ڈیوٹی کیا کرتا۔ تاکہ ان دونوں میں سے کسی کو آتا دیکھ کر کام کرنے والوں کو مطلع کیا جاسکے۔ حوالدار میجر تھاپا سرینگر کے قریب ٹمالو کا رہنے والا تھا۔ تھا تو وہ نیپالی گورکھا مگر اب کشمیر میں سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ وہ ایک اچھا سپاہی تھا جسے اس بات کا احساس تھا کہ ہم افسر ہیں اس کا رویہ مہذبانہ اور گفتار مؤدبانہ ہوا کرتی۔ لیکن وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرتا۔

کافی دنوں سے یعقوب مسیح تھاپا کو جھاڑو لا کر دینے کو کہہ رہا تھا لیکن وہ ٹال مٹول کر رہا تھا

جیکی باہر جاتی تو کہیں سے اُپلے اٹھا لاتی۔ ایک دن تھاپا آیا تو یعقوب اُس سے یوں گویا ہوا۔ تھاپا اس جیکی نے تھاپیوں سے صحن بھر دیا ہے، اب تو جھاڑو لا دو۔ یعقوب مسیح کافی لطیفہ گو قسم کا شخص تھا۔ ہر روز کچھ اس قسم کے لطیفے چھوڑتا ہی رہتا۔

۲۰ ر اپریل کو ہمیں جونیئر افسروں والے کیمپ میں سینما دکھانے کیلئے لے گئے۔ فلم کا نام دھرم پتر تھا کہانی کا مفہوم یہ تھا کہ ہم ہندو مسلمان سکھ صرف اس لئے ہیں کہ ہم ان مذاہب کے رکھنے والے والدین کے گھر پیدا ہوئے ورنہ مذہب کی بناء پر آپس میں دشمنی بُری بات ہے اور مذہب کی بناء پر پاکستان کی مانگ سے جو کچھ ہؤا وہ انسانیت سوز حقائق ہیں۔ اس کے بعد بھی دو تین فلمیں دکھائی گئیں جن میں ہندو مسلم دوستی کا پرچار کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُن کا مقصد تفریحی ماحول میں اس بات کا پروپیگنڈہ کرنا تھا کہ اس برصغیر کے لوگ ایک ہی تہذیب و تمدن کے حامل ہیں اور یہ کہ بھارت میں مسلمانوں کے لئے کوئی دشمنی نہیں۔

جب ہم ۲۰ ر اپریل کو سینما دیکھنے کے لئے لے جائے گئے تو وہاں پارک میں بجلی والے بھی آئے ہوئے تھے۔ جو بارکوں کی پرانی تاریں اتار کر نئی لگا رہے تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہؤا کہ وہ تین روز تک ہماری طرف آن کر ہماری بیرکوں کی وائرنگ بھی بدلیں گے۔ اس سے فکر لاحق ہؤا، کیونکہ ایم ای ایس والوں کا گیزر کی تار کے متعلق سوال کرنے کا امکان تھا۔ وہاں نئی تار لگی ہوئی تھی جو ہم نے اتار کر زمین دوز کر دی تھی۔ چنانچہ جب دوسرے سینما دیکھنے میں مشغول تھے۔ میں نے چند جونیئر افسروں کی مدد سے ان بیرکوں سے اتاری ہوئی پرانی تار کے کافی ٹکڑے پتلون کے اندر چھپا لئے اور واپس جاتے ہوئے ساتھ لے گیا۔ دوسرے روز گیزر والی تار نکال کر اُسے اچھی طرح دھویا گیا۔ پھر اُسے واپس اپنی پرانی جگہ پر لگا دیا گیا۔ اور اس کی جگہ پرانی تار کے ٹکڑوں کو جوڑ کر زمین میں دبا دیا گیا۔ دونوں مرتبہ تار کو زمین میں دبانا ایک مہم تھی۔ سنتری سامنے کھڑے ہوتے اور ان کی نظروں کے سامنے یہ سارا کام اس احتیاط سے کیا گیا کہ اُن کو ذرا شک نہ ہؤا۔

اپریل کی ۲۵ ر تاریخ کو ہمیں دوسرے کیمپ میں لے جایا گیا اور ہمیں یہ بتایا گیا کہ کوئی منسٹر ہمیں

لیکچر دے گا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اُن حضرت نے اپنی تقریر کرنے سے پہلے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ گلزار تشی ہیں اور نظام الدین اولیاء کے مزار کے معتقد ہیں۔ وہ وزیر وائے مفہوم کے منسٹر نہ تھے بلکہ مذہبی معانی کے منسٹر تھے۔ اُس نے بھارت میں جمہوریت۔ مذہبی رواداری۔ آزادی پاکستان کے لئے دوستی کے جذبات کے متعلق ایک دھوأں دار تقریر کی۔ اس کی تقریر میں روانی تھی بڑی شستہ اُردو بولتا تھا۔ شاعر بھی تھا اس نے چند نعتیں سنائیں۔ مدینہ کی جگہوں کا ذکر کرکے اور حضرتِ محمدؐ کا نام لے کر کئی بار مسلمانی انداز سے ہاتھوں کی اُنگلیوں کو چُوم کر آنکھوں کو لگایا۔

حاضرین کو متاثر پاکر دو تین ہلکی پھلکی غزلیں سنائیں۔ جن میں کالی زلفوں اور سفید باہوں کا ذکر تھا۔ اُن کو یہاں لانے کا مدعا ہمیں بھارتی پروپیگنڈہ سے متاثر کرنا تھا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ اُس نے کالی زلفوں اور سفید باہوں کا ذکر کر کے ہماری حالت کا مذاق اڑایا تھا۔ اس کا اس طرح تفریحی کلام سنانا مجھے اچھا نہ لگا۔ جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو میں نے مختصر الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اُسے کچھ یوں کہا "میں نہیں جانتا کہ آپ کے یہاں آنے اور ہم سے خطاب کرنے کا مقصد کیا ہے۔ بہر صورت آپ کو یہ بتانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ہم یہاں نہ میلے پر آئے ہیں اور نہ کسی پارٹی پر، ہمارے ملک کا آدھا حصہ آپ کے ملک کی جمہوریت، آزادی اور پاکستان دوستی کے جذبات کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ ہمارے لئے یہ سانحہ عظیم ہے۔ آپ کی حکومت انسانوں کو سیاسی سودے بازی کیلئے استعمال کر رہی ہے۔ آپ کی حکومت کی جھوٹی ہمدردی کی دلیل الہ آباد میں قید ہزارہا بوڑھے، عورتیں اور بچے ہیں جن کو آپ کی حکومت نے نظر بند کر رکھا ہے۔ اگر آپ واقعی انسانی قدروں کا پرچار کرتے ہیں تو اپنے بھیجنے والوں سے جاکر یہ سوال کیجئے کہ ان عورتوں اور معصوم بچوں کو کس جرم کی پاداش میں قید کیا ہُوا ہے اُن کو یہ بتائیے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور والے انداز سے ملکوں میں دوستی نہیں ہُوا کرتی ہم آپ کے ملک اور آپ کی حکومت کے باطن کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہماری دوستی اُس صورت میں ممکن ہے جب آپ کی حکومت انصاف کے اصولوں پر ہمارے ملک کے ساتھ رشتے استوار کرنے کا ثبوت دے۔ ہم یہاں جنگی قیدی ہیں۔ ہمارے لئے ماضی کے حالات غموں سے بھرپور ہیں، ہم جارحیت کا شکار

ہو چکے ہیں۔ بے حد رنجیدہ ہیں۔ اس لئے آپ کو زیب نہیں دیتا کہ ہمارے زخموں پر نمک پاشی کریں۔ اور ہمیں کالی زلفوں اور سفید باہنوں کے سنگیت سنائیں۔ آپ برائے مہربانی واپس جاکر اپنے ملک کے لوگوں اور اپنی حکومت کو ہمارا پیغام پہنچادیں۔ انہوں نے جواب میں کہا میرا منشاء آپ کا دل دکھانا نہیں دل بہلانا تھا۔ بہر صورت مجھے افسوس ہے کہ میں نے ہلکی پھلکی غزلیں پڑھیں جو شائد ماحول کے لئے معقول نہ تھیں۔ میں آپ کا پیغام پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ جب تقریر ختم ہوئی تو کئی ساتھی گلزار زتشی صاحب کو ملے۔ نظام الدین اولیاء کو اپنا سلام بھیجا۔ اُن سے بھارت میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق تبادلہ خیال کیا۔ ہاتھ ملائے گلے ملے وغیرہ وغیرہ۔ بعد میں معلوم ہؤا کہ وہ جوانوں کے کیمپ میں تقریر کے بعد جمعہ کی نماز میں بھی شریک ہوئے۔ جولائی کے مہینے میں ایک تصویر اخبار میں چھپی نظر آئی، نیچے پڑھنے سے معلوم ہؤا کہ آنند موہن گلزار زتشی شریمتی اندرا گاندھی سے کوئی انعام حاصل کر رہے ہیں۔ پھر راز کھلا کہ محترم ہندو تھے اور وہاں اس انداز سے آئے جیسے مسلمان ہوں، مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے روکھے انداز میں انہیں چند باتیں سنائیں۔ جنہوں نے ان کے ذریعے نظام الدین اولیاء کو سلام بھجوائے وہ خشمگیں تھے۔

لیفٹنٹ کرنل اور میجر کو ایک سو گیارہ روپے لیفٹنٹ اور کیپٹن کو نوے روپے، جوانوں کو چودہ روپے اور سویلین کو پانچ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی سگریٹ پینے والوں کو شاید اس رقم میں گزارہ کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہو۔ لیکن دوسرے افسروں کے لئے میری رائے میں یہ رقم ضرورت سے زیادہ تھی۔ جنیوا کنونشن کے تحت کیمپ میں کنٹین کا بندوبست کرنا حکومت پر لازمی تھا تاکہ قیدی ٹائلیٹ اور کھانے پینے کی چیزیں خرید سکیں، یہ تو ہے قانونی نقطہ۔ اگرچہ میں کسی اصول پر مبنی بات نہیں کہہ رہا اپنے اندازِ فکر کو ہوا دے رہا ہوں۔ اکثر قیدی اس بات کے ہمخیال تھے کہ یہ رقم ہمیں خرچ کرنے کے لئے دی جاتی ہے۔ اس لئے وہ جو بھی چیز خریدنا چاہیں مناسب ہے۔ اس بارے میں میرے اپنے جذبات مختلف تھے۔ قید کا نام ہی سختیوں اور صعوبتوں سے وابستہ ہے۔ ہم جنگی قیدی تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ ہم قید کی صعوبتوں سے دوچار ہونا سیکھیں اور جنگی قیدی بن کر رہنے کی

کوشش کریں۔ قید میں جو سرکاری راشن ملتا تھا اُس پر گذارہ کریں۔ چند نہایت ضروری اشیاء مثلاً صابن اور بلیڈ خریدیں اور ان سے گزارہ کریں۔ دشمن کی قید میں بارن ویٹا ہارلکس، اوول ٹین، مربے چٹنیاں، اچار، ٹافیاں، چاکلیٹ، انڈے اور آم خریدتے اور کھاتے نامناسب اور ناموزوں دکھائی دیتے تھے۔ یہ مشکلات کا چیلنج تھا اور ہمیں یہ چیلنج قبول کر کے ان چیزوں کے بغیر گذارہ کرنے کا ضبط پیدا کرنا چاہیئے۔ یوڈی کلون اور آفٹر شیو لوشن لگانے کے لئے باقی زندگی پڑی تھی۔ تاروں کے پنجرے کے اندر لوما ہیئر آئل لگا کر بال کالے کرنے کا ہرگز مقام نہ تھا، بھارتی افسر جب ہماری خرید کی لسٹ دیکھیں تو یہ نہ سمجھیں کہ ہم چاکلیٹ اور اس طرح کے چسکے کی چیزوں کے بغیر گذارہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے کردار، گفتار اور رہن سہن سے سپہ گری، بلند ہمتی اور عزم کی پختگی کی بُو آنی چاہیئے۔ آخر ہمارے سپاہی بھی تو چودہ روپوں میں گزارہ کر رہے تھے۔ ہم سب برابر کے قیدی تھے اس لئے ہماری ضروریات کسی صورت ان سے زیادہ نہ ہونی چاہئیں۔ اب جبکہ ہم ان حالات میں تھے تو دماغی اور جسمانی طور پر میں سپاہیوں کے دکھ سکھ میں برابر کا شریک ہونے کا خواہشمند تھا۔ اس معاملے میں دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانا مشکل تھا۔ یہ ایک ذاتی معاملہ تھا۔ اگرچہ ہمارے اجتماعی کردار ہی سے وہ نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا لیکن اس کیلئے رضاکارانہ جذبہ کی ضرورت تھی۔ ایسے خیالات دوسروں پر ٹھونسے نہیں جا سکتے بلکہ ان کی پیدائش اور پرورش خود اپنے دل کی گہرائیوں میں ہوتی ہے، آخر یہاں پر اتنی رقم کی ادائیگی ہماری حکومت نے بیرونی زرمبادلہ میں کرنی تھی اس لئے بھی اپنے اخراجات کو محدود رکھنا میرے لئے ضروری تھا اس لئے میں نے اوسطاً پچیس روپے ماہوار لینے کی ٹھانی۔ اس میں سے آدھی رقم ہر ماہ ضرورت مند اردلیوں کو دیتا رہا، کچھ رقم سویلین کیمپ میں بھیجی۔ اپنے اوپر میں نے ہر ماہ دس روپے سے کم خرچ کی۔ جب سویلین عورتوں اور بچوں کا خیال آتا کہ وہ محض پانچ روپے ماہوار میں گزارہ کر رہے ہیں تو دل میں کسی چیز کے کھانے یا خریدنے کی خواہش ہی نہ اُبھرتی۔ چنانچہ پوری نظربندی کے دوران میں نے صرف سرکاری راشن پر گذارہ کیا۔ اُسی راشن پر جس پر باقی تمام قیدی گذارہ کر رہے تھے۔ کنٹین سے کبھی کوئی کھانے کی چیز نہ خریدی۔

اس انداز سے رہنے میں ان سویلین کی تکالیف کے خیال کا بوجھ ہلکا پڑ جاتا۔ جو کیمپوں میں ہمارے راشن سے آدھے راشن سکیل اور پانچ روپے ماہوار پر رہ رہے تھے اور پھر ان بہاریوں کا جن کے لئے شاید تین دفعہ پاکستان بنا تھا۔ جو ۱۹۴۷ء میں بہار سے اُجڑ کر مشرقی پاکستان پہنچے۔ پھر مارچ اپریل ۱۹۷۱ء میں تشدد کا شکار ہوئے اور پھر ۱۷ دسمبر کو اپنے ملک میں ہوتے ہوئے بھی بے ملک ہو گئے جو اپنے مستقبل سے ناواقف کیمپوں میں دہشت زدہ زندگی بسر کر رہے تھے اور پھر اُن کے خیال کا بوجھ جو محبِّ وطن پاکستانی تھے جنہوں نے یہی سمجھ کر حکومت کا ساتھ دیا کہ ملک زندہ رہے اور اب بنگلہ دیش کی جیلوں میں مصیبتیں جھیل رہے تھے جن میں فضل قادر چودھری، ڈاکٹر مالک، فرید احمد اور ہزارہا الشمس اور البدر کے مجاہد شامل تھے۔ میں ان سب لوگوں کے غم میں برابر کا شریک ہو کر یہاں نظر بندی کے دن گذارنا چاہتا تھا تاکہ قوتِ برداشت کا امتحان بھی ہو اور اس سے روحانی جذبات کو تقویت بھی مِلے۔

یہ میں نے اپنی بڑائی جتانے کے لئے نہیں لکھا۔ اللہ شاہد ہے کہ یہ ساری کہانی میرے حقیقی جذبات کی کہانی ہے جو میری نظر بندی کے دوران میرے دل و دماغ پر چھائے رہے۔ نہ ہی میری یہ کوشش ہے کہ دوسروں کے خیالات اور اندازِ فکر پر نکتہ چینی کروں، جو میرے ہم خیال نہ تھے، میری اُن سے کوئی ذاتی عداوت نہیں۔ ان معاملات میں میرا کبھی کسی سے تنازعہ نہیں ہوا۔ قید میں ویسے ہی ساتھیوں میں FRUSTRATION دیکھتا تھا۔ انہیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر کے میں اُس .FRUSTRATION میں اضافہ نہ کرنا چاہتا تھا۔ اپنے حلقۂ اثر کے افسروں کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار ضرور کیا کرتا۔ لیکن ان کو اپنا ہم خیال بنانے میں میں نے کبھی کسی کو مجبور کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میرا نقطۂ نظر شاید انتہا پسند تھا۔ اوروں کا اندازِ فکر شاید بجا ہو لیکن مجھے اب بھی اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے جن وجوہات کو مدِ نظر رکھ کر یہ فیصلہ کیا اور جس پر کاربند رہا میرے لئے دلی سکون اور تسلی کا باعث بنا۔ ایسا کرنے سے بجائے اس کے کہ مجھے ذہنی کوفت محسوس ہوتی مجھے تسکین ملی، جس طرزِ عمل کے اپنانے سے آرام و آسائش و طبع خاطر کے مواقع مہیا ہوتے ہوں انسان اُن کو آسانی

سے قبول اور اختیار کرتا ہے۔ شاید یہ قدرتی عمل ہے۔ میری نظر میں محض انسانی فطرت کی تشنگی بجھانے سے زندگی کی بلندیوں پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ جسے ہم فطرت کہتے ہیں۔ اس کا بیشتر حصہ انسانی کمزوریوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ کیا یہ فطری عمل ہے کہ انسان آرام و آسائش ڈھونڈتا ہے۔ اگر یوں ہے تو یہ فطرت کا کمزور پہلو ہے۔ آرام ڈھونڈنے سے آرام نہیں ملتا۔ کیونکہ زندگی ایک مسلسل جدوجہد ہے۔ یعنی مشکلات کو ڈھونڈنے اور ان کا سامنا کرنے کا دوسرا نام۔ زندگی کے ایسے کئی چوراہے ہیں جن میں ریاضت، نفسی خواہشات پر کنٹرول اور ایثار کے بغیر انسانی قدروں کا حصول ناممکن ہے ؎

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

کیمپ کے عقب میں شمال کی طرف سنتری دونوں باڑوں کے درمیان رات کے وقت ڈیوٹی پر ہوتا اور چکر لگاتا رہتا۔ ہماری سرنگ شروع کرنے کے کوئی پندرہ روز بعد سنتری کی پوزیشنوں میں تبدیلی ہوئی۔ عقب والا سنتری بیرونی باڑ کے باہر متعین کیا گیا اور دن کے وقت اس کی پوزیشن باورچی خانہ کے عین پیچھے ہوتی۔ اس سے باورچی خانہ سے مٹی کے انخلا میں دِقّت پیدا ہوگئی۔ بار بار بالٹیوں کے اندر باہر آنے سے اُس کو شُبہ ہونے کا خطرہ تھا۔ مٹی کو باورچی خانہ کے اندر دھری آٹے کی بوریوں کے ساتھ ہی رکھنا پڑتا۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک رات طوفان آیا۔ بڑی تیز آندھی آئی اور ہمارے صحن میں لگے کیکر کے درخت کا اُوپر والا حصّہ زمین پر آن گرا۔ صبح ہوتے ہی میں نے چند اردلیوں کو ساتھ لگایا اور اس درخت کے حصّہ کو دھکیل دھکیل کر باورچی خانہ کے کونہ میں لا رکھا، اس سے خاطر خواہ پردہ ہوگیا۔ اس طرح مٹی پھینکنے کا کام پھر سے سہل ہوگیا۔

۱۵ر اپریل کو جب میں دوسرے کیمپ میں گیا تو جونیئر افسروں سے یہ طے پایا کہ دونوں سرنگیں ۲۹ر اپریل تک مکمل کرلی جائیں گی اور ۳۰ر اپریل کی رات فرار کے لئے عارضی طور پر مقرر ہوئی اس دوران کسی شک کی بنا پر دوسرے کیمپ والوں کی بڑی تفصیلی چیکنگ ہوئی۔ اگرچہ وہ پکڑے

جانے سے بال بال بچ گئے لیکن اس دوران میں چند روز کے لئے احتیاطاً اُنہیں کام بند کرنا پڑا۔ ہمیں بھی اس کی اطلاع ملی تو ہم نے بھی احتیاطاً کام بند رکھا۔

۲۵ اپریل کو یہ طے پایا کہ ۶ مئی کی تاریخ مناسب رہے گی، نکلنے کے لئے شام آٹھ بجے کا وقت موزوں قرار پایا تاکہ پوری رات میں دُور نکل جانے کا موقع مل جائے۔ پختہ تاریخ کا تعین کُتے کے ذریعے پیغام بھیجکر کیا جانا تھا۔

کھودنے کے لئے ایک انچ قطر سریئے کے ایک سرے کو چپٹا کر کے اچھا خاصا کھودنے کا اوزار بنا لیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سور بیج پٹ کے اُوپر لگے ہوئے لوہے کے آدھا انچ موٹے چپٹے ٹکڑے کو چند روز ہلا ہلا کر نکالا گیا تھا۔ پھر یعقوب مسیح نے اس کے ایک سرے کو آگ میں سُرخ کر کے پتھر مار مار کر اور چپٹا کیا تھا۔ اس کے دستے پر ایک قمیض پھاڑ کر لپیٹی گئی تھی۔ اس طرح یہ اوزار سرنگ سے مٹی کھرچنے کے لئے بے حد کارآمد ثابت ہوا۔

جو ہمارا ساتھ نہ دے رہے تھے اُن کا خیال تھا کہ ہم چند روز کے اندر ہی پکڑے جائیں گے، مٹی سنتریوں کے سامنے باہر نکالنی ناممکن ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مجھے کامل یقین تھا کہ کوئی گڑبڑ نہ ہوگی۔ ڈیوٹی پر کھڑے سنتری جن کی تعداد ہمارے چھوٹے سے کیمپ کے ارد گرد چھ تھی میری رائے میں محض جسمانی طور پر وہاں کھڑے تھے، جب تک کوئی وہاں تاروں کی باڑ پھاندنے کی کوشش نہیں کرتا وہ مطمئن تھے، اُنہیں کیمپ کے اندر ہماری روزمرہ کی نقل و حرکت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ڈیوٹی پر کھڑا سنتری باورچی خانے کے اندر ہوتے کام کی کیوں فکر کرنے لگا۔ گرمی میں تین چار گھنٹے لگاتار کھڑے رہنا اور دھیان اپنی ڈیوٹی پر رکھنا عام سنتری کے لئے ناممکن سی بات تھی۔ مچان پر اور زمین پر کھڑے سنتری کے دماغ میں سینکڑوں خیالات آتے رہتے تھے۔ اگر وہ اپنے خیالات کی دنیا میں وقت نہ گزارے تو یہ تین گھنٹے کی ڈیوٹی کا وقت بہت لمبا ہو جائے۔ سنتری ڈیوٹی پر کھڑا ہونے کے باوجود اپنے گھر کا چکر لگاتا ہے۔ اپنے شہر اور گاؤں کی گلیوں میں پھرتا ہے۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملتا ہے۔ محبوبہ کے یا کسی جاننے والی لڑکی کے عہد و پیمان اور اُس

سے اُس کی چوری چھپے کی ملاقات کے منظر اُس کے سامنے پھرتے ہیں۔ اپنی پسند کی فلموں میں وہ خود ہیرو کے روپ میں ہیروئین سے باتیں کرتا ہے۔ وہاں کھڑے اُسے چھٹی جانے کا خیال بھی آتا ہے، اور وہ چھٹی کے لیے منصوبے بھی بناتا ہے۔ یہ اپریل کا مہینہ ہے بس سات ماہ بعد دسمبر میں وہ چھٹی پر جائے گا۔ یہ کرے گا، وہ کرے گا، بیوی بچوں کے لیے کیا لے کر جائے گا۔ پھر دور کے مستقبل سے ہٹ کر اگلے ماہ ملنے والی تنخواہ کا خیال بھی اُسے وہیں کھڑے آتا ہے کہ وہ آئندہ ماہ کتنے روپے اپنے والدین یا بیوی کو بھیجے گا۔ کتنے کا کیا خریدے گا۔ وہ پورا بجٹ بناتا ہے۔ پھر وہ اپنی ترقی کے خواب بھی وہیں کھڑے کھڑے دیکھتا ہے۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے لئے ایسے سہانے خواب اور خیالات میں محو رہنے کے بعد وہ گھڑی پر نظر ڈالتا ہے کہ اس کی ڈیوٹی کے ختم ہونے میں کتنا وقت باقی ہے، ایسا وہ ایک دن نہیں کرتا بلکہ چوبیس گھنٹوں میں تین ڈیوٹیوں کے دوران یہ تمام خیالات اس کے دماغ سے گزرتے اور اس کی آنکھوں کے سامنے چکر لگاتے، اتنی مصروفیت کے ہوتے ہوئے وہ کیونکر ہماری پوشیدہ کارروائی کی تہہ تک پہنچ سکتا تھا۔

پوشیدہ کام کرنے والے کے دل میں تو چور ہوتا ہے، اُسے تو ہر ایک کی آنکھوں میں اپنے راز کے افشا ہونے کی جھلک نظر آتی ہے، ایسا کام کامیابی سے کرنے کے لئے دوسروں کی قدرتی دماغی کیفیت کا صحیح جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ غیر ضروری احتیاط سے ایسے کام کبھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتے۔ دل کھُلا رکھ کر یقینِ محکم کا مظاہرہ کرتے ہوئے کام کرنے سے دیکھنے والے کو کم شک ہونے کا امکان ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ گھبراہٹ اور چوروں کی سی طرح کام کیا جائے۔ میرا یہ تجزیہ درست نکلا۔ سنتری سب کچھ دیکھنے کے باوجود کچھ نہ دیکھ سکے۔ سرنگ کھدتی رہی اور مٹی بکھرتی رہی۔

اپریل میں بیحد گرمی ہو چکی تھی۔ آٹھ فٹ زمین کے اندر جہاں سکون بھی تھا اور ٹھنڈک بھی، وہاں کھدائی کرتے وقت بازو جواب دے دیا کرتے مگر دل کو تسلی نہ ہوتی۔ پسینہ پانی کی طرح بہتا۔ سانس اس طرح رُکتی جیسے کوئی گلا گھونٹ رہا ہو۔ دو دو اور تین تین گھنٹے لگاتار کھدائی کا کام کیا۔ کڑکتی گرمی میں کمرے کے برآمدے میں بیٹھ کر دوپہر ایک بجے سے شام پانچ بجے تک سنتری کے طور پر ڈیوٹی بھی دی۔

ان مشکلوں ہی میں حقیقی سکون پنہاں تھا۔ جس دن سرنگ کی کھدائی کا کام بند کرنا پڑتا تو طبیعت اداس رہتی۔ ایسے جیسے کوئی قیمتی چیز چھن رہی ہو، بڑی عزیز چیز قریب آتے آتے رُک گئی ہو۔ اس مشقت کے بعد شام کو اشنان کر کے کچھ دیر چہل قدمی کی جاتی۔ شام کا کھانا سات بجے کے قریب کھا کر کتاب کا مطالعہ یا زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لکھائی آدھی رات گئے تک کیا کرتا، صبح دیر سے ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اٹھتا۔ طوطے اور کتے کو اپنے راشن کی آدھی روٹی اور آدھی چائے پلاتا۔ رات کو بارہ بجے کے قریب جب سوتا تو ایسی میٹھی نیند آتی کہ صبح تک ساری تھکاوٹ غائب ہوتی۔ وہ کشمکش کے دن کتنے سہانے تھے۔ ۳۶ فٹ لمبی سرنگ تیار ہو چکی تھی۔ چار فٹ اور۔ اور ہم آزاد فضا میں باہر نکل جائیں گے۔ باہر کا خیال، آزاد فضا کا احساس ہوتے ہی دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ جو یہ کہتے تھے کہ یہ تمام احمقانہ منصوبہ ہے اُن کی عقل پر ہنسی آتی۔ ہمارے ساتھ نہ شامل ہو کر وہ کیا کھو رہے تھے، شاید وہ اس سے ناواقف تھے، یہ تمام EXCITEMENT، یہ پسینے کا نکلنا، یہ کوشش، یہ کشمکش یہ سب زندگی کا لب لباب تھا۔ یہ نہ ہوتے تو شائد گزشتہ چار ماہ چار صدیوں کی طرح گزرتے۔ زندگی کا لطف محض آرام دہ زندگی گزارنے میں نہیں۔ اس کا صحیح لطف ایک بلند منزل کے تعین، ایک نیک اور صحت مند مقصد کے حل کے بعد اس کے حصول کی کشمکش میں ہے۔ اگر اس کشمکش کا جذبہ نہ ہوتا تو انسان کا ان بلندیوں پر پہنچنا ناممکن تھا۔ چاند اور تاروں کی تسخیر میں ان گنت خطرات مول لینے والے، شمالی قطب اور ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے والے ایسے ہی لطف کا مزہ چکھتے ہیں۔ یورپ کے وہ لوگ جنہوں نے اس قدیم زمانے کے ٹوٹے پھوٹے سمندری جہازوں پر ہزارہا میل کا سفر طے کیا۔ آسٹریلیا اور امریکہ کے پرانے رہنے والے لوگوں سے لڑے وہ اسی کشمکش اور جدوجہد سے لطف اندوز ہوتے اور موجودہ بلندیوں پر پہنچے، جس کی پوری دنیا آج داد دیتی ہے یا تیرہ سو برس پہلے عرب کے ریگستانی علاقوں سے نکل کر جس قوم نے عزت و احترام کی وہ اوج پائی جو ان کے پیہم عمل کیوجہ سے تھی جو آج ایک مثال بن چکی ہے۔ ایسی بلندیاں عزم مانگتی ہیں، انسانی عزم، ایسی بلندیوں پر وہی قومیں اپنا پرچم لہراتی ہیں جو خطرات سے دوچار ہونا جانتی ہیں جنہیں اپنے مقصد کے حصول کے لئے جان کی بازی لگانے

میں بھی دریغ نہیں ہوتا، جو اپنے ماتھے کے پسینے سے سوکھی زمین کو سیراب کر کے اس میں اناج پیدا کرتے ہیں۔ مشکلات اور خطرات کو مول لینے والے تو ایک دفعہ مرتے ہیں اور مر کر بھی زندہ رہتے ہیں، مگر ان سے کنارہ کشی کرنے والے موت سے پہلے سینکڑوں دفعہ مرتے ہیں اور ان کے مرنے کے بعد انہیں کوئی نہیں جانتا۔

ٹالسٹائے لکھتا ہے۔ انسان موت سے ڈر کر کسی چیز کو نہ تسخیر کر سکتا ہے نہ اس کا مالک بن سکتا ہے۔ موت سے نڈر شخص ہر چیز حاصل کر سکتا ہے۔

ہم کامیابی کے کنارے پر کھڑے تھے۔ آزادی ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی، چند فٹ اور کھودنے کے بعد صرف چند روز کے بعد قید کی زنجیریں ٹوٹنے والی تھیں، پھر بھارت کی تمام تر قوت ہمیں اسیر بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ پھر ہمارے پاؤں اور بازو اور روح آزاد ہو گی اور ہم اپنے وطن عزیز کی طرف راہ کی ہر مشکل کو روندتے ہوئے بڑھتے چلے جائیں گے۔ یہ میری نہیں، ہماری نہیں بلکہ پاکستانی قوم کی کامیابی ہو گی کہ باوجود ان کانٹے دار تاروں کی اونچی دیواروں اور ان گنت پہرہ داروں کے ہم بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرار کے وقت میں اپنے تمام ساتھیوں کو ساتھ لے کر نکلوں گا۔ خواہ انہوں نے ہمارے ساتھ کام کیا تھا یا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جس قدر نکلیں اتنی ہی ہماری کامیابی ہو گی۔ ہم سب پاکستانی تھے، دوسروں کا وہاں سے نکلنا میرے لئے اتنا ہی اہم تھا جتنا میرا اپنا۔ اس معاملے میں خود غرضی کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ کتنا مزہ آئے گا جب صبح کو صوبیدار روشن سنگھ، تھاپا اور کیپٹن جاتلے اور میجر چوان، پورا کیمپ خالی پائیں گے۔ اس سارے خیال کے آتے ہی جسم میں ایک بجلی کوند جاتی، کیا یہ سب خواب ہے؟ کیا یہ ٹی وی کا ایک ڈرامہ یا پردۂ سیمیں پر الفرڈ ہچکاک کی کہانی پر مبنی فلم، نہیں یہ خواب نہ تھا اور نہ ہی کوئی فلم تھی بلکہ ایک زندہ حقیقت تھی۔

## ۱۲

پھر ایک شام سرنگ کا منہ دوسری طرف جا نکلا۔ غیر نشان شدہ کپڑے ہم نے پہلے ہی سرنگ

میں چھپا رکھے تھے، چار پانچ افسروں پر مشتمل پارٹیاں بنائی گئی تھیں۔ ایک پارٹی کو دوسری پارٹی کے سرنگ سے نکلنے کے بعد پاکستان پہنچنے کے راستے اور منصوبے کا علم نہ تھا تاکہ اگر ایک پارٹی پکڑی بھی جائے تو بھی ان سے دوسروں کے منصوبے کا پتہ نہ چل سکے۔ کیمپ کے تمام افسر اور سپاہی شام کے آٹھ بجے نکلنا شروع ہوئے۔ آدھ گھنٹے میں سب کے سب باہر نکل گئے۔ میں سب سے آخر میں نکلا۔ نکلنے سے پہلے میں نے کیمپ پر ایک نگاہ دوڑائی، بالکل سنسان پڑا تھا۔ کمروں میں بجلیاں جل رہی تھیں۔ اپنے کمرے میں مَیں اپنا ٹرانسسٹر آن کر آیا تھا جس پر گانے لگے ہوئے تھے۔ سرنگ سے نکلتے ہی میں اس کچے راستے پر تھا جو شہر کی طرف جاتا تھا۔ میں نے اس راستہ پر چند قدم چل کر ایک سگریٹ سلگایا۔ سنتری سامنے پچیس فٹ پر کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے لمبا کش لگایا اور دھواں آسمان کی طرف پھینکتا ہوا بڑی لاپرواہی سے سنتری کے قریب سے گزر گیا۔ سنتری نے مجھ سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی، کرتا بھی کیسے، وہ تو شارع عام تھا۔ سارا دن لوگ اس پر آتے جاتے رہتے تھے، خاص کر شام کے وقت تو کافی مزدور پیشہ لوگ وہاں سے گزرتے تھے۔ میں نے ایک میلی قمیض جو ایک دو جگہ سے پھٹی بھی تھی اور ایک نیلا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ میرا حُلیہ کسی غریب مزدور اور محنت کش انسان سے ملتا جلتا تھا۔ دماغ میں ہر طرح کے پیش آنے والے مسئلے اور پوچھے گئے سوالوں کے جواب بھرے پڑے تھے مثلاً میں موہن لال تھا۔ دِلی میں جامع مسجد کے پچھواڑے مٹیا محل سے ذرا آگے جا کر رام گلی میں میرا گھر تھا۔ یہاں میں آگرہ جنرل الیکٹرک سٹور کمپنی کی طرف سے بیرکوں میں بجلی کی تار لگانے کے سلسلے میں آیا تھا۔ ہماری کمپنی نے مُرار کیمپ کی بیرکوں میں بجلی کی تار بدلنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

میری پارٹی میں کرنل شریف اور دو اور جوان تھے۔ ہم سب کے پاس تیس تیس ہندوستانی روپے تھے۔ تین سو گز کے فاصلے پر پختہ سڑک کے کنارے کرنل شریف اور دونوں جوان میرے انتظار میں کھڑے تھے، اُن کے چہروں پر وہ قدرتی گھبراہٹ اور بے چینی تھی جو ایسے حالات میں ہونی چاہیئے تھی، میں ان کے پاس پہنچا تو بغیر کوئی بات چیت کئے ہم سڑک سے نیچے اُتر کر تیز قدم بڑھاتے شہر کی طرف چل دیتے۔

ہماری پارٹی کا منصوبہ آسان اور سادہ تھا۔ میں پیدل ویرانے میں بھاگنے اور چھپنے کا قائل نہ تھا۔ میں نے ایک اور سگریٹ سلگایا۔ سگریٹ کے لمبے کش لگانے سے بے جا قسم کی پیدا ہونے والی بے چینی کچھ کم ہوئی۔ میل بھر چلنے کے بعد ایک خالی ٹانگہ ہمارے پاس سے گزرا۔ میں نے اس کو ٹھہرنے کو کہا۔ شریف نے انگریزی میں میرے کان میں کچھ کہنا چاہا۔ میں نے اسے بے پرواہی سے اونچی آواز میں فکر نہ کرنے کو کہا اور ٹانگے کی اگلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ باقی بھی ٹانگے میں بیٹھ گئے میں نے ٹانگے والے کو ریلوے سٹیشن چلنے کے لئے کہا۔ کچھ فاصلہ پر جانے کے بعد میں نے ایک سگریٹ خود سلگایا، ایک ٹانگے والے کو لگا کر دیا۔ ٹانگے والے سے میں نے آگرہ جانے والی گاڑی کا وقت معلوم کیا۔ اس نے بتایا کہ دس بجے گاڑی جاتی ہے۔ اس وقت نو سوا نو بجے ہوں گے۔ پندرہ بیس منٹوں میں ہم ریلوے سٹیشن پر جا پہنچے۔ ٹانگے والے کو کرایہ ادا کیا۔ سید ھا ٹکٹ گھر گیا اور چار ٹکٹ دلی کے خرید کر واپس اپنے ساتھیوں سے آن ملا۔ سٹیشن سے ذرا ہٹ کر چائے والے کی ایک چھوٹی سی گندی دوکان تھی وہاں ارد گرد کچھ اندھیرا بھی تھا وہاں جا کر ایک ایک گرم چائے کی پیالی پی۔ ساتھ والی دوکان سے ایک ایک پان لے کر سب کو کھلایا۔ چار مینار سگریٹ کی چار ڈبیاں خریدیں۔ کچھ دیر وہیں کھڑے آپس میں گپ شپ کی۔ باتیں کچھ موسم کی کیں مگر دل و دماغ خوشی اور پکڑے جانے کے ڈر سے بھرپور تھا۔ مجھے یاد نہیں ہم نے آپس میں کیا باتیں کیں اتنا یاد ہے کہ کھسر پھسر کے بعد بھینچی ہوئی ہنسی ہنسے، ایسی ہنسی جو صرف ایک دوسرے کو ستانے کے لئے کافی ہو، جو باوجود نہ چاہنے کے ہمارے منہ سے نکل رہی تھی، ایسی ہنسی جس سے ہمارے دلوں میں غیر ضروری طور پر یہ ڈر پیدا ہوتا کہ اسے سن کر ہمیں کوئی آن پکڑے گا، پوچھے گا کہ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو۔ مگر یہ سب ہمارا وہم تھا۔

گاڑی آنے کی آواز آئی اور ہم پلیٹ فارم پر آئے۔ پُل کے اُوپر سے دوسری طرف کے پلیٹ فارم پر آئے۔ شریف ہندی جانتا تھا گاڑی کے ایک ڈبے کی تختی پر بمبئی سے امرتسر لکھا ہوا تھا۔ اس نے میرے کان میں بتایا کہ یہ گاڑی امرتسر جا رہی ہے، ہم تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے

میں جا گھسے۔ گاڑی میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی اور کچھ بچے اپنی ماؤں کی گود میں لیٹے سو رہے تھے، ایک کونے میں ایک چھوٹا بچہ بلند آواز میں رو رہا تھا اور اس کی ماں اسے چپ کرانے کی کوشش میں مصروف تھی، گاڑی چل دی، پانچ ماہ کی نظر بندی کے بعد یہ ماحول بڑا عجیب سا لگا۔ پرایا ملک نئے چہرے، اپنے دل میں گھبراہٹ، ان سب باتوں کے باوجود ماحول مانوس سا دکھائی دیتا تھا، کچھ لوگ پنجابی میں باتیں کر رہے تھے، کچھ اردو میں، شکل و شباہت میں وہ سب مانوس مانوس دکھائی دیتے تھے، ساتھ بیٹھے ہوئے ایک سردار بہادر کو میں نے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے تھے، انہوں نے جواب میں بتایا کہ وہ امرتسر جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ کہاں رہتے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ وہ کٹڑہ جیمل سنگھ کے رہنے والے ہیں، اس محلے سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ کیونکہ پاکستان بننے سے پہلے امرتسر کے اس محلے میں میرے ننہال تھے۔ کٹڑہ جیمل سنگھ کا نام سن کر پرانے دن یاد آ گئے، جب ہم وہاں جا کر ہری سنگھ کی دوکان سے سوڈے کی بوتلیں پیا کرتے تھے اور شہابے کھیر والے کی دوکان سے کھیر کھایا کرتے تھے۔ سردار صاحب کے بیوی بچے بھی ساتھ تھے، میں نے انہیں اپنا نام موہن لال بتایا، ایک سٹیشن پر گاڑی رُکی تو دل میں خوف پیدا ہوا کہ کوئی فوجی یا پولیس مین سٹیشن پر ہمارا پتہ کرنے کے لئے کھڑا نہ ہو۔

گاڑی میں زیادہ تر بیٹھے لوگ اونگھ رہے تھے، میں نے ایک روپے کے بسکٹ باہر پلیٹ فارم پر کھڑے چھابڑی والے سے خریدے، سردار صاحب کا بیٹا جو چٹیا بنا کر ننھی منھی لڑکی دکھائی دیتا تھا اسے چند بسکٹ دیئے، کچھ سردار صاحب اور سردارنی کو بھی دیئے۔ یہ جانتے ہوئے کہ سکھ سگریٹ پینے کو برا سمجھتے ہیں سارا راستہ سگریٹ نہ سلگا سکا۔ سردار صاحب اچھی طبیعت کے آدمی تھے حال بازار میں ان کی دوکان تھی، گاڑی رات کے ساڑھے گیارہ بجے آگرہ پہنچی۔ کیمپ میں گاہے بگاہے رات کو چیکنگ ہوا کرتی تھی، اگر اس رات ہوئی ہو تو ممکن تھا کہ اب تک آگرہ تک خبر پہنچ گئی ہو، میں اور شریف نے آپس میں مشورہ کیا مگر اس نتیجے پر پہنچے کہ خدا پر بھروسہ کر کے آگے ہی جانا چاہیے۔ شریف کا خیال تھا کہ سیدھے ہی امرتسر جا اتریں، آخر رات تین

بجے گاڑی دلی جا پہنچی۔ گاڑی ابھی دہلی کے سٹیشن پر پہنچے ہی والی تھی کہ میں نے کھڑکی سے باہر گردن نکال کر آنے والے پلیٹ فارم پر دیکھا اور میرا خون بالکل خشک ہو گیا۔ بے شمار فوجی پلیٹ فارم پر بندوقیں لئے کھڑے تھے، معاملہ دگرگوں تھا، سوچنے کا وقت نہ تھا۔ پلیٹ فارم پر پہنچنے سے پہلے ہی اترنے میں خیریت تھی اور اس کے لئے چند لمحے ہی باقی تھے۔ میں جھٹ اٹھا، سردار صاحب سے ہاتھ ملایا اور جلدی سے پلیٹ فارم کے الٹی جانب والے دروازے کی طرف لپکا۔ شریف اور دونوں جوان میرے اشارے سے میرے پیچھے آئے۔ ٹرین آہستہ ہو چکی تھی باہر اندھیرا تھا۔ میں گاڑی سے اترا، میرے بعد میرے تینوں ساتھی بھی یکے بعد دیگرے نیچے اُترے۔

پلیٹ فارم کی مخالف سمت جس طرف ہم اترے تھے چھ سات فوجی کھڑے تھے۔ ہمارا عکس سا انہوں نے دیکھا ہو گا۔ ہمارے اترتے ہی سٹیاں بجنی شروع ہو گئیں اور ہم الٹی جانب اندھا دھند بھاگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا کچھ فوجی پیچھا کر رہے ہیں۔ ان کے بوٹوں کی آواز سے ان کے دوڑنے کا پتہ چلتا تھا۔ ورنہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ دائیں طرف ایک جنگلہ تھا، اس سے پھاندا۔ کوارٹروں کی گلیوں سے گزرتا ہوا دائیں بائیں مڑتا ایک طرف کو نکل آیا، میرے دوسرے ساتھی مجھ سے بچھڑ چکے تھے، میری سانس پھولی ہوئی تھی، پسینے سے میں شرابور ہو رہا تھا، خوف و ہراس نے مجھے آن لیا تھا، اپنے ساتھیوں سے بچھڑنے کا مجھے سخت افسوس تھا۔ ذرا فاصلے پر سڑک تھی جس پر چند کتے ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے، چند کتے سڑک کے کنارے سوئے ہوئے تھے، اُن سے ذرا آگے بند دوکانوں کے باہر کچھ لوگ ٹوٹی پھوٹی چارپائیوں پر اور کافی لوگ فٹ پاتھ کے ننگے فرش پر سوئے ہوئے تھے، ایک جگہ ذرا خالی سی تھی میں بھی اس فٹ پاتھ پر لیٹ گیا، اس سناٹے میں چلنے والے کو پکڑنا آسان تھا لیکن بے شمار سوئے لوگوں میں سے ہر ایک کی چھان بین کر کے کسی ایک کو گرفتار کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، میں وہاں کوئی پندرہ منٹ لیٹا ہوں گا، دو فوجی جیپیں سڑک پر میرے پاس سے گزریں، میں نے چور نظروں سے دیکھا تو اس میں بیٹھے فوجی کسی کی تلاش میں دکھائی دیتے تھے۔ چند گز آگے جا کر وہ جیپ رُکی، بائیں ہاتھ کو جانے والی سڑک

پر مڑی کچھ دیر بعد میرے پاس سے اسی طرف کو گزر گئی جس سمت سے آئی تھی۔ میں چپ چاپ لیٹا آسمان پر چاند تاروں کا نظارہ کر رہا تھا اور اپنے مالک حقیقی کے سامنے دست بدعا تھا کہ میری اس مشکل وقت میں مدد کرے۔ سخت تھکاوٹ کے باوجود نیند نہ آئی۔ اس وقت سونا بھی خطرناک تھا۔

کچھ دیر یونہی پڑے گزر گئی، مرغوں کی ککڑوں کڑوں کی آوازیں آنے لگیں۔ سحر ہونے والی تھی۔ دور کسی مسجد میں آذان کی آواز کانوں میں پڑی۔ اللہ اکبر، نماز پڑھنے کو بے حد جی چاہا، تاکہ خدا کے سامنے سر بسجود ہو کر اس کی مدد اور رحمت کا شکر بجالاؤں، لیکن پھر خیال آیا کہ مسجدوں میں تو خاص طور پر پولیس اور فوج والے چیکنگ کریں گے۔ ذرا اور روشنی ہوئی تو سویا ہوا دلی ایک دم سے جاگ اٹھا۔ بسیں، ٹیکسیاں، موٹر، موٹر رکشے، لوگ اور شور پو پھٹتے ہی آوارد ہوئے۔ میری جیب میں ڈیڑھ روپیہ تھا۔ سب کے ٹکٹ خریدنے کے بعد میرے پاس اب یہی رقم بچی تھی۔ میں بھی باقی وہاں سوئے ہوئے لوگوں کے ساتھ اٹھ کر اس جیتی جاگتی دنیا کا ایک حصہ بن گیا۔ فٹ پاتھ پر لیٹے لیٹے میرے دماغ میں کیا کیا خیال آئے۔ ستاروں کی دنیا کو دیکھ کر ان کے پرے سات آسمان دکھائی دیئے۔ کس قدر بڑی کائنات ہے جس میں ہماری زمین شاید ایک چھوٹا سا نقطہ ہے اور اس چھوٹے سے نقطے پر میری اس فٹ پاتھ پر کیا وقعت تھی، لیکن پھر بھی میرے دماغ میں مجھے اپنے نفع نقصان کے علاوہ باقی سب کچھ ہیچ دکھائی دیتا تھا۔ کائنات کی عظمت کا احساس پہلے کم ہی ہوا۔ ہر لمحہ اور ہر قدم پر اپنے آپ کی اتنی فکر کی جاتی ہے اور خوشیوں کو حاصل کرنے کے غم میں زندگی بسر ہو جاتی ہے لیکن وہاں فٹ پاتھ پر لیٹے ہوئے ستاروں سے پرے اس عظیم کائنات کی سیر کرتے ہوئے مجھے زندگی کی کچھ سچی حقیقتوں کا احساس ہوا۔ انسان خوش رہنے کے لئے کیا کچھ کرتا ہے خوشی سمٹ کر انسان کے وجود کے اندر ہوتی ہے اور یہ خوشی زندگی کی مختصر اور سادہ ضروریات کے حصول سے ملتی ہے۔ غم آسائش زندگی کی بہتات سے بڑھتا ہے۔ اس ننگے فٹ پاتھ پر جہاں نہ چارپائی تھی اور نہ ہی تکیہ، میں بے حد سکون اور آرام محسوس کر رہا تھا، اس زندگی میں کوئی مشکل ناقابل برداشت نہیں۔ کٹھن سے کٹھن وقت گزر جاتا ہے کیونکہ انسان نہ اپنے آپ کو فکر

غیر ضروری کی بندش سے آزاد کر پاتا ہے اور نہ ہی مکمل خوشی کو حاصل کرتا ہے۔ کوئی حالت ایسی نہیں جس میں اُسے ناخوش رہنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی بندش کی فکر کا اُسے خواہ مخواہ احساس کرنے کی ضرورت ہے۔ خوشی وغم کی حدود مقرر ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب ہیں۔ کچھ اس طرح کے خیالات کی تشکیل کے تانے بانے میں میں فٹ پاتھ پر مصروف رہا۔ یہ خیالات میرے ذہن تک محدود عقل کی تشکیل نہ تھے بلکہ میرے سارے وجود سے جنم لے رہے تھے۔ میں نے ان خیالات کو جوں کا توں لکھ ڈالا ہے۔ شاید میں خود بھی ان کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔

جیب سے کنگھی نکال کر میں نے سر کے مختصر بالوں کو سنوارا۔ اور اس بازار میں لوگوں کے ہجوم کے ساتھ ایک سمت کو چلنے لگا، ہر طرح کے لوگ وہاں چل رہے تھے۔ جب کسی سپاہی کو کھڑے یا گزرتے دیکھتا تو غیر ارادی طور پر سارے جسم سے ایک جھرجھراہٹ کی لہر دوڑ جاتی۔ مگر جلد ہی میں محسوس کرتا کہ اس بڑے شہر میں میرا کوئی جاننے والا نہیں۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی، بیس پیسے کی ایک پوڑی لی۔ سڑک کے کنارے چلتے چلتے اُسے کھایا۔ اس سے زیادہ خرچ نہ کر سکتا تھا کیونکہ میرے پاس بہت کم پیسے تھے۔ دل میں بار بار اپنے ساتھیوں کا خیال آتا۔ شاید کہیں یہاں مل جائیں بار بار ادھر ادھر نگاہ دوڑاتا جس جگہ وہ مجھ سے بچھڑے تھے وہاں جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی، وہ وہاں پر ہو بھی کیسے سکتے تھے۔ چلتے چلتے ایک بڑی شاہراہ پر آ گیا۔ دُور کافی شور تھا نعرے بلند ہو رہے تھے۔ کافی لوگ اس چوک کی طرف جا رہے تھے، جس طرف سے یہ شور آ رہا تھا، مجھے تو وقت گزارنا تھا۔ چند گھنٹے نہیں بلکہ چند دن تاکہ فوج کی طرف سے میری گرفتاری کی ابتدائی کوشش ڈھیلی پڑ جائے اور یہ سمجھنے لگیں کہ میں بارڈر پار کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ہی سرحد کو پار کرنے کی کوشش کر سکتا تھا، میں بھی اسی چوک کی طرف چل پڑا۔ چوک میں بے شمار پولیس کھڑی تھی، ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں، پولیس کو دیکھ کر میں ذرا جھجکا۔ مگر پھر خیال آتے ہی کہ مجھے کون جانتا ہے۔ میں بھی اس مجمع میں شامل ہو گیا جو چوک کے چاروں طرف کھڑا طلباء کے مظاہروں کا تماشہ دیکھ رہا تھا، چوک کے درمیان اور شمال والی سڑک پر طلباء کا ایک جلوس نعرے لگا رہا تھا۔ طلباء کے ہاتھوں

میں بورڈ تھے، جن پر انہوں نے اپنے مطالبات لکھ رکھے تھے، اس جلوس میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی، ان سب میں بڑا جوش وخروش تھا۔ پھر ایک لڑکی نے ٹیکسی کی چھت پر چڑھ کر پرجوش تقریر کی۔

"ہماری حکومت بالکل سادی ہے سیدھی ہے، بالکل سیدھی، اتنی ہی سیدھی جتنی کہ جلیبی سیدھی ہوتی ہے" (لوگ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئے، مجھے بھی بڑی ہنسی آئی) غریبی ہٹاؤ کے نعرے اور سوشلزم کا پرچار ہماری آنکھوں میں مٹی ڈالنے کے لئے کیا جا رہا ہے حکومت کے منسٹر اور عہدیدار شاندار بنگلوں میں عیش وعشرت کی زندگی گذار رہے ہیں، ایک منسٹر پر ہر ماہ عوام کے خون پسینے کی کمائی سے چالیس ہزار روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، یہ غریبی ہٹاؤ کا انداز نہیں غریبی بڑھاؤ کا انداز ہے، طلبا کے لئے سکول اور کالج جانے کے لئے بسیں نہیں جبکہ ہر وزیر کے پاس دو دو اور تین تین کاریں ہیں، طلباء کے لئے ہوسٹل نہیں جبکہ وزیروں اور افسروں کے لئے ٹھاٹھ دار بنگلے بن رہے ہیں، ملک کے غربا روٹی کو ترس رہے ہیں اور ہمارے حکمران ضیافتوں اور پارٹیوں میں مشغول ہیں، ہمیں حکمرانوں کی ضرورت نہیں، ہمیں بادشاہ اور وزیر نہیں چاہیئے، ہمیں خادموں کی ضرورت ہے اگر یہ بادشاہ اور وزیر رہنا چاہتے ہیں تو تاشوں کی گڈی میں گھس کر رہ سکتے ہیں۔ ہمیں خادموں کی ضرورت ہے، ایسے پرخلوص لیڈروں کی جو قوم کی خدمت کریں، ہم انصاف چاہتے ہیں، ہمیں سچے سوشلسٹ معاشرے کی ضرورت ہے، ہم اپنا حق مانگتے ہیں، ہم یہ دھاندلی نہیں چلنے دیں گے۔ بھارت اندرا گاندھی کی جائداد نہیں، وہ اس ملک کی رانی نہیں، اس کے بیٹے کو کاروں کے کارخانے ورثہ میں نہیں دیئے جا سکتے، لوگو! جاگو! ہمیں بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ یہ کچھ کرنے کا وقت ہے، کچھ کرنے کا، اس کا یہ کہنا تھا کہ طلبا کا جلوس بے ساختہ کچھ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ سڑک کے کنارے تین سرکاری بسیں کھڑی تھیں، وہ ان کی طرف لپکے، پل بھر میں بسوں سے شعلے نکلنے لگے، طلبا واقعی کچھ کر رہے تھے۔

پولیس نے لاٹھی چارج کیا، آنسو گیس چھوڑی۔ میرے قریب کھڑے چند آدمیوں نے زمین سے پتھر اٹھا کر پولیس کی طرف پھینکے۔ چند پولیس کے سپاہی اور کچھ ہجوم کے لوگ زخمی ہو گئے۔ ان کے

سروں سے خون بہہ رہا تھا۔ میں تماشا دیکھنے میں مصروف تھا۔ مجھے یکدم محسوس ہوا کہ میں غلط جگہ پر کھڑا ہوں یہاں گڑبڑ ہو سکتی ہے، اتنے میں گولی چلی اور افراتفری مچ گئی۔ میں الٹی سمت بھاگنے ہی والا تھا کہ پولیس کے ایک سپاہی نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ میں نے بازو چھڑانے کی ناکام کوشش کی مگر اس کی گرفت مضبوط تھی وہ بولا "تم پتھر مار رہے تھے" میں چلا اٹھا "خدا کی قسم میں نے پتھر نہیں مارا" چند منٹوں میں سارا چوک سنسان ہو گیا۔ تین بسیں جل رہی تھیں اور کوئی آگ بجھانے کی کوشش نہ کر رہا تھا۔ دس بارہ طلباء، پانچ لڑکیاں اور دو تین میری طرح کے مزدور گرفتار کر لئے گئے تھے پولیس ہمارے ارد گرد گھیرا باندھ کر کھڑی تھی۔ ایک پولیس وین آئی اور ہم سب کو اس میں بٹھا کر تھانہ لایا گیا۔ قسمت کہاں سے بچا کر لائی اور کس اتفاق سے پکڑا گیا۔ کبھی اپنے آپ کو کوستا کبھی اپنی بد قسمتی پر افسوس کرتا اور کبھی اس سارے ڈرامے پر مسکراتا۔ آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ سب کچھ قسمت پر چھوڑ کر میں نے مزید سوچنا بند کر دیا۔ بے جا فکر سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سب کا باری باری رجسٹر پر نام و پتہ نوٹ کیا جانے لگا۔ میری باری سب سے آخر میں آئی اس وقت تک میں نے تمام جواب سوچ لئے تھے۔ فضل دین ولد احمد دین مکان نمبر ۱۴۰۷ مٹیا محل نزد جامع مسجد دہلی، میرا پیشہ محنت مزدوری، یہ لکھوانے کے بعد میں نے تھانیدار کی بڑی منت سماجت کی کہ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ میں نے کوئی پتھر نہیں مارا، میں تو مزدوری کی تلاش میں نکلا تھا چوک سے آگے جلوس کی وجہ سے نہ جا سکا۔ ایک سپاہی مجھے ذرا پرے لے گیا اور بولا کہ پچاس روپوں سے کام بن سکتا ہے۔ میری جیب میں ایک روپیہ چند پیسے تھے۔ میں نے اسے اپنی غربت کی کہانی سنائی اور اس سے رحم کی استدعا کی، پولیس اور رحم دو متضاد چیزیں ہیں وہ بولا "میں تمہارے ساتھ گھر جانے کے لئے تیار ہوں، اگر جیب میں روپے نہیں تو گھر سے لے کر دے دینا" کس کے گھر سے؟ کون سے گھر سے؟ جان چھڑانے کے لئے پچاس روپے تو کوئی رقم نہیں تھی مگر وہ پاجی کیا جانتا تھا کہ میرا گھر تو سرحد پار تھا۔ وہاں ہوتا تو پچاس نہیں پانچ سو بھی دے کر جان بچا لیتا۔ میں نے ملتجیانہ انداز میں کہا "سنتری جی! میرے گھر پر پھوٹی کوڑی نہیں لیکن

مجھ پر یقین کرو اور صرف سات روز کی مہلت دو میں خود بخود تھانے آکر پچاس کی جگہ اکاون روپے ادا کر جاؤں گا،، میری آزادی کی قیمت صرف پچاس روپے تھی، اس آزادی کے لئے تو میں پچاس ہزار بھی ادا کرنے کے لئے تیار تھا، اگر اس سپاہی کو معلوم ہوتا کہ میں کون ہوں تو کبھی پچاس روپے نہ مانگتا۔ وہ تو صرف بے گناہ ہونے کی قیمت مانگ رہا تھا۔ میری سوچنے کی قوت نے بالکل جواب دے دیا تھا۔ وہ مجھے حوالات کے دروازے کے قریب لایا۔ تو معلوم نہیں کس نے اور کیوں مجھے یہ کہنے کی تلقین کی "سنتری جی مجھے گھرلے چلو۔ میں کسی ہمسایہ سے رقم لے کر ادا کر دوں گا،، سنتری تھانیدار کے پاس گیا لوٹا اور مجھے ساتھ لے کر تھانے سے باہر آگیا۔ جاتی ہوئی ایک ٹیکسی کو روکا۔ ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ سنتری نے ٹیکسی والے کو مٹیا محل جانے کے لئے کہا پورا راستہ میں خیالوں میں غرق طرح طرح کے منصوبے بنا رہا تھا۔ ٹیکسی رُکے تو میں کسی گلی میں بھاگ نکلوں گا اس کے علاوہ تو اور کوئی راہ نظر نہ آتی۔ کن عجیب حوادث کا شکار ہو گیا تھا۔

کچھ گرمی اور اس سے زیادہ گھبراہٹ اور اضطراب سے پسینہ تھوک کے بھاؤ بہہ رہا تھا ٹیکسی والے کے سوال نے یک دم مجھے چونکا دیا،، یہاں سے کس طرف،، سپاہی نے دوہرایا کس طرف یہ تو مجھے بھی علم نہ تھا۔ میں اس سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ مگر میرے اندر کسی پنہاں قوت نے جیسے میرے منہ میں جواب ڈال کر زبان کو حرکت کرنے کا حکم کیا ہو،" سامنے کھمبے سے الٹے ہاتھ مڑ جاؤ" الٹے ہاتھ؟ ٹیکسی ڈرائیور نے حیران ہو کر پوچھا،" یہ سڑک تو آگے بند ہے،، کتنا غلط جواب میں نے دیا تھا۔ نہ ہی میں نے پہلا جواب دیا تھا اور نہ ہی میں کچھ اور کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری زبان میرے کنٹرول میں نہیں تھی۔ وہ پھر بے ساختہ ہلی اور میں نے اپنے کو کہتا سنا، میں جانتا ہوں الٹی طرف سڑک سامنے سے بند ہے اسی لئے سیدھے ہاتھ مڑنے کیلئے کہا ہے۔ میں یہاں کا رہنے والا ہوں، چپے چپے سے واقف ہوں۔" ڈرائیور نے بڑبڑاتے ہوئے ٹیکسی کو سیدھے موڑتے ہوئے پوچھا" گلی کا نمبر کیا ہے؟ نمبر کا فکر مت کرو۔ سیدھے چلتے جاؤ آہستہ کرو۔ یہاں سے سیدھے اور سامنے والے موڑ سے پھر سیدھے.... آہستہ آہستہ بس اس

سامنے والے سبز کھڑکیوں والے مکان کے پاس روک لو" ٹیکسی رک گئی، ہم ٹیکسی سے اترے سپاہی نے ٹیکسی والے کو ایک طرف انتظار کرنے کے لئے کہا۔ اس نے بڑے ملتجیانہ لہجے میں اجازت کی درخواست کی۔ مگر سنتری نے اسے ذرا غصّے سے بک بک بند کرنے کو کہا۔ اس طرف سنتری جی اور ہم دونوں ایک گلی میں چل دیئے۔ میں نے رازدارانہ انداز میں سنتری سے کہا" میں آپ کو اپنے چچازاد بھائی کے گھر لے چلا ہوں۔ دعا کریں وہ گھر پر ہو، وہ کھاتا پیتا آدمی ہے اس سے رقم ملنے کی توقع کر سکتا ہوں"۔ جیب سے میں نے چار مینار کی ڈبی نکالی۔ سگریٹ سنتری کو پیش کیا اور ایک خود منہ میں دبا لیا۔ سگریٹ سلگائے، ذرا لمبا کش لگایا اور یہ سوچنے لگا کہ میں سامنے گلی کے چوراہے سے مڑتے ہی بھاگ نکلوں۔ چوراہے میں مڑا تو ٹانگیں بھاگنے سے معذوری کا اظہار کرنے لگیں۔ غیر ارادی طور پر بائیں طرف مڑا پھر دائیں۔ سامنے ایک معمولی ساخت کے مکان کے باہر بورڈ آویزاں دیکھا۔ جس پر عبدالرزاق چشتی لکھا تھا۔ اس کے قریب آہستہ ہوا، دروازے کے اندر ایسے گھسا جیسے واقعی میرے چچازاد بھائی کا گھر ہو، اندر گھستے ہی بائیں ہاتھ بیٹھک دکھائی دی۔ جس کے دروازے پر ایک آٹھ نو سال کا لڑکا کھڑا تھا۔ "ابو گھر پر ہیں"، میں نے بلند آواز سے پوچھا۔ لڑکے نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔ ساتھ ہی اندر سے زنانہ آواز "شمشو کون ہے" شمشو بغیر جواب دیئے اندر چلا گیا۔ میں نے سنتری کو اندر آنے کے لئے کہا اور بیٹھک میں بٹھایا اتنے میں لڑکا واپس آیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ کوئی سوال کرتا۔ میں نے کہا "شمشو بیٹا! امی کو کہو کہ یہ سنتری جی جو آپ کے ابو کے دوست ہیں، ان سے ملنے آئے ہیں"، ساتھ ہی ایک روپیہ کا نوٹ اسے دیتے ہوئے کہا "جاؤ کوکا کولا کی ایک بوتل لاؤ اور ساتھ برف بھی لانا"۔ لڑکے نے ایک روپیہ مجھ سے لے لیا اور کچھ کہے بغیر باہر کے دروازے سے گلی کی طرف دوڑ گیا۔

میں نے سنتری سے کہا" آپ دو منٹ یہاں بیٹھیں میں ابھی روپے لے کر آتا ہوں" یہ کہہ کر میں گلی میں آیا اور اسی راستہ سے واپس ٹیکسی والی جگہ پر پہنچا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے میں نے ڈرائیور سے کہا "چلو مجھے وہیں اتار کر یہیں آجاؤ اور سپاہی کا انتظار کرو۔ وہ تھوڑی میں واپس

آرہا ہے۔ ڈرائیور نے چند موٹی موٹی گالیاں سپاہی کو دیں اور ٹیکسی چل پڑی۔ ایک میل کے بعد میں نے ڈرائیور کو ٹیکسی روکنے کے لئے کہا۔ اترا اور ایک بازار سے ہوتا ہوا اور کئی گلیوں سے گزرتا ہوا اُس جگہ سے کہیں دُور جا نکلا میں نہیں جانتا تھا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ بس ایک سمت میں دُور نکل جانا چاہتا تھا۔ ہر قدم پر خدا کا شکر ادا کرتا چلا جا رہا تھا۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ بڑا مہربان بڑی بخشش والا۔ یونہی کبھی چلتا۔ کبھی ٹھہرتا۔

شام ہونے کو تھی۔ میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ رات کہاں اور کیسے گزارنی ہے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو کچھ پچیس پیسے تھے، زندگی میں پچیس پیسوں کی مجھے کبھی اتنی قدر نہ ہوئی ہوگی۔ میرے لئے یہ پانچ سو روپوں سے کم نہ تھے۔ دلی بہت بڑا شہر ہے اس میں لاکھوں لوگ رہتے ہیں۔ ہر طرح کے لوگ، میرے جاننے والے لوگ، میرے چاروں طرف تھے۔ اس کے باوجود میں دو دفعہ گرفتار ہوتے ہوتے بچا۔ اس یاس کے عالم میں سگریٹ کے چند کش میرے دل کا پورا اضطراب دھوئیں کے ہمراہ باہر اٹھا پھینکے۔ سگریٹ میرا ساتھی تھا جب یہ ختم ہو جاتا تو میں یہ محسوس کرتا کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔

گلی کے اندر ایک جگہ پر ایک بھٹیارن مکئی کے دانے بھُن کر بیچ رہی تھی۔ میں نے دس پیسے کے گرم گرم سفید مکئی کے دانے خریدے، انہیں کھاتا، بازار کا نظارہ کرتا ایک انجان سمت بڑھتا چلا گیا۔ رات پہلی رات کی طرح ایک فٹ پاتھ پر لیٹ کر گزاری، سخت تھکا ہوا تھا، اس ننگے فرش پر جو میٹھی نیند آئی شاید عمر بھر نرم نرم بستر پر بھی نہ آئی ہو۔ زندگی میں انسان کی ضرورت کتنی کم ہیں۔ وافر ضروریات زندگی کو کتنا مشکل بنا دیتی ہیں۔ میرے ساتھ فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے سینکڑوں لوگ زندگی کی آسائشوں سے ناواقف تھے اور ان کی یہی ناواقفیت ان کے سکون کا باعث تھی۔

ابھی چند روز میں نے اسی شہر میں گزارنے تھے۔ آئندہ صبح میں نے کی سیر شروع کی ایک دوکان پر ایک آدمی پرتاب اخبار دوکان کے تختہ پر بیٹھا ہوا پڑھنے میں مگن تھا،

پ چلتے چلتے میں رکا۔ ایک نظر اخبار پر دوڑائی۔ بڑی سرخی کچھ یوں تھی "بھٹو اندرا ملاقات جون کے آخر میں شملہ میں ہوگی۔ ذرا نیچے چند چھوٹی چھوٹی تصویریں تھیں۔ اور ان کے ساتھ یہ سُرخی تھی، "گوالیار کیمپ سے پاکستانی افسروں کا فرار" اور اس کے نیچے سرنگ کھود کر فوجی فرار ہو گئے" ذرا نزدیک سے میں نے دیکھا تو ان تصویروں میں میری تصویر بھی تھی۔ باقی میرے ساتھی افسروں کی تھیں، میرے سارے جسم سے جھری جھری سی گزر گئی۔ یہ نئی آفت تھی۔ ایک دم مجھے محسوس ہونے لگا کہ ہر گزرنے والا میرے چہرے کو گھورتے ہوئے گزر رہا ہے۔ جیسے ہر کوئی میری تلاش میں ہو، جیسے ہر گزرنے والے نے اخبار میں یہ خبر پڑھی ہو، منہ چھپانے کے لئے بھی میرے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایک گلی میں گھسا۔ قمیض اتار کر نیچے پہنی۔ بنیان اتاری قمیض پھر پہن لی اور بنیان کو تہہ کر کے منہ پر رکھا، اب میں بازاروں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کسی ویرانے کی طرف، جامع مسجد کے مینار مجھے دور سے دکھائی دیئے۔ چلتے چلتے میں شہر سے ذرا باہر کی طرف پہنچا۔ سڑک کے کنارے کئی حجام بیٹھے تھے۔ ایک کے پاس میں نے رک کر پندرہ پیسے دیئے کہ سر پر استرا پھیر دے، اس نے مزید دس پیسوں کا مطالبہ کیا۔ میں نے اسے کہا کہ بس اتنے ہی ہیں۔ ٹنڈ کرنی ہے تو کرو۔ اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا، سر پر اُسترا پھیرا تو میرے تمام بال جھولی میں آن رہے۔ میں نے اُسے مونچھیں مونڈھنے کے لئے کہا۔ باتیں بناتے ہوئے اس نے بادل نخواستہ مونچھیں بھی اڑا دیں پھر کہنے لگے۔ اب کہو گے اس رقم میں شیو بھی بنا دوں، میں نے کہا بس شکریہ اور وہاں سے چل دیا۔ سڑک کے اس پار ایک جنازہ جا رہا تھا۔ میں نے ذرا لمبے قدم لئے سر پر بنیان باندھی اور اس میت کے پیچھے جانے والے لوگوں میں شامل ہو گیا، وہ بڑی خاموشی سے چلتے جا رہے تھے۔ میں نے بلند آواز میں درُود شریف پڑھنے کو کہا۔ اسی طرح ہر چند قدموں کے بعد دُرود شریف پڑھتے اور باری باری میت کو کندھا دیتے ہم جنازہ گاہ آپہنچے۔ جنازے کی نماز پڑھی اور پھر میت کو دفن کر دیا گیا۔ جنازے کے ساتھ آنے والے تمام لوگ واپس جانا شروع ہو گئے۔ سب چلے گئے صرف میں باقی رہ گیا، میں پاس والی مسجد میں گیا جہاں نماز جنازہ ادا کی تھی۔ امام مسجد

سے قرآن مجید لیا اور اسی قبر پر آن کر بیٹھ گیا۔ قرآن شریف کھول کر سامنے رکھ لیا۔ پڑھنے میں دل کہاں تھا، وقت گزارنے کے لئے مجھے اس سے زیادہ موزوں جگہ دکھائی نہ دیتی تھی، پورا دن وہیں گزارا، وضو کر کے ظہر اور عصر کی نمازیں ادا کیں۔ شام ہوئی تو مسجد میں آ بیٹھا۔ امام مسجد کے لئے کوئی بچہ کھانا لے کر آیا، مجھے بھی انہوں نے دعوت دی۔ بھوک سے انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ خوب سیر ہو کر کھانا کھایا، حلوہ بھی تھا وہ بھی چٹ کیا۔ مولوی اشرف الزماں سے کچھ دوستی بڑھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ان کو میں نے بتایا کہ یہ مرنے والا میرا عزیز ترین دوست تھا۔ چند روز اس کی تربت پر گزاروں گا۔

قبرستان کے ماحول میں سکون ملا۔ ہر انسان کی دنیا میں آخر منزل قبر ہے۔ انجام مٹی ہے پھر بھی وہ زمین پر کتنی اکڑ دکھاتا ہے۔ اسی جسم کے لئے کیا کچھ کرتا ہے اور اسی جسم کے لئے زندگی کے سنہری اصولوں کو بھینٹ چڑھاتا ہے۔ آخر میں اس جسم کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اصولوں پر مبنی زندگی گزارنے والا شخص قبر میں جا کر اپنے اعمال پر کبھی نہیں پچھتاتا۔ اس شہر خموشاں میں امیر و غریب چند گز کے کفن میں لپٹے ہوئے زمین کے نیچے۔ کسی کو بھی اس کی دولت اس تاریک قبر سے نہ بچا سکی زندگی کی اور خود اپنی حقیقت ان خیالات کے ساتھ زیادہ صاف طور پر ظاہر ہوئی۔

مجھے وہاں کوئی گھورنے والا نہیں تھا، جگہ بالکل محفوظ تھی۔ اس کے علاوہ ان خیالات کی وجہ سے رہا سہا ڈر اور گھبراہٹ دل سے بالکل نکل گئی۔ سارا بوجھ ہلکا پڑ گیا۔ اطمینان اور سکون سا ہونے لگا۔ قرآن کے مطالعہ اور خدا کی عبادت میں دل و جان کی تمام تر توانائی مرکوز کر دی نمازیں خدا سے ایسا رشتہ قائم ہوا جیسا اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا، دو دن یونہی گزر گئے پانچوں وقت نماز مسجد میں با جماعت ادا کرتا۔ امام مسجد کے ساتھ طعام کا بندوبست ہو جاتا۔ رات مسجد میں سو کر اور عبادت کر کے گزارتا۔ خیال تھا کہ چند روز وہاں گزارنے کے بعد وہاں سے چل نکلوں گا۔ مولانا سے بھارت میں مسلمانوں کی حالت پر بھی تبادلۂ خیال ہوا، انہیں پاکستانی فوج کے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے کا سخت غم تھا۔ کیونکہ پاکستانی فوج سے ان کی امیدیں وابستہ

تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس شکست کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی مسلمانی کے اصولوں اور روح کو چھوڑ کر محض رسمی مسلمانی اختیار کر رکھی ہے۔ نظام دین اور فضل دین نام رکھنے سے آدمی مسلمان نہیں بنتا۔ قرآن کے احکام پر عمل کرنے سے اسلامی تقاضوں کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کافی نیک دل انسان تھے پھر بھی میں نے مناسب نہ سمجھا کہ ان سے اپنا راز بیان کروں۔ کیونکہ میں انہیں اپنا راز بنا کر ان کی اور ان کے خاندان کی زندگیاں خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

مولانا نے ایک شام مجھے بتایا کہ شہر میں طلباء اور پولیس کی کئی جھڑپیں ہوئیں۔ تین مرتبہ گولی بھی چلی تھی، آٹھ طالب علم مارے گئے ہیں۔ آئندہ روز ایک طالب علم کا جنازہ وہاں آیا۔ اس جنازے کے ساتھ بہت بڑا جلوس تھا۔ جلوس والے حکومت کے خلاف نعرے لگا رہے تھے ان کو آتے دیکھ کر میں نے قرآن مجید الماری میں رکھا۔ جب میت مسجد کے باہر لائی گئی تو میں اس ارادے سے باہر آیا کہ ان کے ساتھ مل کر نماز جنازہ ادا کروں گا۔ ہجوم کے بیچ سے گزر کر اُن کے عقب کی طرف آیا اور ایک طرف کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد میں نے بائیں طرف نظر گھمائی تو میرے پہلو میں ایک جانی پہچانی صورت کا ایک آدمی دکھائی دیا اُسے دیکھتے ہی مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا، میں اس صورت کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا، مگر دل کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کاش یہ شکل اس شخص کی نہ ہو، اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا، یہ وہی پولیس کا سپاہی تھا جسے میں اپنے چچا زاد بھائی کے گھر بٹھا آیا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑانے کی کوشش کی مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ میں نے زور سے چلانا شروع کیا "کہ یہ پولیس مین مجھے مار رہا ہے" پولیس مین نے شور مچا کر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر طلبا کا ایک گروہ اُس پر ٹوٹ پڑا۔ دوسرے پولیس مینوں نے لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ میں وہاں سے بھاگا تو چند پولیس مین میرے پیچھے بھاگے، پھر ایک لمبی دوڑ ہوئی، میں بھاگ بھاگ کر تھک چکا تھا۔ دو تین سو گز مجھ سے دور پولیس مین میرا پیچھا کر رہے تھے۔ قریب تھا کہ تھک کر ہمت ہار دوں اور زمین پر گر پڑوں اور اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں کہ کسی فرشتے

کی آواز کی طرح بائیں طرف مکانوں کے عقب سے ریل کے انجن کی کوک سنائی دی۔ جیسے سنتے ہی ٹانگوں میں نئی قوت اور دل میں نئے عزم نے بے ہمتی اور تھکاوٹ نکال کر جگہ لی۔ بائیں طرف مڑا تو ایک مال گاڑی جا رہی تھی۔ میں بھاگا اور چلتی گاڑی کے ایک ڈبہ سے جس کی چھت نہیں تھی اور جس میں لکڑیاں بھری تھیں لٹک گیا۔ تھوڑا زور لگا کر اُوپر آن چڑھا اور ایک کونے میں دبک کر نیچے بیٹھ گیا۔ گاڑی چلتی رہی، زندگی کی اونچ نیچ کی کہانیاں پڑھی تھیں، پہلے کبھی ان سے دو چار ہونے کا موقع نہ ملا تھا، اب ہر قدم پر اور ہر روز اونچ نیچ پیش آ رہی تھی۔ چند گھنٹے امید اور سکون میں گزرتے اور پھر ان کی جگہ نا امیدی اور خطرہ لے لیتا۔ یوں چند ماہ سے ہوتا آ رہا تھا۔ خطرے اور نا امیدی میں گھر کر نکلنے کے بعد جو تسلی ہوتی ہے اور جو سکون ملتا ہے، میں وہ سکون اور تسلی ان لکڑیوں سے بھرپور مال گاڑی کے ڈبے میں چھپا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے ان خطرات اور ان نا امیدیوں کے بغیر زندگی پھُس پھُسی ہو، بے مرچ اور بے نمک سالن کی طرح بے مزہ، زندگی کی چٹپٹاہٹ کے لئے یہ خطرات یہ نا امیدیاں اور یہ ساری کشمکش ضروری ہے۔ آدھ گھنٹہ کے قریب میں وہاں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر میں نے لکڑیوں کو ادھر ادھر ہٹایا، گاڑی کی تہہ میں جگہ بنائی، اُوپر لکڑیاں یوں رکھیں کہ نیچے چھپ کر لیٹ سکوں اور اُوپر سے دیکھا نہ جا سکوں۔

اس گاڑی سے اب میری منزل وابستہ تھی۔ جہاں یہ لے جائے گی وہاں چلا جاؤں گا۔ بمبئی، مدراس، کلکتہ، امرتسر، انبالہ، لدھیانہ یا فیروزپور۔ یہ تو میں نہ جانتا تھا کہ گاڑی کس طرف جا رہی ہے۔ تین گھنٹوں کے بعد گاڑی ایک سٹیشن پر رُکی۔ باہر کافی شور تھا، مگر کچھ سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں، پھر میں نے سُنا جیسے کوئی کسی سے کہہ رہا ہو" کسی نے اُسے گاڑی سے لٹکتے دیکھا تھا"، پھر آواز آئی "سب ویگنوں کو چیک کرو" یہ سنتے ہی میرا خون خشک ہو گیا۔ شاید قسمت میں نہیں کہ پاکستان پہنچوں، جو خدا کو منظور ہے وہی ہو گا، لیٹے ہوئے میں پُورے دل و جان سے خدا کے سامنے سربسجود تھا۔ اور گڑگڑا کر اُس سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ اے اللہ مجھے اپنے کمال فضل و کرم سے اس مصیبت سے بھی نجات دے، مگر شاید خدا اس وقت لوگوں کی دعائیں

سن سن کر تھک چکا تھا کیونکہ میری دعاؤں کے عرش پر پہنچنے سے پہلے ہی چند آدمی میرے والی ویگن میں آن گھسے اور اُوپر سے لکڑیاں پرے کر کے نیچے دیکھنے لگے۔ میں نے نا امیدی کے عالم میں اپنے دل کو تسلی دی کہ آخر میرے یہاں سے پکڑے جانے میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ خدا کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر جیسے اللہ تعالےٰ مجھ سے ہمکلام ہو کر کہہ رہا ہو بے وقوف! مجھ سے نا امیدی گناہ ہے، میں کسی کی ہمت اور محنت کو رائگاں نہیں جانے دیا کرتا۔ نہ ہی میں اپنی مخلوق کی دعاؤں کو سُن سُن کر تھکتا ہوں۔ میں نے ہر عمل کے انجام کے لئے منصفانہ اصول بنا رکھے ہیں، میرے پورے نظام میں ذرا بھر بھی کسی سے نا انصافی نہیں ہوتی" میں نے پوچھا "میرے خدا پھر بتا کر یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ یہ لوگ لکڑیاں کیوں اٹھا رہے ہیں، چند اور لکڑیاں اٹھائیں گے تو مجھے ڈھونڈ پائیں گے۔ کیا یہی تیرا انصاف ہے" اس کے جواب میں کسی نے کہا "کیا بے وقوفوں کی طرح لکڑیاں اٹھا رہے ہو، چھوڑو یہاں کوئی نہیں اور وہ سب ویگن سے نیچے اُتر گئے! خدا کی رحمت سے مایوس ہونا واقعی گناہ ہے، یہ کوئی معجزہ نہیں تھا۔ خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کی ایک جھلک تھی، ہمت اور محنت کا پھل وہ ضرور دیتا ہے، گاڑی چلی تو میری جان میں جان آئی۔ گرمی اس قدر زیادہ تھی کہ میں پسینے میں شرابور پڑا تھا۔ شام ہوئی اور پھر اندھیرا بڑھا تو ٹھنڈی ہوا کھانے کے لئے میں نے لکڑیاں ہٹا کر سر باہر نکالا۔ ستارے آسمان پر ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مشغول تھے، چاند مجھے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ میں یونہی گم سُم بیٹھا اپنی خوش قسمتی پر خوش ہو رہا تھا انسان کی زندگی میں قسمت کا کتنا بڑا ہاتھ ہے، کہنے کو تو کہتے ہیں کہ انسان خود اپنی قسمت اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے مگر میں اب اس گاڑی میں بیٹھا جس طرف لیجایا جا رہا تھا۔ نہ تو اس میں میرا کوئی ہاتھ تھا اور نہ ہی میں نے ایسا کوئی ارادہ کیا تھا۔ یہ سب قسمت کا کھیل تھا۔ ماضی قریب کے حالات سے میں اپنی قسمت کے کردار پر قانع تھا۔ اس قسمت کی ٹرین پر میں نے وہاں تک جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جہاں تک یہ مجھے لے جائے۔ گاڑی کہیں ٹھہرتی تو میں نیچے چھپ جاتا

ورنہ لکڑیوں کے اوپر بیٹھا چاندنی میں ارد گرد کے دھندلے مناظر دیکھتا اپنی ہی دنیا میں محو تھا قطب تارے کی مدد سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ گاڑی جنوب کی طرف جا رہی ہے۔ یعنی میری منزل کا رُخ شمال کی طرف سے بدل کر جنوب کی طرف ہو چکا ہے۔ میں پاکستان سے پرے ہٹ رہا تھا۔ دُور پہاڑ سا دکھائی دیا جن پر بجلیاں ٹمٹما رہی تھیں، یہ پہاڑ..... ہاں اس پر تو قلعہ سا ہے..... اگرچہ دل کو بے حد ناپسند سا لگا مگر مجھے اُسے بتانا ہی پڑا کہ یہ گوالیار کا قلعہ ہے۔ میں تین دن کی مسافت اور کشمکش کے بعد واپس گوالیار آن پہنچا تھا۔ زمین واقعی گول ہے۔ مال گاڑی بغیر گوالیار ٹھہرے آگے بڑھ گئی۔ جھانسی آدھی رات کے وقت پہنچی۔ آدھ گھنٹہ ٹھہری۔ صبح کے وقت بھوپال پہنچی۔ مختصر یہ کہ مزید دو دن میں نے اس مال گاڑی میں گزارے، بھوک سے اگرچہ جان نکلی جا رہی تھی مگر میں نے اپنی پناہ گاہ کو ترک کرنا مناسب نہ سمجھا۔ گاڑی بمبئی آن پہنچی۔ یارڈ میں شام کے وقت اتر کر ریلوے کی کئی لائنوں کو پار کیا اور بھارت کے اس بہت بڑے شہر میں آن پہنچا۔

سڑک کے کنارے ایک سفید پوش معزز آدمی ایک ہاتھ میں ہلکا اٹیچی کیس اور دوسرے میں ذرا بھاری بستر اٹھائے جاتے دکھائی دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا "جناب میں اٹھا کر لے چلوں؟" "کیا لو گے؟" اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ "جو آپ کی مرضی" میں نے بڑے احترام سے جواب دیا۔ "ایک روپیہ دوں گا۔ ریشم گنج جانا ہے۔" "مجھے منظور ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے بستر اور اٹیچی کیس اٹھا لیا۔ سڑک پر بڑی چہل پہل تھی مگر جلد ہی اس نے ایک گلی میں مڑنے کو کہا۔ اندھیرے راستے سے گزرتے ہوئے ہم ایک گندے نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ سفید پوش کافی عمر رسیدہ تھا، اور شاید وہ ہندو تھا، دل میں آئی کہ اس کا سامان لے بھاگوں، کیونکہ وہ بھاگ کر مجھے پکڑنے کی ہمت نہیں رکھتا فرار کی کوشش میں جنگی قیدی کے لئے جینوا کنونشن کے تحت چوری کرنا، بے ٹکٹ سفر کرنا سب جائز ہے۔ پھر خیال آیا کہ اس بوڑھے نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ یہ بددیانتی ہو گی۔ لیکن یہ چھوٹی سی چوری تو میں کسی لالچ کے تحت تو نہیں کر رہا تھا بلکہ ضرورت کے لئے تھی، ایسی ضرورت جو فرض کی ادائیگی کے لئے تھی، میرا مقصد بلند تھا۔ اس کے علاوہ قانون کی نظر میں بھی کوئی مجھے مجرم قرار نہ

دے سکتا تھا۔ ایسی بات جو میں فخریہ طور پر بآواز بلند دوسروں کو کہہ سکتا تھا وہ بری نہ ہو سکتی تھی۔ اس بات پر مجھے کوئی نہ کوسے گا۔ میرا ضمیر صاف تھا، پاکستان پہنچنے کے بعد میں بھارت کے کسی اخبار میں اشتہار دے کر یا اگر اٹیچی کیس میں کسی چیز سے اس کا پتہ معلوم ہو سکا تو اس کو ہرجانہ ادا کر دوں گا۔

یہ سب خیالات چند لمحوں میں میرے دماغ میں آئے۔ سامنے چوراہا تھا۔ پرانی طرز کا محلہ تھا۔ میں نے بستر زمین پر رکھا اور اٹیچی کیس لے کر ایک طرف کو بھاگ نکلا۔ اس سفید پوش نے شور مچانا شروع کیا۔ لیکن میں یہ جا وہ جا گلیوں سے مڑتا مڑاتا پھر بارونق بازار میں آ گیا۔ سڑک عبور کی اور وہاں سے دو اڑھائی میل ایک طرف کو آن نکلا۔ ایک بس سٹینڈ پر رکا۔

وہاں بنچ پر بیٹھ کر میں نے اللہ کا نام لے کر اٹیچی کیس کھولا۔ خدا کرے کچھ کام کی چیز نکل آئے دس بارہ روپے بھی کافی ہوں گے۔ صاف ستھری دھوبی کی دھلی ہوئی تین قمیضیں، دو پاجامے، جراب کا جوڑا، ایک پالش شدہ گرگابی۔ جوتے کے نیچے ایک رومال میں بندھی ہوئی کوئی چیز تھی، میں نے رومال کھولا تو ہکا بکا رہ گیا۔ خدا دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ سو سو اور دس دس روپے کے نوٹوں کی چند گڈیاں تھیں۔ چند ہزار روپے تھے۔ اتنے روپوں کو لے کر میں کیا کروں گا، کہاں سنبھالوں گا۔ یہ اتنی بھاری رقم تو میری مشکلات میں اضافہ کر دے گی۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میں اپنے لئے مشکلات کا پلندہ چرا لایا ہوں۔ جی میں آیا کہ اس میں سے چند نوٹ نکال کر اٹیچی کیس کو یہیں چھوڑ کر چلتا بنوں، مگر ایسا کرنے کا بھی حوصلہ نہ پڑا، شاید یہ کہیں کام آ جائیں، خدا نے سبب بنایا ہے، میری نیت تو صاف ہے۔ سب پھل نیت کا ہے۔ یہ میری قسمت میں لکھا تھا۔ دو چار سو کے اور دس بارہ دس دس کے نوٹ میں نے نکالے، قریب ایک سینما تھا جس میں فلم پاکیزہ لگی ہوئی تھی، شو جاری تھا میں اس کے ایک غسلخانے میں جا گھسا۔ سینما کے اندر گانا لگا تھا "جھمکا گرا رے بریلی کے بازار میں" میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ اٹیچی کیس سے کپڑوں کا جوڑا نکال کر زیب تن کیا۔ جوتے پہنے سر پر کھدر کی ٹوپی جمائی، شیو کا سامان نکال کر شیو بنائی۔ پرانے کپڑے اٹیچی کیس میں رکھے، سامنے دیوار پر قد آدم شیشہ لگا تھا اس میں جھانکا تو آئینے میں نظر آنے والے کی شکل کو دیکھ کر پہچان نہ سکا، کافی شریف اور سادہ لوح

انسان معلوم ہوتا تھا۔ بڑے یقین کے ساتھ باہر نکلا۔ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر بھنڈی بازار آن پہنچا۔ میں اس سے پہلے کبھی بمبئی نہ آیا تھا۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ بھنڈی بازار مسلمانوں کا محلہ ہے۔ ایک اوسط درجے کے ہوٹل کے سامنے ٹیکسی والے نے مجھے اتارا۔ یہ ہوٹل عمر خیام تھا۔ ایک صاف ستھرہ کمرہ لیا۔ بیرا کو کھانا لانے کے لئے کہا۔ مرغ، بتیجن اور گرما گرم روغنی نان تناول کئے، چائے کی ایک پیالی چڑھائی نماز ادا کی۔ اس انداز اور اس خلوص سے نماز ادا کی کہ اللہ میاں کو اپنی مہربانی کا شکریہ قبول کرتے EMBARASMENT محسوس ہونے لگے۔ پانامہ سگریٹ کی چار ڈبیاں منگوائیں، بیرا کو دس روپے انعام دیئے۔ بیرا جس کا نام مستی تھا کافی بامذاق اور ہوشیار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اتنا انعام پاکر شاید وہ مجھے غلط سمجھا، کہنے لگا، "صاحب! کیوں صاحب کچھ نوش کیجئے گا؟" میں نے نفی میں جواب دیا۔ "رات کو اکیلے ہی سوئیں گے؟" اس نے سوال کیا، میں نے پوچھا کیا مطلب "یہی کسی چھپن چھین کا بندوبست کر دوں"۔ مجھے سخت غصہ آیا، میں نے سختی سے اسے بک بک بند کرنے کو کہا۔ وہ مجھ سے معافی کا خواستگار ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید یہ زیادہ شرفاء کا ہوٹل نہیں، یا آج کے پیسے والے ہوٹلوں میں زندگی کے دن شرافت کے پردے کے پیچھے عیاشی میں گزارتے ہیں، ورنہ اس بیرے کو ایسا سوال پوچھنے کی جرأت کیسے ہوسکتی تھی۔ ماڈرن سوسائٹی کس قدر گر چکی ہے۔ عورت کا جسم چند سکوں کے عوض دال کی پلیٹ کی طرح اتنی آسانی سے کھلے بازار میں بک جاتا ہے اور انسانی ضمیر کو خلش تک محسوس نہیں ہوتی، یہی سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

صبح دیر سے اٹھا۔ مستی ناشتہ لے آیا۔ نرم اور گداز بستر پر سو کر ساری تھکاوٹ کافور ہو چکی تھی، صرف ایک خیال کچھ بے چینی پیدا کر رہا تھا کہ اس سفید پوش کا اٹیچی کیس لے کر رفوچکر ہونے میں شاید میں نے اپنی زندگی کے اصولوں کی پامالی کی تھی، آرام کی رات گزارنے، پیٹ بھر کر مزیدار کھانا کھانے کے باوجود دل میں وہ مسرت محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ جو مجھے اپنی اس کامیابی پر محسوس ہونی چاہیئے تھی میں نے مستی سے اخبار منگوایا۔ سارا پڑھا، خیال شاید میری اس چوری کے بارے میں کچھ خبر ہو، مگر کوئی نہیں تھی۔ تیار ہو کر باہر آیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو میرین ڈرائیو لے جانے کو کہا ٹیکسی کا ڈرائیور

سرجیت سنگھ کافی گھاگ قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا، باتوں باتوں میں میں نے محسوس کیا کہ وہ کافی کام کا آدمی ہے، مجھ سے اس نے سوال کیا، کیا دھندہ کرتے ہیں" "مندہ دھندہ ہے" میں نے جواب دیا "کویت جانے کا خیال ہے، کیا کچھ مدد کر سکتے ہو" "کویت تو بہت نزدیک ہے جی۔ کہیں تو امریکہ کا بندوبست کر دیں" مجھے تو جیسے الہ دین کا چراغ مل گیا تھا، میرے پاس پاسپورٹ نہیں، اگر پاسپورٹ ہوتا تو پھر سرجیت سنگھ کا کیا کام تھا جی، کل ایک لانچ جا رہی ہے" "کیا لگے گا؟" "آپ کیا دیں گے" "جو مناسب رقم بتاؤ گے" "لیتے تو ایک ہزار ہیں، آپ سے آٹھ سو" "منظور ہے" "پیشگی لگے گا" "ٹھیک ہے"

میرا سارا فکر ختم ہو گیا۔ کویت میں پاکستانی سفارت خانے کے ذریعے سیدھا کراچی جا پہنچوں گا۔ قسمت کا ستارہ اچھی طرح بلکہ بہترین طریقے پر گردش کر رہا تھا۔ وہ مجھے میرین ڈرائیو کی سیر کرواتا رہا اور میں کویت سے ہوتا ہوا خیالوں کی دنیا میں کراچی، لاہور اور منگلا میں اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملنے میں کھویا رہا۔ بمبئی کتنا ہی خوبصورت شہر کیوں نہ ہو میرے نزدیک اپنے ملک کی سرزمین اور اپنے مقصد میں کامیابی سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں تھی، دل میں خیال آیا کہ یہ لانچ کل کی بجائے آج چل دیتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ دشمن کی زمین سے نجات حاصل کرنے کے آخری لمحات میں اللہ کی عبادت میں گزارنا چاہتا تھا۔ واپس ہوٹل آیا، اگلے روز شام کے سات بجے کا وقت سرجیت سنگھ سے طے پایا، میں کمرے میں آگیا۔

ایک خیال آنے پر اٹیچی کیس کی تمام چیزیں پھر سے دیکھیں۔ ایک واسکٹ تھی، جس کی جیب میں ایک چھوٹی سی ڈائری تھی۔ اس میں پہلے صفحے پر انگریزی میں یہ پتہ درج تھا، "کنہیا لال کپور ریشم گنج، مکان نمبر ۲۰۸/A بمبئی۔ یہ معلوم کر کے مجھے بہت راحت محسوس ہوئی کہ کم از کم میں اب اپنا قرض ادا کر سکتا ہوں۔ اٹیچی کیس میں کل پندرہ ہزار دو سو روپے تھے۔ میں نے مستی سے ایک منی آرڈر فارم لانے کو کہا، وہ چند منٹوں میں کہیں سے لے آیا، میں نے اسے پُر کیا، نیچے پیغام والی جگہ پر یہ لکھا۔

مجھے آپ کو تکلیف دینے کا صدمہ بھی ہے اور افسوس بھی۔ بارہ ہزار حاضر خدمت ہیں، باقی رقم اور چیزوں کی قیمت عنقریب ادا کر دوں گا۔ میں نے نہ کوئی گناہ کیا نہ جرم۔ تفصیلی خط باقی ادائیگی کے وقت لکھوں گا۔ اس وقت تک کے لئے درگزر کیجیے۔

از طرف اے بی شاہ ۸۸ ہم ایف میرین ڈرائیو بمبئی"

ڈاکخانہ گیا اور یہ رقم منی آرڈر کر کے واپس آگیا۔ وضو کیا اور باقی وقت اس مہربان خدا کی عبادت اور اس کا شکریہ ادا کرنے میں گزارا جس نے مجھے اتنی مشکلات سے نجات دی اور مجھ میں ہمت اور جرأت پیدا کی۔ اگلے روز شام کو مقررہ وقت پر سرجیت سنگھ کی ٹیکسی میرا انتظار کر رہی تھی۔ رات کا کھانا جلدی کھایا، ہوٹل کا بل ادا کیا اور منی کو پندرہ روپے انعام دے کر میں سرجیت سنگھ کی ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ ایک گھنٹہ کے قریب سڑکوں سے گزرتی ہوئی ٹیکسی ایک گھاٹ پر پہنچی۔ سرجیت تھوڑی دیر کے لئے کہیں گیا۔ پھر میرے پاس آیا اور مجھے ساتھ لے کر ایک کشتی کے پاس آیا۔ کشتی سے چار سو گز کے فاصلے پر ایک لانچ کھڑی تھی۔ سرجیت سنگھ بولا "لیجیے وہ رہی آپ کی لانچ۔ یہ کشتی آپ کو اس تک پہنچا آئے گی۔ اس لانچ کا ڈرائیور خود بخود آپ سے رابطہ قائم کرے گا، میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے، وہ آپ کو شہر کے اندر پہنچا آئے گا۔ اس کے بعد آپ جانیں اور آپ کا کام۔ کبھی پھر بھی خدمت کا موقع دیجیے گا۔ اور ہاں وہ پیشگی رقم مجھے ادا کر دیجئے۔" میں نے آٹھ سو روپے اس کے حوالے کئے۔ کشتی میں بیٹھا اور لانچ پر اتر کر ایک طرف جا بیٹھا۔ لانچ کافی بھری ہوئی تھی، اس میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی بچے بھی اور بوڑھے بھی، لانچ پر قدم رکھتے ہی میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ ایک تشکرانہ سانس لی۔ تین دنوں میں کویت جا پہنچوں گا۔ وہاں اگر پکڑا بھی جاؤں تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہاں سفارتی ذرائع سے سب کچھ باآسانی ٹھیک کیا جا سکتا ہے کویت سفارتخانہ میں پہنچ کر گھر فون کروں گا تو شاید کوئی یقین نہ کر پائے کہ میں بول رہا ہوں۔

لانچ روانہ ہو گئی۔ چاند ہلکی ہلکی اٹھتی لہروں پر اپنی روشنی بکھیر رہا تھا۔ اس سہانی رات میں یہ سب ایک سہانا خواب معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سینما میں فلم چل رہی ہو جس میں دنوں کو منٹوں میں سکیڑ کر پیش کیا جا رہا

ہو، میں اپنے خیالات میں غرق آسمان پر چاند ستاروں کا نظارہ کر رہا تھا۔ کتنے ناجائز لوگ اس ناجائز طریقہ سے دوسرے ملکوں کو جاتے ہیں۔ یہ اتنی عورتیں وہاں کیا کریں گی؟ ان کو وہاں بیچنے اور دھندے کے لئے لے جایا جا رہا ہے اور یہ بچے وہاں کس غرض کے لئے لے جائے جا رہے ہیں، کیا ان میں سے ہر ایک نے آٹھ سو روپے کرایہ ادا کیا ہے، یہ بوڑھا مچھلی کو رسی میں پروئے کہاں جا رہا ہے، یہ مچھلی تو تین روز میں بُو دینی شروع کر دے گی۔ گھنٹہ بھر چلنے کے بعد لانچ رُک گئی اور سب مسافر اپنا اپنا سامان لئے لانچ سے نیچے اُترنا شروع ہو گئے۔ میں پریشان تھا، دل کو تسلی دی کہ آخر اس قدر لوگ کیسے کویت جا سکتے ہیں۔ ان سب کو اتارنے کے بعد ہم کچھ لوگوں کو لے کر یہ کویت چلے گی۔ چند لمحوں بعد لانچ میں شاید میں ہی اکیلا رہ گیا تھا، ایک سیاہ فام آدمی میرے پاس آیا۔ اور پوچھنے لگا "آپ اتریئے گا نہیں"، اُس کے سوال نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، جیسے مجھے بجلی کا جھٹکا لگا ہو، میں جوں کا توں بیٹھا اس کے منہ کی طرف تکنے لگا، پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا "یہ لانچ کہاں جائے گی"۔ "واپس اسی گھاٹ پر جہاں سے آئے ہیں"۔ "میں بھی واپس جاؤں گا"۔ "ایک روپیہ دے دیجئے۔ میں نے کرایہ ادا کیا۔ انسان بے صبری میں جلدی منزل پر پہنچنے کے لئے بے احتیاط ہو کر کتنی آسانی سے بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔ ہر خوش فہمی کو دل کتنی جلدی قبول کر لیتا ہے خواہ اُسے حقیقت سے واسطہ ہو یا نہ ہو۔ دل کو اچھی لگنے والی باتوں کو جھٹلانے کو دل نہیں کرتا۔ سرجیت سنگھ نے مجھ کو بے حد بیوقوف بنایا تھا۔ جہاں مجھے اپنی حالت پر ترس اور اس نئی صورت حال پر پریشانی ہو رہی تھی، وہاں دل ہی دل میں اپنی بیوقوفی پر ہنس رہا تھا۔ لانچ میں کئی اور مسافر سوار ہوئے، ایک گھنٹہ میں ہم پھر اُسی گھاٹ پر واپس آن پہنچے جہاں سے چلے تھے میں نے اتر کر ٹیکسی لی اور واپس عمر خیام ہوٹل آن پہنچا۔ مستی نے میرا پر جوش خیر مقدم کیا۔ میں نے چائے کی ایک پیالی پی اور سو گیا۔ صبح اٹھا۔ اس لالہ جی کو روپے واپس بھیجنے کا افسوس ہو رہا تھا، کتنے دن اور یہاں گزارنے پڑیں گے؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، لیکن دل بڑا بے چین تھا، اخبار منگوایا، اندر کے صفحہ پر "مزدور سامان لے کر فرار

ہو گیا۔ کی چھوٹی سرخی تھی، لیکن اس کا مجھے فکر نہ تھا۔ کیونکہ اب میرا حلیہ کسی مزدور سے نہ ملتا تھا۔ اور نہ ہی کوئی مجھے شک کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا۔ میرا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ بس جی چاہتا تھا کہ جلد از جلد پاکستان پہنچوں۔ سب مشکلات کو پھاندتا، مزید امید و بیم کو سہنے کی طاقت اب باقی نہیں رہی تھی، ناشتہ کرنے کے بعد میں بازار گیا۔ ایک ریڈی میڈ پتلون اور بش شرٹ ایک مفلر ایک ٹوپی، ایک فرانسیسی شنیل نمبر ۵ سینٹ "عطر" کی شیشی ایک ہینڈ بیگ اور کچھ کھلونے جس میں ایک اصلی سا لگنے والا پستول تھا، خریدا۔ ہوٹل واپس آیا۔ منی سے امرتسر جانے والی ہوائی جہاز کی پرواز کا پتہ کروایا۔ وہ کچھ دیر کے بعد پتہ کر کے آیا کہ شام آٹھ بجے ایک پرواز جاتی ہے۔ میں نے اُسے ٹکٹ کے لئے روپے دیئے وہ تین چار گھنٹے بعد ٹکٹ لا کر میرے حوالے کر گیا۔

شام کو پتلون اور بش شرٹ زیب تن کر کے میں ہوائی اڈہ پہنچا۔ سینٹا کروز کے ہوائی اڈا سے ہوائی جہاز ٹھیک رات کے آٹھ بجے روانہ ہوا، بھوپال، جھانسی اور پھر گوالیار اترا۔ بار بار گوالیار کی زمین پر پہنچنے سے مجھے ہیبت سی ہوتی تھی، زمین واقعی گول تھی۔ جہاز گوالیار سے اڑا تو میری جان میں جان آئی۔ ایر ہوسٹس ایک سمارٹ اور خوبصورت لڑکی تھی، سرخ بندیا اس کے ماتھے پر بڑی اچھی لگ رہی تھی، گوالیار سے ہوائی جہاز اڑا تو وہ کھانا لائی۔ مسافروں کا وہ بڑی مستعدی سے خیال رکھ رہی تھی، ایک دو دفعہ میں نے شربت مانگا تو اس نے بڑے انداز سے مسکراتے ہوئے شربت لا کر مجھے دیا، میں نے ہینڈ بیگ کھول کر اُسے شنیل نمبر ۵ عطر کی شیشی بطور تحفہ دی۔ تو اس نے بڑے شکریہ کے ساتھ اُسے قبول کرتے ہوئے کہا یہ میری بڑی ذرہ نوازی ہے۔ میرے ساتھ والی سیٹ خالی تھی، اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ میرے پاس آ بیٹھی اور باتیں کرتی رہی۔ جہاز آگرہ اور پھر دلی ٹھہرا، رات کے گیارہ بجے دہلی سے اڑا، امرتسر ساڑھے بارہ بجے پہنچنا تھا۔ سوا بارہ بجے کے قریب میں نے ایر ہوسٹس سے کہا کہ کیا میں کاک پٹ کو دیکھ سکتا ہوں؟ وہ بولی آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا" اب تو جہاز امرتسر اُترنے والا ہے، آپ کہتے تو میں آپ کو پائیلٹ کے پاس بٹھا کر دلی کی جگمگاتی بجلیوں کا نظارہ کراتی۔ بہر صورت آئیے، وہ مجھے پائیلٹ کیبن میں چھوڑ کر واپس

آگئی۔ پائیلٹ اکیلا تھا۔ جہاز نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ سامنے امرتسر کی بجلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے پستول پائلٹ کی کمر میں نصب کرتے ہوئے انگریزی میں اس سے کہا "ہلو مت جہاز سیدھا لاہور لے چلو۔ اگر تم ذرا بھی ہلے تو میں پستول داغ دوں گا۔ بس مجھے وہاں اتار کر تم واپس آجانا" ورنہ تم اور تمہارے ساتھ یہ جہاز بمہ مسافروں کے تباہ و برباد کر دیا جائیگا۔ جہاز کا منہ نیچے کی طرف سے ہٹ کر زمین کے متوازی ہوگیا۔

پائیلٹ بولا "گولی مت چلانا، تم جیسا کہتے ہو میں ویسا ہی کروں گا" پندرہ بیس منٹوں میں جہاز لاہور کے ہوائی اڈے پر آن اُترا، مسافروں کا خیال تھا کہ جہاز امرتسر آن اُترا ہے، میں نے پائیلٹ کیبن سے باہر جھانکا تو جہاز کے عقب میں سٹاف کا ایک آدمی جہاز کا دروازہ کھول رہا تھا۔ میں نے پائیلٹ سے کہا کہ میرے اترتے ہی جہاز اڑاؤ اور واپس چلے جاؤ۔ ورنہ میں اُتر کر جہاز پر فائر کر دوں گا۔ پستول ہاتھ میں تھامے میں پچھلے دروازے کی طرف بھاگا۔ مسافر مجھے دیکھ کر سکتے میں آگئے۔ جو جہاں تھا وہیں منجمد ہوگیا۔ میں نے جست لگائی اور جہاز سے نیچے زمین پر آرہا۔ جہاز کا دروازہ بند ہوا اور جہاز وہاں سے اڑانے کے لئے چل دیا۔

میں لاہور کے ہوائی اڈے سے بخوبی واقف تھا، اندھیرے میں الٹے راستے آر۔ اے بازار سے ہوتا ہوا میو گارڈن رات کے دو بجے کے قریب آن پہنچا۔ نمبر ۴۲ میو گارڈن میں میری ہمشیرہ بیگم امان اللہ ظفر رہتی تھی۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ وہ سوئی اٹھی۔ دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر حیرت اور خوشی سے میرے ساتھ چمٹ گئی۔ گھر میں ایک دم دن چڑھ آیا۔ سب جاگ اٹھے، اپنی والدہ سے ملا، دوسرے دن منگلا اطلاع دیئے بغیر اپنے بیوی بچوں کے پاس پہنچا تو وہاں بھی وہی عالم ہوا جس کی توقع تھی۔ آخر یہ ایک کارنامہ تھا۔ اپنی کامیابی پر مجھے بے حد خوشی تھی۔ ہر آنے والے کو پوری کہانی بار بار سنا کر بھی میں نہ تھکتا۔ یہ سارا ایک معجزہ تھا ایک ڈرامہ تھا، ایک ناول تھا، اپنے گھر میں مدت کے بعد ایک پرسکون ماحول میں سویا۔ اب مجھے پکڑے جانے کی کوئی فکر نہ تھی۔ گھوڑے بیچ کر سویا۔ دوسری صبح کسی نے آواز دی "رول کال" تو میں نے کہا کہ وہاں

کیمپ میں ہر روز یہ آواز سن سن کر کان بج رہے ہیں، کیمپ کی زندگی کے دن تو کئی روز خوابوں میں آتے رہیں گے، جاٹلے کی مونچھیں دکھائی دیتی رہیں گی جواب کافی نیچے ہوگئی ہوں گی۔ نیند کے خمار میں میں نے بستر پر کروٹ بدلی۔ رول کال کی پھر آواز آئی۔ واقعی کیمپ کی آوازیں کس قدر حقیقی معلوم ہوتی ہیں، اور پھر کسی نے مجھے ہلا کر اٹھایا۔ میں نے مسکراتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو کرنل شریف سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔ ملک صاحب تھاپا آیا ہے، اسے اپنی شکل دکھا دیں، میں ہڑبڑا کر اٹھا میں کیمپ کی چارپائی پر تھا۔ میرا دل دھک سے بیٹھ گیا۔ کاش یہ خواب حقیقت ہوتا۔

کتنا لمبا اور حسین خواب تھا۔ ہر واقعہ اتنی تفصیل سے رونما ہوا کہ یہ خواب خواب نہ لگتا تھا چند لمحوں کے لئے میں ایک سکتے کے عالم میں رہا۔ خواب انسان کی زندگی کا کتنا اہم حصہ ہیں۔ اس کے ذریعے ایک فقیر تخت طاؤس پر بیٹھ کر بادشاہی کا کردار ادا کر لیتا ہے۔ خوبصورت حسیناؤں سے عشق و محبت کی پینگیں بڑھاتا ہے، باہر کے ملکوں کی ایک پائی خرچ کئے بغیر سیر کرتا ہے۔ دل کی بیشتر تمناؤں کو پورا کر پاتا ہے، اگر خوابوں میں انسان مشکلات سے دوچار ہوتا ہے تو بغیر مشکلات کی صعوبتوں کا حقیقی مزہ چکھے وہ تجربہ کار بنتا ہے لیکن تخیلات کی پرواز اُسے اتنی بلندی پر لے جا کر کھڑا کرتی ہے کہ ایک آنکھ کے کھلتے ہی وُہ دھڑام سے نیچے گرتا ہے تو اس کا شیشۂ دل چُور چُور ہو کر رہ جاتا ہے۔ مایوسی کے باوجود اس لمبے خواب سے میں نے اُمیدوں کا سُورج طلوع ہوتے دیکھا۔

## ۱۳

بریگیڈیر گھوش سب ایریا کمانڈر تھے، ہمارا کیمپ بھوپال سب ایریا کے تحت تھا۔ وہ ہر ڈیڑھ ماہ کے بعد تمام کیمپوں کا چکر لگایا کرتا۔ مارچ کے آخر میں وہ ہمارے کیمپ میں آیا۔ تو میں نے اُسے بتایا کہ "ایک سپاہی کو جسمانی ضروریات سے زیادہ عزت پیاری ہوتی ہے۔ ہم زمین پر سونے کے لئے تیار ہیں۔ سوکھی روٹی پر گزارہ کریں گے مگر ہتک آمیز جملے سننے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ ہمارے کیمپ افسر کیپٹن جاٹلے کا رویّہ اس لحاظ سے کافی پسندیدہ ہے"۔ اس طرح میں نے

اسے پیشہ ورانہ قدروں سے متنبہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میرے ساتھیوں میں سے چند نے دوسری سانس ہی میں کھانے کی چیزوں کے بندوبست اور دیگر سہولتوں کا ذکر چھیڑا تو مجھے صدمہ بھی ہوا، اور شرمندگی بھی۔ کیا آم اور انڈے خریدنے کا بندوبست ہو سکتا ہے؟ اگر روزانہ چپاتی والا آ سکے تو بہتر رہے گا وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ وہ ایسی مراعات حاصل کرنے میں حق بجانب تھے کیونکہ جنیوا کنونیشن کے تحت یہ جنگی قیدیوں کو دی جانی چاہئیں تھیں۔ لیکن میں ذاتی طور پر ایسی مراعات کے خلاف تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس ماحول میں انڈے اور آم کھانے کچھ زیادتی تھی، شاید ایسے جذبات رکھنے میں میں حق بجانب نہ ہوں لیکن میں کچھ جذباتی واقع ہوا ہوں۔ جو ساتھی یہ مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے ان کا نقطۂ نظر شاید غلط نہ تھا کہ ان کڑے حالات میں خواہ مخواہ زندگی کو زیادہ مشکل بنانے سے کیا حاصل! ایسا کرنے سے ذہنی کوفت بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ کھاتے پیتے رہنے سے صحت بھی ٹھیک رہے گی۔ لیکن میں کوفت اور صحت کو ذہنی رجحان کا معاملہ سمجھتا ہوں اگر ان مراعات کے بغیر انسان خوشی سے گزارہ کرنے کے لئے تیار ہو جائے تو نہ کوفت بڑھتی ہے نہ صحت متاثر ہوتی ہے۔ گھوش بڑا سمجھ دار افسر تھا اس نے کیپٹن جانئے کو بدل کر کیپٹن بی۔ کے دوید کو ہمارا انچارج افسر مقرر کیا اور دیگر مراعات کا بندوبست کرنے کا حکم دے کر واپس چلا گیا۔ یہ سب کچھ وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کر رہا تھا۔ اگرچہ اُس روز ہم اس کی شرافت سے کافی متاثر ہوئے مگر بعد کے واقعات سے اس کے اصلی روپ کا پتہ چلا۔ وہ یہ تمام مراعات اس لئے دینے کا خواہشمند تھا کہ ہم ان سہولتوں سے مرعوب ہو کر اپنی فرض شناسی کو بھول جائیں اور فرار کی کوشش کا دماغ میں خیال تک نہ لائیں۔ گھوش سے میں نے پیرا انسٹر کے افسروں کے بہتر طرزِ عمل کا ذکر بھی کیا اور موجودہ سٹاف کی بدسلوکی کی چند مثالیں دیں، میری اس شکایت سے کیمپ سٹاف کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے اسے مزید بتایا کہ نہ تو کسی بیمار کے علاج کی پرواہ کی جاتی ہے اور نہ ہی کوئی دوائی مہیا کی جاتی ہے اور ہمیں دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ اگر کسی سے شکایت کی تو انجام بُرا ہو گا۔ البتہ جب کوئی سینئر افسر آنے والا ہوتا ہے تو اس سے ایک روز

پہلے بندوبست کرنے کے بعد ہمیں منہ بند رکھنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ ان کا رویہ سپہ گری کی روایات کی توہین ہے۔ گروپ کمانڈ لیفٹیننٹ کرنل مدن لال کی چند روز پیشتر بریگیڈیر گھوش سے کسی بات پر جھڑپ ہو چکی تھی۔ وہ کافی متعصب قسم کا آدمی تھا اور کافی بدتمیز بھی تھا۔ اُسے بدل دیا گیا اور اس کی جگہ لیفٹیننٹ کرنل آنند سنگھ آگیا۔ اگرچہ یہ افسر مقابلتاً بہتر تھا لیکن زیادہ موثر نہ تھا۔ کیونکہ کیمپ کمانڈر اور کیمپ افسر اس کی کم ہی سنتے تھے۔ باوجود ان تمام باتوں کے اپریل ۱۹۷۲ء کے آخر تک عام طور پر جنیوا کنونیشن کا کچھ حد تک پاس رکھا گیا۔ اگرچہ کنونیشن کی رُوح کو وقتاً فوقتاً دھچکا لگا دیا جاتا اور اس کی وجہ بھارتی افسروں اور ماتحت عملہ کی ذاتی ذہنیت تھی، نہ کہ حکومت کی طرف سے کسی پالیسی کی پیروی۔ ان ہی انفرادی ذہنیتوں کا مجموعہ قومی ذہنیت کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

اپریل کے وسط میں پہلی دفعہ انٹرنیشنل ریڈ کراس کا نمائندہ ہم سے ملنے آیا۔ اس سے میں نے اُن تمام چھوٹی موٹی زیادتیوں کا ذکر کیا۔ میں نے اس سے علیحدہ ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ کیمپ سٹاف اس پر کچھ پریشان ہوئے لیکن چونکہ جنیوا کنونیشن میں ایسے انٹرویو کی اجازت تھی وہ کچھ نہ کر سکے میں نے اسے بتایا کہ ہر روز ہمارے دو تین سپاہیوں کو پوچھ گچھ کے لئے لے جایا جاتا ہے اور ان سے لکھے ہوئے بیانات پر دستخط کروائے جاتے ہیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ ان تمام باتوں کی تفتیش کریگا۔

بریگیڈیر گھوش کے آنے سے ایک روز پہلے میجر وکرم چوان اور کیپٹن جاتلے ہمارے کیمپ میں آئے۔ کیونکہ اگلے روز بریگیڈیر نے آنا تھا۔ اس لئے دونوں کچھ انسانوں کے انداز میں ہم سے بات چیت کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا "آج دونوں کا رویہ کچھ شریفانہ ہے، اگر آپ دونوں شرافت برتیں تو آپ کا کچھ گھس نہ جائیگا۔ چوبیس گھنٹے ماتھے پر تیوریاں ڈال کر غیر ضروری طور پر غصہ دکھانے سے آپ کوئی زیادہ اچھے نہیں لگتے، اگر جاتلے کا خیال ہے کہ وہ اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دے کر غصہ دکھانے سے ہمیں ڈرانے میں کامیاب ہو جائے گا تو وہ غلطی پر ہے" جاتلے گرم ہو کر بولا "آپ کی خاطر میں اپنی مونچھیں منڈوانے سے رہا" میں نے کہا، مونچھیں ضرور رکھو صرف باتیں کرتے وقت آنکھیں پھاڑ پھاڑ ہمیں دیکھنا اور بے لگام باتیں کرنا چھوڑ دو" بریگیڈیر

گھوش کے آنے کے ایک ہفتہ بعد جب جاتلے ہمارے کیمپ میں آیا تو اس کی مونچھیں مونڈھی ہوئی تھیں بالکل صفا چٹ اسے ہمارے کیمپ سے ہٹا کر کوارٹر ماسٹر لگا دیا تھا۔ میں نے اُسے کہا "کپتان صاحب" یہاں سے ہٹائے جانے کے ساتھ ہی مونچھیں بھی ساتھ چھوڑ گئیں" وہ ایک احمقانہ ہنسی جس میں خفت اور شرمندگی تھی ہنسا اور بغیر کوئی جواب دیئے وہاں سے چلا گیا

## ۱۴

۳، مئی کے دن میں تمازت تھی۔ درجہ حرارت ۱۱۸ ڈگری فارن ہائٹ کے لگ بھگ تھا۔ صبح ہی سے ہوا بند تھی۔ معلوم ہوتا تھا شاید سخت طوفان اور آندھی آنے والی ہو، مگر کیسا طوفان اور کیسی آندھی، دوپہر کے بعد آندھی آئی جو بہت کچھ اڑا کر لے گئی اور ہم کچھ بھی نہ کر پائے۔ یہ آندھی گرد و غبار اور تیز و تند ہوا والی آندھی نہ تھی یہ نئی طرز کا طوفان تھا" ایک نئے انداز کی آندھی تھی لیکن کون جانتا تھا کہ یہ آنے والی ہے۔

میں حسب معمول ناشتہ کرنے کے بعد اپنے کام کے متعلق سوچنے لگا۔ آج سرنگ میں کام کرنے کی میری باری تھی۔ چنانچہ میں باورچی خانے میں گیا۔ فرش کی سِل اٹھوائی اور کام کرنے والے مٹی اور کیچڑ سے لت پت کپڑے جو سرنگ کے اندر ہر روز کام کے بعد چھپا دیئے جایا کرتے تھے، پہن کر سرنگ کے اندر رینگتا ہوا پہنچا۔ کھودنے والی لوہے کی سلاخ اور چپٹا سریا میرے پاس تھا۔ کھودنا شروع کیا۔ مٹی میں نمی تھی مگر سُرنگ کے اندر یہ نمی گرمی کی وجہ سے خنکی پیدا کرنے کی بجائے گھٹن پیدا کر رہی تھی جس سے جسم چند ہی منٹوں میں پسینہ سے بھیگ گیا ایسے جیسے پانی کے نلکے کے نیچے بیٹھا نہا رہا ہوں۔ ہر چوٹ کے ساتھ مٹی نیچے گرتی اور سرنگ منزل مقصود کی طرف بڑھتی۔ مگر اس قدر آہستہ کہ دل میں گھبراہٹ پیدا ہونے لگتی۔ اندازاً پندرہ بیس منٹوں میں ایک عدد بالٹی مٹی کھودی جاتی اور بارہ بالٹیوں سے ایک فٹ سرنگ آگے بڑھتی۔ یعنی تین گھنٹوں کی سخت محنت کے بعد صرف ایک فٹ سرنگ کھدتی۔ جی تو چاہتا تھا کہ یہ کام تیزی سے آگے بڑھے، اس خیال کے

آتے ہی بازوؤں بلکہ پورے جسم میں بجلی کی لہر دوڑ جاتی اور پورے زور سے سریا زمین میں پیوست کرنے لگ جاتا اور مٹی کھودتا۔ مگر چند ہی واروں کے بعد سانس پھول جاتی، ہتھیلیوں میں جلن شروع ہو جاتی اور بازوؤں کی حرکت آہستہ آہستہ ڈھیلی پڑنا شروع ہو جاتی، یہاں تک کہ وہ بے حرکت ہو جاتے اور میں چت لیٹا ہوا خیالوں کی دنیا میں کھو جاتا، آزادی کی دنیا میں۔

قطرہ قطرہ بہم شود دریا، یوں ہی انچ انچ آگے بڑھتے اس دن ۲۷ فٹ سرنگ تیار ہو چکی تھی، آخری باڑ تین فٹ کے فاصلے پر تھی۔ چند روز محنت کے بعد سرنگ کا دھانہ اوپر کی طرف نکالا جانے والا تھا اور ہم نے باری باری اس میں سے باہر نکلنا تھا۔ تازہ اور آزاد فضا میں اپنے وطن عزیز کی طرف اور یہ خیال آتے ہی بازوؤں میں نئی طاقت لوٹ آتی اور یوں وہ حرکت میں آجاتے بس اب کام ختم کر کے ہی دم لیں گے مگر یہ جذبہ صرف تین چار منٹوں کے بعد بازوؤں بلکہ جسم کے ہر حصہ کو چور چور کر دیتا۔ دل و دماغ تو کام جاری رکھنے کے قائل ہوتے مگر بازو بے حس ہو کر آرام کرنا شروع کر دیتے۔ سرنگ میں لیٹ کر کام کرنا پڑتا۔ اس لئے کام کی رفتار سست رہتی۔

ایک گھنٹے میں میں نے چار بالٹیاں مٹی پیچھے بھیجی ہونگی کہ بجلی بجھ گئی۔ اندھیرے میں سانس گھٹنے لگتی ہے مگر اس روز جی کرتا تھا کہ کام جاری رکھا جائے۔ یونہی اندھیرے میں کوئی آدھ گھنٹہ کام کیا ہوگا کہ بجلی آگئی۔ اس روز میں نے تین گھنٹے لگاتار کھدائی کی جس میں کل دس بالٹیاں نکلیں یعنی ان تین گھنٹوں کے دوران صرف دس انچ سرنگ آگے بڑھی تھی۔ ہاتھوں میں اب چھالوں کی بجائے چنڈیاں پڑ چکی تھیں۔ پسینہ اس قدر نکلا تھا کہ مٹی میں مل کر کیچڑ بن رہا تھا۔ بارہ بجے کے قریب میں نکلا۔ جسم کا ہر عضو تھکاوٹ سے ٹوٹا جا رہا تھا۔ کمرے میں آن کر نہایا، کھانا کھایا۔ دوپہر کے بعد کرنل شریف کی باری تھی۔ وہ کھانا کھا چکا تھا۔ اس لئے وہ باورچی خانہ میں کام چالو رکھنے کے لئے چلا گیا۔ کھانے کے بعد میں نے برآمدے میں کرسی رکھی اور اخبار لے کر بیٹھ گیا تاکہ باہر کی طرف نظر رکھی جا سکے اگر کوئی اندر کی طرف نظر آئے تو شریف کو اطلاع دی جائے میں وہاں بیٹھا تھا کہ جیکی آگئی۔ میں نے اٹھ کر ایک مختصر سا رقعہ تحریر کیا جس میں جونیئر افسروں

سے فرار کی تاریخ کے تعین کے متعلق کچھ سوال تھے، وہ رقعہ جیکی کے پٹہ کے اندر چھپایا، اور جیکی کو جونیئر افسروں کے کیمپ کی طرف روانہ کر کے میں پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اندازاً ڈیڑھ بجے کے قریب جونیئر افسروں کے بلاک کے ارد گرد میں نے چند سنتریوں کو گھیرا ڈالتے دیکھا۔ یہ غیر معمولی بات تھی، کیمپ کے اندر بھی حرکت شروع ہو چکی تھی، اس غیر معمولی نقل و حرکت کی وجہ سے ضروری ہو گیا تھا کہ جیکی کا فوراً پتہ چلایا جائے۔ وہ دُور جونیئر افسروں کے کیمپ کے باورچی خانہ کے باہر گندگی کے ڈھیر کے قریب گھوم رہی تھی۔ میں نے زور سے سیٹی بجائی تو وہ دوڑتی ہوئی آ گئی میں نے اس کے پٹہ سے رقعہ نکال کر جلا ڈالا۔

تین چار بھارتی افسر جونیئر افسروں کے کیمپ میں مصروف کار نظر آئے تھے۔ ہمارے افسروں کو باہر نکال کر فال ان کر لیا گیا تھا۔ یہ سب خطرے کی نشانیاں تھیں۔ شاید بلی تھیلے سے باہر نکل چکی تھی اور پھر بھارتی افسر اور کچھ سپاہی اس بارک کی طرف چلنا شروع ہوئے جہاں ہم پہلے رہتے تھے اور جس کے آخری کمرے میں سرنگ کا کام ہو رہا تھا۔ وہ سب اسی کمرے میں اندر باہر آنا جانا شروع ہو گئے۔ اب شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ آندھی اور طوفان آ چکا تھا۔ آزادی کی امیدیں اور ہماری تمام خوشیاں خاک میں ملنے کو تھیں مگر یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود دل یہ یقین کرنے پر رضامند نہ تھا کہ ہماری کوششیں رائگاں جائیں گی۔ اللہ میاں کسی کی کوششوں کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ ہو سکتا ہے کہ اب بھی ہندی افسروں کی آنکھوں میں پردہ پڑا رہے اور وہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکیں۔ لیکن یہ سب خوش فہمی تھی۔ پہلے تو مجھے خیال آیا کہ شریف سے کہوں کہ کام بند کر دے مگر پھر یہ سوچ کر کہ جتنا کام ہو جائے بہتر ہے۔ میں نے چپ سادھے رکھی۔ اگر ان کی سرنگ پکڑی بھی جائے تو یہ ضروری نہیں کہ ہمارے والی کا بھی پتہ چل جائے۔ اس لئے چلتے کام کو روکنا ضروری نہ سمجھا۔

جونیئر افسروں کے کیمپ میں جا نکلے۔ کیپٹن پاوار اور کیپٹن بی کے وید اور دو تین افسر سخت پریشانی کے عالم میں گھومتے دکھائی دیئے رہے تھے۔ پھر اس غسل خانے کا عقب والا دروازہ

کھلا جس میں سرنگ کھودی گئی تھی اور دو سپاہی بیلچے لئے نکریں پہنے باہر نکلے۔ ان کے پیچھے دو بھارتی افسر بھی نکلے۔ اب سرنگ کے پکڑے جانے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا۔ قریباً تین ماہ کی ان تھک کوشش ضائع ہو گئی اس کے علاوہ آزاد ہونے کا موقع کافی حد تک مخدوش ہو گیا اس دن نئے باب کا آغاز ہوا۔ نیا سلوک اور نیا رویہ۔ تمام جونیئر افسروں کو اکٹھا کیا گیا۔ اس بیرک کے پانچوں کمروں کے مکینوں کو علیحدہ کیا گیا جس میں سرنگ کھدی تھی۔ لیکن اس بیرک کے تمام رہنے والے تو اس مہم میں شریک نہ تھے چنانچہ اس مہم میں شریک بارہ افسروں نے رضاکارانہ طور پر پوری ذمہ داری قبول کر لی تاکہ جو اس کام میں شریک نہ تھے ان کو سزا نہ ہو، یہ یقیناً ایک، جرأت مندانہ قدم تھا۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ ان کو کیا سزا دی جائے گی۔ پھر بھی انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنی ذمہ داری کو قبول کیا۔ ان بارہ افسروں میں سکینڈ لیفٹننٹ اسد الرحمان بھی شامل تھا، یہ افسر ۲۸ نومبر کو پاکستان ملٹری اکیڈیمی سے پاس ہو کر سیدھا مشرقی پاکستان آیا تھا صرف چند روز کی نوکری کے بعد جو اس نے جنگ میں کی وہ قیدی بنا لیا گیا۔ وہ ایک دوسری بارک میں رہتا تھا اور اس کے لئے بڑا آسان تھا کہ وہ چُپ رہے لیکن اس نے اپنے ساتھیوں کا ساتھ دینے ہی میں جوانمردی سمجھی کہ ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت، باوجود اس کے کافی افسروں نے اُسے ایسے کرنے سے روکا۔ لیکن وہ بلا خوف و خطر سرنگ کھودنے والوں کی صف میں آن کھڑا ہوا۔ انسان کی جرأت کا امتحان اور اندازہ ایسے ہی حالات میں لگایا جا سکتا ہے ورنہ محض فرضی حالات میں ڈھینگیں مارنے والوں کی تعداد بے شمار ہوا کرتی ہے۔ اس افسر کی فرض شناسی اور جرأت کا جذبہ قابل تعریف ہے۔ ہماری بقایا قید کے دوران بھی میں نے اسے ہمیشہ ہر ایسی مہم میں حصہ لینے کے لئے پیش پیش پایا۔

ان بارہ افسروں اور باقی تمام اس بیرک میں رہنے والے افسروں کو یعنی کل چوبیس افسروں کو حکم ملا کہ وہ ایک کمبل، ایک مگ اور ایک پلیٹ لے کر تیار ہو جائیں۔ پھر ان کو بھاری گارد کی نگرانی میں ہمارے پہلو والی بارک میں لایا گیا۔ بارہ بارہ افسروں کو ایک ایک کمرے میں بند

کر دیا گیا۔ مئی کی گرمی میں دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی گئیں۔ جب وہ ہماری بیرک کے سامنے سے گزرے تو ان کے حوصلے بلند تھے، اگرچہ ان کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ افسوس ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، بقایا جونیئر افسروں کو ان کے اپنے ہی کیمپ کی دو بارکوں میں رکھا گیا۔ ایک چھوٹے کمرے میں بارہ افسروں کو اتنی گرمی میں بند کرنا بلیک ہول (BLACK HOLE) کے واقع کی یاد دلاتا تھا۔ وہ سب بڑی مشکل سے کمرے میں لیٹ سکتے تھے۔

خیر! ایک طرف کی سرنگ کا کام تو ختم ہو گیا لیکن بھارتی حکام کو اس کا پتہ کیسے چلا؟ اس کے متعلق ہم نے بعد میں دریافت کیا کہ آخر گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہے ورنہ تمام تر انتظامات اتنے اچھے تھے کہ اس کا پتہ چلنا بہت مشکل تھا۔ ہمارے لئے اب ضروری ہو گیا تھا کہ اپنی سرنگ کا کام بند کر دیا جائے۔ کیونکہ چیکنگ کا ہونا ضروری امر تھا۔ چنانچہ آئندہ صبح یعنی ۴ مئی کو میں باورچی خانہ گیا۔ ایک چھوٹی لکڑی کی میز کو سرنگ کے دھانے کے اندر رفٹ کیا۔ اس کے اُوپر ایک فٹ کے قریب مٹی ڈالی اور اُوپر سل کو اس صفائی سے نصب کیا کہ دیکھنے والے کو ذرہ بھر شک نہ ہو سکے۔ مشکل سے یہ کام ختم ہی کیا گیا تھا کہ صوبیدار روشن سنگھ آیا۔ اس نے تمام اردلیوں کو فال ان کیا سوائے ایک خانسامے، ایک مسالچی اور اردلی کے باقی تمام کو ہمارے بلاک سے لے گیا۔ یہ خطرے کا سگنل تھا کیونکہ اردلیوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور زدوکوب کر کے ہماری سرنگ کے متعلق بھی پتہ چلایا جا سکتا تھا۔

۴ مئی کا دن بخیریت گزر گیا۔ ۵ مئی کو نو بجے صبح کے قریب جاتلے، پاڈرا اور وید ہمارے بلاک میں آئے۔ ہم سب لیفٹننٹ کرنلوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا اور خود چیکنگ کرنے لگے۔ عقب کی کھڑکی سے ہم دیکھ رہے تھے اور دل میں دُعا کر رہے تھے کہ بلا ٹل جائے۔ وہ تینوں چند منٹ ادھر ادھر گھومے اور پھر سیدھے باورچی خانہ میں گئے اور چند ہی منٹوں کے بعد میں نے وہی لکڑی کی میز باہر آتے دیکھی۔ جسے میں نے سرنگ میں رکھ کر اس کے اُوپر مٹی ڈالی تھی۔ سرنگ کا اتنی جلدی پتہ چلانا ناممکن تھا۔ اس میں شبہ کا کوئی احتمال نہیں کہ ہمارے

اردلیوں ہی سے تمام تر معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی آئے تھے اور اس بارے میں میرا اندازہ ٹھیک نکلا تھا۔

اپنے منصوبے کی ناکامی کا صدمہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے ضرور محسوس کیا۔ آخر ہم نے لگاتار تین ماہ کے لگ بھگ اس پر اپنا پسینہ بہایا تھا۔ پورا وقت مسلسل امید و بیم میں کاٹا تھا۔ اب جبکہ دو چار ہاتھ لبِ بام رہ گیا تھا کہ کمند ٹوٹی۔ سرنگوں کے پکڑے جانے کا بیحد رنج ہوا۔ اس کے علاوہ اس بات کا احساس بھی تھا کہ اس کے بعد حفاظتی تدابیر اتنی کڑی کر دی جائیں گی کہ پھر شاید فرار کا منصوبہ اس قدر آسانی سے پایہ تکمیل تک نہ پہنچایا جا سکے جو اس منصوبے میں شریک نہ تھے ان کے احساسات کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہ تھا۔ انہوں نے سکھ کی سانس لی۔ کیونکہ ہماری کامیابی کی صورت میں اگر نزلہ گرنا تھا تو انہیں پر۔ جہاں ظاہری طور پر وہ ہمارے ساتھ ہمدردی کر رہے تھے وہاں دل ہی دل میں شاید وہ زیادہ خوش تھے۔ اغلباً یہ قدرتی بات تھی۔ اس وقت تک یہ علم نہ تھا کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جاوے گا اور کیا سزا دی جائے گی۔ بہرصورت اس میں شک نہ تھا کہ اب وہ پہلی سی مراعات نہ رہیں گی اس لئے بھی ہمارا ساتھ نہ دینے والے ساتھیوں کو سخت گلہ تھا کہ ہم نہ کہتے تھے کہ یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو پائے گا اور اب خواہ مخواہ خود تو جو تکلیف اور سزا اٹھائیں گے ہمیں بھی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔

ایسے حالات میں اس ناکامی کے باوجود دل کو بڑی تسکین تھی کہ ہم نے کوئی بڑی بات نہیں کی تھی۔ صرف اپنا فرض ادا کیا تھا۔ فرض کی ادئیگی کے لئے پوری کوشش کرنے کے بعد جو دل کو تسکین اور تسلی میسر ہوتی ہے وہ ناکامی کے دکھ کا پورا پورا تریاق ثابت ہوتی ہے۔ ہر کام میں کامیابی اور ناکامی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے پورے خلوص کے ساتھ کسی کام کو کرنے کے بعد ناکامی کا منہ دیکھنے میں بھی ضرور کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے جس کا انسان کو اس وقتی طور پر احساس نہیں ہو سکتا اور نہ ہی وہ صحیح تخمینہ لگا سکتا ہے ہماری اس کوشش کو کوئی

ذی عقل شخص خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو بُرا نہیں کہہ سکتا تھا' اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو ہمیں انسانی قدروں کی کمی ہے۔ انہی قدروں کا پاس اس وقت کے احساسِ ناکامی کا تدارک کر رہا تھا۔

سزا کا ذرہ بھر بھی ڈر نہ تھا۔ کیونکہ جب انسان اپنے فرض کی تشنگی بھانے کے لئے کام کرتا ہے تو وہ اس کی راہ میں حائل مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار ہوتا ہے اور اسے کسی خطرے کا ڈر نہیں ہوتا کیونکہ اگر خطرے اور سزا کے ڈر کو ارادے کی راہ میں حائل ہونے دیا جائے تو ارادے کی تکمیل کے لئے کوشش کرنے کا حوصلہ ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ فرض کی کی ادائیگی کا جذبہ ہی کیسا جس میں خطرے اور سزا کو جزو خیال بنایا جائے۔

جاتلے۔ پاوار اور وید آئے۔ ان کا رویہ بدل چکا تھا۔ لہجہ میں سختی تھی جیسے ہم نے کوئی بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ ڈاکہ ڈالا ہو، چوری کی ہو۔ ہر کسی کو اس بات کا علم تھا کہ فرار کی کوشش ہر جنگی قیدی کا فرض اولین ہے۔ یہ حق اسے جنیوا کنونشن کے تحت دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کی پاداش میں تیس دن تک کی (CONFINEMENT) کی سزا دی جا سکتی ہے مگر قیدی کی ہتک یا توہین کرنے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ سزا دینے کا ایک فوجی قاعدہ ہے اور اس قاعدے کے مطابق ہم سزا بھگتنے کے لئے بالکل تیار تھے خیر! قیدی صرف جنیوا کنونشن کا حوالہ دے سکتا ہے اس پر عمل درآمد نہیں کروا سکتا۔ ہم سب لیفٹنٹ کرنلوں کو اس تپتی دوپہر میں دن کے بارہ بجے باہر دونوں باڑوں کے درمیان کھڑا کر دیا گیا۔ میں نے سوچا سزا تو ملنی ہی ہے جتنے کم کو ملے اچھا ہے۔ چنانچہ ہم پانچوں نے فیصلہ کیا کہ میں تمام تر ذمہ داری قبول کروں گا اور میرے ساتھ صرف کرنل ستار کا نام بتایا جائے گا اور کسی افسر کا اس میں ذکر نہیں کیا جائیگا۔

ایک گھنٹہ کھڑا رکھنے کے بعد کیپٹن پاڈر آیا اور پوچھا کہ یہ کام کیوں کیا گیا تھا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ یہ ہمارا فرض ہے اور اس کا ہمیں حق پہنچتا تھا۔ اس کی تمام تر ذمہ داری میری ہے اور کسی کا اس میں ہاتھ نہیں باقی سب بے قصور ہیں۔ اس لئے تمام کو اس کڑکتی دھوپ میں کھڑا کر کے سزا دینا نامناسب بھی ہے اور ناجائز بھی، وہ بولا کہ تم اکیلے کس طرح یہ کام کر

سکتے ہو، اس پر میں نے اس کو بتایا کہ صرف کرنل ستار میری کچھ مدد کرتا تھا باقی کسی افسر یا جوان کا سارے منصوبے سے کوئی تعلق نہیں، میں سزا کا حقدار ہوں۔ اس لئے باقی تمام کو کمروں میں جانے کی اجازت دی جانی چاہیئے۔ ہمیں اس گرمی میں دو اڑھائی گھنٹے کھڑا رکھا گیا۔ جو تو اس مہم کے ذمہ دار تھے انہیں اس شدت کی گرمی میں کھڑا ہونے کی تکلیف برداشت کرتے ہوئے اپنی کارگزاری پر فخر تھا اور دوسرے پانچوں افسروں کو یہ زحمت بارِ خاطر محسوس ہو رہی تھی کیونکہ اس ساری کاروائی میں ان کا کوئی دوش نہ تھا۔ شاید اس وقت ان کو احساس ہوا ہو کہ اگر برابر کی سزا ہی ملنی تھی تو پھر وہ ہمارے ساتھ پورا حصہ لیتے اور اس کار نیک میں پیچھے نہ رہتے مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ پانچوں حضرات ہمارا ہاتھ بٹاتے تو ہم کبھی کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہوتے۔ لیکن یوں نہ ہونا تھا نہ ہوا۔

ہمارے دو کمروں کو بالکل خالی کر دیا گیا۔ ہماری تفصیل سے تلاشی لی گئی۔ پانچ پانچ افسروں کو ایک ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ کھڑکیوں پر جالی نصب کر دی گئی۔ لیکن کھڑکی کے قریب کھڑا ہونے کی اجازت نہ تھی۔ بس ایک پہنی ہوئی وردی میں صاف ستھرے فرش پر دراز ہو گئے کمرے میں صرف ایک صراحی تھی ایک دم سے زندگی نے سادہ ترین صورت اختیار کر لی۔ یہ بیش قیمت تجربہ تھا۔ انسان ضروریاتِ زندگی کو کس قدر پیچیدہ مسئلہ بنا دیتا ہے۔ پلنگ، قالین فرنیچر، بستر، پھر نرم بستر، روئی کے گدے اور کیا کیا۔ تمام کچھ ہونے کے باوجود دل کو تسلی نہیں ہونے پاتی۔ بجلی کا کنکشن باہر سے کاٹ دیا گیا۔ جاتلے نے ہمیں بتایا کہ بجلی باہر سے خراب ہو گئی ہے۔ آخر لالہ نکلا، سچ بولنے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔

سرنگ کے اندر بیحد گرمی تھی، لیکن جب تکلیف سر پر پڑ جائے تو خدا قوت برداشت بھی عطا کر دیتا ہے پہلے دو دن سوکھی روٹیوں پر گزارہ کرنا تھا۔ یہ سب کچھ صریح طور پر جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی تھی۔ اگلے روز دو روٹیوں سے پیٹ بھرنے کی قدر معلوم ہوئی۔ جب پیٹ بھر کر آدمی کو ملتا رہتا ہے تو وہ روٹی کی صحیح قدر ہی محسوس نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں کی

فاقہ کشی نے روٹی کی اہمیت کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیا محض سوکھی روٹی حلق سے نیچے اتارنی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ وہ کھائی نہیں جاتی پیٹ میں پھینکی جاتی ہے کسی کڑوی دوائی کی طرح۔ ذرا سا نمک یا پیاز روٹی کو حلق سے نیچے اتارنے میں کتنی مدد دیتا ہے۔ ان بیچارے غریبوں کا کیا حال ہوتا ہو گا جو ساری عمر سوکھی روٹی کھا کر گزارہ کرتے ہوں گے، کبھی مولی کے ساتھ، کبھی پیاز کے ساتھ اور اکثر پانی کے ساتھ۔ ان کے ساتھ سچی ہمدردی اپنے سر پر ایسی حالت پڑنے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے ورنہ ایک کھاتا پیتا انسان کبھی ایسے لوگوں کی صحیح حالت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ ماہِ رمضان میں روزے رکھنے والوں کو اس بات کا احساس کچھ حد تک ہوتا ہے مگر ایک تو وہ رضا کارانہ طور پر روزے رکھتے ہیں پھر سحری وافطاری کے وقت دن کے فاقہ کی پوری کسر نکال لیتے ہیں۔ باوجود ان صعوبتوں کے دل کو ایسی تسکین تھی جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اگر مجھے نئے سرے سے اس بات کا فیصلہ کرنا ہوتا کہ ویسے ہی حالات میں انہی نتائج کے ساتھ میں کیا کروں گا۔ تو بھی میرا فیصلہ یہی ہو گا جو میں نے ماضی کے حالات میں کیا تھا، فرض کو پورا کرنے کی خاطر اور اپنے دل کو تسکین کے لئے مصیبتوں کو سہنے میں جو مزہ ہے وہ ہر طرح کی آسائش اور آرام سے بہت بالا ہے۔

ان دنوں گرم فرش بے حد تسکین دہ ثابت ہوا۔ ناکامی کے باوجود ہمیں بے حد ہنسی آئی ایک دوسرے سے ٹھٹھا مذاق کیا۔ وہ تکلیف تو سہنی ہی تھی۔ اس کے متعلق فکر کرنے سے اس میں کمی تو نہ کی جا سکتی تھی۔ جا تلے اور وید کو بیحد غصہ تھا۔ اس غصے میں وہ اپنا توازن کھو چکے تھے۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر ہمیں مسرت ہوتی۔ آخر تین ماہ ان کی آنکھوں کے سامنے کام ہوتا رہا اور ان کو پتہ نہ چلا۔ اس لئے وہ کافی شرمندہ تھے، سرنگ کے اندان میں سے ایک نے گھسنے کی کوشش کی مگر سانس رُکنے کی وجہ سے باہر بھاگا۔ لنکا تو گھر کے بھیدی نے ڈھائی تھی اس کے پتہ لگانے میں وہ خود فخر نہ کر سکتے تھے۔

اگلے روز ہمارے کمروں کی انتہائی بے رحمی سے تلاشی لی گئی، کمروں میں ہر چیز

اس طرح پھینکی گئی کہ کمرے کباڑی بازار دکھائی دیتے تھے۔ ہر چیز پر کالے رنگ سے اس انداز سے نشان دہی کی گئی کہ ان کے اصلی رنگ سے کالا رنگ زیادہ نظر آتا۔ تھرماس کے اندر پی او ڈبلیو کا نشان لگا دیا گیا۔ کرنل مرزا کی قیمتی گھڑی کیپٹن جا تلے لے اڑے اور میرے بیس روپوں کے کوپن نکال لئے۔ ہمیں ایک ایک کمبل اور صابن تولیہ کی اجازت دی گئی پھر واپس ان دونوں کمروں میں بند کر دیا گیا۔

کچھ دیر کے بعد چند فوجی سپاہی ہتھکڑیاں لے کر آئے۔ مجھے باہر بلایا گیا اور میرے دونوں ہاتھ پشت پر ہتھکڑیوں میں جکڑ دیئے گئے اور مجھے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ دل میں طرح طرح کے خیال آئے گولی مار دیں گے ...... اغلباً نہیں ..... زد و کوب کیا جائے گا..... شاید یونہی تکلیف دینے کے لئے لے جایا جا رہا ہے ...... اغلباً ...... ہر بدترین سلوک کے لئے میں تیار تھا۔ اس کے علاوہ چارہ بھی تو نہ تھا۔ مجھے تین چار سو گز دور ایک بارک کے باہر دھوپ میں زمین پر بٹھا دیا گیا۔ زمین بیحد گرم تھی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ کرنل شریف۔ جعفری۔ ستار اور فضل حق کو بھی ہتھکڑیاں لگا کے لایا جا رہا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان کے ایک ایک ہاتھ ہتھکڑی میں بند تھے۔ میں حیران ہوا کہ یہ کرنل فضل حق کو کس بنا پر دھر لیا گیا ہے۔ اصل میں انہوں نے غلطی سے فضل حق کو آفتاب سمجھا تھا۔ جب سکھا شاہی ہو تو کون کسی کو کچھ کہہ سکتا ہے۔ مجھے ایک دفتر میں لے جایا گیا۔ جہاں کرسی پر ایک افسر سویلین کپڑوں میں بیٹھا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ انٹیلجنس کا آدمی تھی۔ میں نے تعریف پوچھی تو بولا "شکلا" میں نے پوچھا میجر شکلا، تو اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر ہاں نکل گئی۔ میں نے پوچھا کیا خدمت کر سکتا ہوں، کہنے لگا اس سرنگ کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں، میں نے کہا اس کے لئے نہ ہتھکڑی ضروری تھی اور نہ دھوپ میں بٹھانا لازمی تھا۔ بے خطر پوچھیے جتنا بتاؤں گا سچ بتاؤں گا۔ جھوٹ بولنا سپاہی کا شیوہ نہیں، پوچھا کب کام شروع کیا تھا، تین ماہ پہلے میں نے کہا۔ تین ماہ پہلے! تو یہ سب

اُلو کے پٹھے کیا کرتے رہے ...... یہ اِن اُلو کے پٹھوں سے پوچھیے۔ باہر سے کیا مدد لی گئی تھی؟ کیا پیر اسنٹر کے افسروں کو علم تھا؟ سنتریوں کے سامنے مٹی کیسے نکالی جاتی تھی؟ کیا سارا کام رات کے وقت کیا جاتا تھا، کھودنے کے اوزار کہاں سے آئے؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اس کے سوالوں کا موزوں جواب دے دیا۔

میں نے اس سے ہمارے ساتھ کئے جانے والے سلوک کی شکایت کی۔ ظاہراً تو وہ میرے ساتھ متفق تھا کہ سپاہی کے ساتھ سپاہیانہ سلوک ہی کیا جانا چاہیے لیکن عملی طور پر کچھ کرنا شاید اس کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔ اس کے سوالات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اس بات کا شک تھا کہ ہمیں پیر اسنٹر کے افسروں نے کچھ مدد دی ہے، میں نے اُسے بتایا کہ یہ نہ صرف ایک گمراہ کُن خیال ہے بلکہ پیشہ سپہ گری پر گہری ضرب بھی، اپنوں کو بداعتمادی کی نظر سے دیکھنا، یا ایک سپاہی کا دوسرے سپاہی کو خواہ وہ دشمن کا سپاہی ہی کیوں نہ ہو DISLOYALTY پر اکسانا نہایت گرے ہوئے عمل ہیں اور ہم سے ایسی ناجائز حرکت کی توقع کرنا نامناسب بات تھی۔ ہمیں پیر اسنٹر والوں نے کسی قسم کی مدد نہیں دی۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ پیر اسنٹر کے چند افسروں کے خلاف انکوائری بھی ہوئی میجر صاحب سنگھ کی آئی۔ ایم۔ اے کی پوسٹنگ منسوخ کر دی گئی۔ میں نے میجر شکلا کو مزید بتایا کہ فرار کی کامیابی کا مزہ جب ہے کہ اس کے لئے کی گئی تدابیر بھی قابل فخر اور جنیوا کنونشن کی حدود میں رہ کر کی گئی ہوں۔ مثلاً سنتریوں کے ساتھ زبردستی یا تشدد استعمال کرنے کی جنیوا کنونشن اجازت نہیں دیتا، لیکن روپے کی چوری، بغیر ٹکٹ سفر، سائیکل کی کار کی چوری، اگر اس مقصد کے لئے کی جائے کہ وہ فرار کی راہ میں معاون ثابت ہو سکے تو جائز ہے ان تمام حدود کا ہمیں خیال تھا اور ہم نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو ان جائز حدود سے باہر ہو کیونکہ اگر ہم ایسا کرتے تو جرم کے مرتکب ہوتے۔

میرے بعد باری باری دوسرے چاروں افسروں کو بھی پوچھ گچھ کے لئے بلایا گیا ہمیں باہر برآمدے میں ہتھکڑیاں لگائے بٹھائے رکھا۔ پھر لیفٹننٹ کرنل آنند سنگھ جو گوالیار کے

تینوں کیمپوں کا گروپ کمانڈر تھا آیا، اس نے ہماری مہم کی بیحد مذمت کی۔ ہم نے اس کو بتایا کہ جہاں ہم نے اپنے حقوق کی حد میں رہ کر عمل کیا تھا وہاں ان کا رویہ جائز حقوق سے تجاوز کر گیا تھا۔ لیفٹننٹ کرنل فضل حق نے کہا۔

"ان چاروں نے تو فرار کی کوشش کی ہے لیکن مجھے کس جُرم کی پاداش میں سزا دی جا رہی ہے۔ مجھے تو خدا کی قسم ابھی بھی اس بات کا علم نہیں کہ سرنگ کس جگہ پر ہے میں تو کبھی اس کے نزدیک تک نہیں گیا۔"

آنند سنگھ بولا۔ اگر یہ چاروں آپ کے کہنے کی تصدیق کریں تو میں پھر کچھ فیصلہ کر سکتا ہوں"۔ اس پر ہم چاروں نے اُسے بتایا کہ فضل حق کا کہنا بالکل درست ہے۔ اس پر اس نے سنتری کو ان کی ہتھکڑی اتارنے کا حکم دیا۔ البتہ ہمیں ویسے ہی بندے بندھائے بارک میں لایا گیا، مجھے اور کرنل شریف کو ایک کمرے میں، جعفری، ستار اور آفتاب کو ساتھ والے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اور باقی پانچوں کو دوسرے کمروں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ ان کے کمروں کے دروازے کھول دیئے گئے اور ان کو برآمدے میں نکلنے کی اجازت مل گئی۔ ہمیں بیس دن قید در قید کی سزا سنائی گئی۔ جو وردی ہم نے پہن رکھی تھی اس پر بے تحاشہ طور پر پی او ڈبلیو کی نشاندہی کی گئی۔ میرے چاروں ساتھیوں نے چونکہ انڈر ویئر پہن رکھے تھے انہوں نے وردیوں کو اچھی طرح دھو ڈالا۔ کیونکہ اس رنگ میں تیزاب کی آمیزش تھی۔ میں وردی کو نہ دھو سکا جس کی وجہ سے میرے سارے جسم اور منہ پر سرخ ریشہ نکل آیا۔ طبی امداد کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، اُوپر گرمی اور پسینہ اور ساتھ یہ نئی تکلیف سہنے کے علاوہ چارہ نہ تھا،

جب ہماری تلاشی لی جا رہی تھی تو کرنل ستار نے ایک پیچ کس کموڈ کے اندر چھپا دیا تھا۔ جب ہمیں کمرے میں بند کر دیا تو میں نے وہ پیچ کس نکال کر صراحی میں ڈال دیا تاکہ کہیں اگر ضرورت پڑے تو کام آسکے۔ ہمارے اور جعفری وغیرہ کے کمروں کے درمیان

والے دروازوں کو میخوں سے بند کر دیا گیا تھا تاکہ ہم پانچوں اکٹھے ہو کر نہ بیٹھ سکیں، ہم نے پیچ کس کی مدد سے میخوں کو ڈھیلا کیا تاکہ وقتاً فوقتاً اکٹھے بیٹھ کر گپیں مار سکیں، یہ بات نہیں تھی کہ ہم علیحدہ نہیں رہ سکتے تھے بلکہ ایسا کرنے میں ایک کوشش تھی، ناکامی اور تکلیف میں ایسی کوشش میں ڈھارس تھی ہر روز دن میں تین چار مرتبہ ہم اکٹھے بیٹھ کر گپیں مارتے اور ایسا کرنے سے ہمیں تسکین ملی۔

کرنل جعفری نے کھڑکی سے ایک گتہ نکالا اور اس پر شطرنج کے خانے بنائے۔ میں نے پتھر چونے اور سیمنٹ کے ٹکڑے دیوار سے نکال کر ان کے مہرے بنائے۔ چنانچہ یوں مشغول رہنے کے لئے اچھا شغل مل گیا جس سے ذہنی مشق بھی ہو جایا کرتی۔ کیونکہ نہ ہی اخبار ملتا تھا اور نہ ہی ہمارے پاس کوئی کتاب تھی، بے کاری سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوا کرتی ہے صبح کو اکٹھے مل کر کمرے میں کبھی شعر و شاعری بیت بازی اور کبھی کچھ گانا بجانا ہو جاتا۔ کمرے کے اندر پی ٹی کی جاتی تاکہ جسمانی طور پر ٹھیک رہیں۔ کچھ دیر کسوٹی کھیلنے میں گزار دیا جاتا۔ شطرنج کی چند بازیاں لگا لی جاتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ باوجود بھوک، گرمی، ننگے فرش اور کمرے کے اندر بند ہونے کے ہم پانچوں نے مل کر ہر لمحہ ہنسی خوشی گزارا۔

ہمیں ایک گھنٹہ کے لئے صبح اور ایک گھنٹہ کے لئے شام کو باہر برآمدے میں نکالا جاتا باقی تمام وقت کمروں میں بند رکھا جاتا۔

۸ مئی کو بریگیڈیر گھوش آیا۔ سرنگ کی خبر سننے کے بعد وہ اپنا توازن کھو بیٹھا تھا۔ غصے کے مارے اُس کے مُنہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ اس نے ترش کلامی سے کام لیا اور ہمیں یہ بتانے کی کوشش کہ باوجود اس کی مراعات کے ہم نے فرار کی کوشش کر کے بڑا جرم کیا ہے، ایسے شخص سے بحث فضول تھی، ہم نے چپ رہنے میں مصلحت سمجھی۔ غصے میں بھنبھناتا ہوا وہ ہمارے کمروں میں گیا اور پاؤں کی ٹھوکر سے تمام صراحیاں توڑ ڈالیں کہ اب یہ گرم پانی پئیں گے۔ ہمارے کمرے میں پڑی صراحی کو ٹھوکر ماری تو پیچ کس باہر

نکلا جو مزید غصہ بڑھانے کا سبب بنا۔ جونیئر افسروں کے بلاک میں گیا تو ان کو نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیا۔ اس پر لیفٹننٹ منیر احمد بٹ نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے احترام اور سپاہیانہ شان کے ساتھ کہا" جناب سپاہی نیچے دیکھنے کے عادی نہیں ہوا کرتے"۔ اس پر بریگیڈیر گھوش کو طیش آیا اور منیر کے منہ پر اس نے دو چار تھپڑ رسید کئے اور وہاں پر کھڑے تمام افسروں کو غلیظ گالیاں بکیں۔ منیر نے یوں کہہ کر انتہائی دلیری کا مظاہرہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تھپڑ منیر کے منہ پر نہیں پوری بھارتی فوج کے سیاہ چہرے پر رسید ہوا۔ اور وہ گالیاں جنگی قیدیوں کو نہیں بلکہ اس قوم کو گئیں جس کا وہ بریگیڈیر ایک فرد تھا۔ اتنے سینئر افسر سے اس قدر گھٹیا کردار غیر متوقع تھا، گھوش اپنے صحیح رنگ میں ۸ مئی کو ظاہر ہوا۔ اور اپنی قومی ذہنیت کا مظاہرہ اس نے اس روز کیا۔ اس سے پہلے وہ منہ میں رام رام الاپتا دکھائی دیتا تھا۔ لیکن ۸ مئی کو اس کی بغل کی چھری ظاہر ہوئی۔

چوتھے دن سے ہمیں آدھے راشن پر کر دیا گیا۔ تین دن سوکھی روٹی کھانے کے بعد جب پہلے دن دال ساتھ آئی تو کھانے کا بے حد مزہ آیا۔ گویا وہ دال نہ تھی مرغا تھا، بھنا ہوا مرغا تین دن ہی میں دال کی اہمیت اور اس کی لذت کا احساس ہو گیا۔ ہماری سرنگ پورے سٹیشن میں عجوبہ بن گئی، ہم ہر روز دیکھتے کہ فوجی افسر اُسے دیکھنے آتے، چند نے کام کی بڑی تعریف کی کہ بڑی صفائی سے کیا گیا تھا۔ لیکن اکثر کو اس بات پر حیرانی تھی کہ اس کو اتنے لمبے عرصہ تک پوشیدہ کیسے رکھا گیا۔ اُن دنوں اندرا بھٹو مذاکرات کے متعلق خبریں آنی شروع ہوئی تھیں۔ دور کہیں ریڈیو کی آواز آتی تو ہم کان لگا کر سنتے مگر سمجھ میں کم ہی کچھ آتا۔ باہر کے حالات کا پتہ چلتے رہنے سے کتنی تسلی ہوتی ہے۔ خبروں سے لاعلمی اور باہر سے لاتعلقی ضرور کچھ حد تک گھٹن پیدا کرتی ہیں۔ یہ سب انسانی ضروریات زندگی ہیں۔ بہر صورت اگر انسان ذہنی طور پر ماحول پر اکتفا کر لے تو تمام ضروریات زندگی کی اہمیت کو قابل برداشت حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔

مجھے شیخ سعدی کی وہ حکایت یاد آئی جو کبھی سکول کے زمانے میں پڑھی تھی۔ کتنی صداقت تھی ان کے خیالات میں کہ وہ سفر کے لئے نکلے تو انہوں نے اپنے آپ سے کہا کہ زندگی کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں باقی تمام کے بغیر گزارہ کیا جا سکتا ہے' ایک پانی پینے کے لئے پیالہ اور ایک سونے کے لئے تکیہ' یہ دونوں چیزیں وہ لے کر سفر کے لئے نکلے کچھ دُور گئے تو انہوں نے ایک آدمی کو ہاتھ کا چلو بنا کر پانی پیتے دیکھا تو انہوں نے پیالہ پھینک دیا۔ کہ یہ بھی ضروری نہیں۔ شام کو رات گزارنے کے لئے ٹھہرے' ایک آدمی کو دیکھا کہ بازو کا تکیہ بنائے بڑے مزے کی نیند سو رہا تھا چنانچہ انہوں نے تکیہ بھی پھینک دیا۔ ضروریات زندگی تو انسان کے ذہنی رجحان کی اختراع ہیں ان کو جس قدر چاہے کم کر لے اور جس قدر چاہے بڑھا لے۔

۱۸ مئی تک یونہی دن گزر گئے۔ ہماری حالت جونیئر افسروں سے بہتر تھی جن کو بارہ عدد فی کمرہ کے لحاظ سے بند کیا ہوا تھا۔ اٹھارہ مئی کو ہمیں جونیئر افسروں کے کیمپ کی ایک بارک میں لایا گیا۔ اسی بارک میں ۲۴ جونیئر افسروں کو بھی لایا گیا جن کو سزا ملی تھی۔ اس بارک کے ارد گرد کانٹے دار تار کی ایک نئی باڑ لگا دی گئی تھی اور کھڑکیوں پر موٹی جالی نصب کر دی گئی تھی۔ اس بارک کے پانچ کمرے تھے' ہم پانچوں کرنلوں کو ایک کمرہ میں اور باقی جونیئر افسروں کو چھ چھ کے گروپوں میں ایک ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ دوسرے افسر جن کو سزا نہیں ملی تھی میس والی بلڈنگ اور ساتھ والی بیرک میں مقیم تھے۔ ان کو چارپائیاں ملی ہوئی تھیں' پنکھے اور بجلی کی مراعات تھیں' یہاں بھی ہمارا معمول وہی رہا جو پچھلے تیرہ دن کے دوران رہا تھا۔ ۲۲ مئی کو میجر جنرل بڈھا تشریف لائے' یہ ایک سکھ افسر تھا اور ایریا کمانڈر تھا۔ ہم اس افسر کی صاف گوئی اور سپاہیانہ طرز گفتگو سے کافی متاثر ہوئے۔ یہ پہلا بھارتی افسر تھا جس نے اپنی مختصر سی تقریر میں ہمیں بتایا کہ "جو کچھ آپ لوگوں نے کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ آپ کو فرار کی کوشش کا پورا حق پہنچتا ہے اور آپ

کے لئے یہ قابلِ فخر بات ہے کہ آپ میں سے چند نے فرار کا حق استعمال کرنیکی کوشش کی، اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ آج سے تمام پہلے والی مراعات بحال کردی جائیں گی۔ سوائے اس کے کہ سیکورٹی کا بندوبست ذرا سخت ہوگا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ" آپ پہلے بھارتی افسر ہیں جنہوں نے ہماری فرار کی کوشش کو سپاہیانہ انداز میں لیا ہے ورنہ باقی تمام نے تو ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے جیسے ہم نے کوئی بڑا ذلیل جرم کیا ہے۔ وہ بولا' مجھے اس کا افسوس ہے کہ آپ کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ لیکن میری حوصلہ افزائی کا کسی اور سے ذکر نہ کرنا ورنہ ہمارے اپنے حکام یہ کہیں گے کہ میں آپ کو فرار کی ترغیب دیتا ہوں۔

اس روز سے ہماری سزا ختم ہوگئی۔ ویسے ہم انہی کمروں میں رہے۔ صرف کمروں کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اخبار ملنی شروع ہوگئی۔ اور کھیلنے کے لئے شطرنج مل گئی۔ اب جونیئر افسروں سے مل کر گپ شپ لگائی جا سکتی تھی۔ چنانچہ موسیقی کی محفل رات کے وقت منعقد ہونا شروع ہوگئی۔

یہ لکھنا میں بھول گیا کہ ۹ مئی کو دو عدد کندۂ ناتراش قسم کے حجام ہمارے پاس لائے گئے جن کو حکم تھا کہ ہماری صحیح معنوں حجامت کردیں۔ ان میں سے ایک کو تھوڑی بہت قینچی چلانی آتی تھی، دوسرا بھنگی تھا۔ مختصر یہ کہ دونوں نے مل کر ہمارے سروں کو یوں مونڈا جیسے بکرے مونڈے جاتے ہیں۔

کپڑوں پر لگائے گئے رنگ کی وجہ سے چونکہ میرے جسم اور منہ پر سرخ ریشہ نکل آیا تھا اس لئے میں اتنے روز شیو نہ کر پایا، اور داڑھی بڑھ آئی تھی۔ ۲۴ مئی کو کرنل آنند سنگھ آیا۔ داڑھی بڑھا لینے کا سبب دریافت کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے سائزاگو گو کی بیماری ہوگئی ہے۔ یہ بھیانک نام سن کر وہ بوکھلا سا گیا۔ اسی روز اس نے بھارتی ڈاکٹر بھیجا جس نے دوائی دی جس کے لگانے سے چند روز کے بعد مجھے کچھ

آفاقہ محسوس ہونے لگا۔

۲۵ مئی کو بریگیڈیر گھوش آیا اس کے ساتھ ایک اور بریگیڈیر تھا۔ ہمیں معلوم کہ بریگیڈیر گھوش کو بدل دیا گیا ہے اور اس کی جگہ بریگیڈیر کٹاریہ سب ایریا کمانڈر لگا ہے۔ یہ اچھی سلخت کا لمبا تڑنگا بڑی بڑی مونچھوں والا بریگیڈیر تھا۔ بڑی شستہ اردو بولتا تھا اور بڑے خلوصانہ انداز میں گفتگو کرتا، لیکن منہ میں رام رام بغل میں چھری والا بنیا ثابت ہوا۔ ذہنیت سراسر ہندوانہ تھی، بول میٹھے تھے اور کردار خطرناک،

اس بیرک میں آنے کے بعد پھر سے تلاشی لی گئی۔ میرے پاس کچھ ہندوستانی کرنسی تھی جو میں ہر صورت میں چھپا کر رکھنا چاہتا تھا تا حال میں اسے چھپانے میں کامیاب رہا تھا۔ باہر نکلنے کے بعد تھوڑی بہت رقم کی اشد ضرورت تھی کون کہہ سکتا تھا کہ کس وقت فرار کا موقعہ مل جائے۔ یہ دو تین نوٹ میں نے پولی تھین بیگ میں ڈال کر اس کی چھوٹی سی گتھی بنا کر جس پر لمبا دھاگا باندھ رکھا تھا، کموڈ کے اندر چھپا دیئے تھے، ایک صاحب کے پاس کوئی ہزار بارہ سو روپے کی رقم تھی جو اس نے ڈھاکہ میں بھارتی افسروں کے پاس اپنی کچھ چیزیں سستے داموں فروخت کر کے وصول کی تھی تلاشی کے وقت وہ کیپٹن جاتلے کے ہاتھ لگی اور اس نے اسی میں بہتر سمجھی کہ وہ نہ اس کی رپورٹ کرے اور نہ ہی رقم سرکاری خزانہ میں جمع کروانی پڑے، چنانچہ وہ اسے اپنے باوا کی جائیداد کا کرایہ سمجھ کر جیب میں ڈال کر چلتا بنا، میرے ان دو تین نوٹوں کو چھپانے کی مہم بھی ایک پوری داستان ہے ہر تلاشی کے وقت اسے غائب کرنا ایک جدوجہد بن چکی تھی، ہر کمرے کی چھت پر چڑھ کر دیکھا گیا۔ ساتھ کی بیرک کی چھت سے پتلونوں کے پائنچوں میں بھری ہوئی مٹی کی تھیلیاں برآمد ہوئیں۔ ایک بیرک کی چھت کے اندر سے غیر نشان والے کپڑے پکڑے گئے۔ ہمارے والی بارک میں پہلے کے کچھ غیر نشان شدہ کپڑے چھپائے ہوئے تھے انہیں تلاشی لینے والوں کے آنے سے پہلے ہی نکال کر باہر گھاس میں چھپا دیا گیا اور یوں وہ پکڑے جانے سے بچ گیا۔ جو کپڑے برآمد

ہوئے وہ بھارتی حکام نے ضبط کر لئے۔

یہاں جب بیس روز کے بعد پہلی دفعہ اخبار ملا تو خبروں کے معلوم کرنے کی جستجو کا جذبہ بھاری تھا، جب کوئی اخبار نہ ملے تو انسان سمجھتا ہے کہ اتنے دنوں میں کیا کیا ہو چکا ہو گا مگر جب روزانہ اخبار ملنا شروع ہو جائے تو وہ بے خبر اسا معلوم ہونے لگتا ہے۔ سب سے اہم خبر یہ تھی کہ بھٹو اندرا مذاکرات شملہ میں ۲۸ جون کو ہونے طے پائے تھے۔

اس کیمپ میں ہمارے لائے جانے کے ساتھ ہمارا کتا جیکی بھی ہمارے ساتھ یہاں آگیا۔ وہ باڑ کی تاروں سے گزر کر کمرے کے باہر آ بیٹھا کرتا۔ بڑا وفادار کتا تھا۔ ایک دن کیپٹن وید آیا اور کہنے لگا کہ یہ کتا اندر نہیں آئے گا۔ میں نے کہا کہ اس کے اندر نہ آنے کا وہ خود ہی بندوبست کرے، اس نے حوالدار تھاپا کو کہا کہ کتے کو پکڑ کر کہیں دُور چھوڑ آ جائے۔ چنانچہ دو تین دفعہ کتے کو بوری میں ڈال کر لے جایا گیا مگر وہ ہر دفعہ شام کو واپس میرے کمرہ کے دروازے کے باہر واپس آ پہنچا۔ وید اسے دیکھ کر بڑا جلتا۔ ایک روز اس نے اسے بندھوا کر ڈنڈوں کے ساتھ اتنا مارا کہ اس کی کمر کی ہڈی اور دونوں پچھلی ٹانگیں توڑ ڈالیں۔ بے چارہ جیکی اس کے بعد بڑی مظلوم حالت میں پچھلی ٹانگیں گھسیٹ کر بڑے دردناک انداز سے گھسٹتا دکھائی دیا کرتا۔ یہ تھی بھارتی افسر کی ذہنیت کی روئیداد۔

۲۸ مئی کو ہمیں بمعہ اپنے سارے سامان کے جو ایک سٹور میں بند رکھا تھا لیکر تیار رہنے کا حکم ملا کہاں اور کس طرف کو کوچ کرنا تھا اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ ہر کوئی اپنا اپنا اندازہ لگا رہا تھا۔ ایک رازدار سے راز افشا ہوا۔ کہ قریب ہی دوسری بیرک میں لے جانے کا پروگرام ہے، سب کی پھر سے تلاشی لینے کا کام شروع ہوا۔ یہاں سے نوٹوں کی گتھی لے جانے کا مسئلہ ذرا مشکل تھا۔ میں نے ایک گتے کے ٹکڑے کو یوں گول کاٹا کہ بالٹی کے نیچے پیوست ہو جائے۔ نوٹوں کو بالٹی کے نیچے رکھ کر اُوپر گتہ لگا دیا اور بالٹی میں پانی بھر دیا تاکہ اسے الٹا کر کے دیکھنے کی نوبت نہ آئے۔ تلاشی کے بعد ہم سب کو بمعہ ہمارے سامان کے ٹرکوں میں بٹھا

کر ہمارے جوانوں کے قریب کی ایک بیرک میں لے آئے۔ یہ جگہ پہلے بھارتی سپاہیوں کی رہائش گاہ تھی۔ اب یہ ہمارا نیا کیمپ تھا۔ اس بیرک کے ارد گرد کانٹے دار تار کی دو رویئں لگاکر دوسری بیرکوں سے بالکل الگ کر دیا گیا تھا۔ اس بیرک میں پانچ بڑے کمرے اور ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ بڑے کمروں کا سائز ۴۸ × ۱۸ تھا۔ چھوٹے کمروں میں تین افسروں کو اور چار بڑے کمروں میں پندرہ پندرہ افسروں کو رکھا گیا تھا۔ ایک ایک کمرے میں اردلی اور خانساماں وغیرہ تھے جن کی تعداد چوبیس تھی۔ چارپائیاں یہاں پر موجود تھیں۔ ہر کمرے میں بجلی کے دو پنکھے لگے ہوئے تھے۔ چیزیں اور کپڑے جو ہم پاس رکھ سکتے تھے ان کی سکیل مختصر تھی، یعنی ایک دری ایک کمبل، ایک تولیہ، دو وردیاں ایک تکیہ، ایک سیلپنگ سوٹ، ٹائلٹ اور شیو کا سامان اور ایک عدد مچھر دانی، باقی تمام سامان سٹور میں رکھوا دیا گیا۔ ریڈیو، گھڑی رکھنے کی اجازت نہ تھی لاوڈ سپیکر کا بندوبست تھا جس پر پاکستانی اور آل انڈیا ریڈیو کی خبریں نشر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ فلمی گانے براڈ کاسٹ کیا کرتے تھے۔ شام ڈھلے ہی کمروں میں چلے جانے کی ہدایت تھی۔ فیلڈ لیٹرین (میدانی ٹٹی خانہ) زمین کھود کر اور ٹاٹ لگا کر بنایا گیا تھا۔ غسلخانے ذرا بیرک سے ہٹ کر تھے۔ ان کے تمام دروازے اور کھڑکیاں اتار دی گئی تھیں تاکہ اندر نہاتا ہوا آدمی باہر سے دکھائی دے۔ یہ سیکورٹی کے مد نظر کیا گیا تھا تاکہ غسلخانوں میں کھدائی کا کام نہ کیا جا سکے پڑھنے کے لئے کتابیں رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ صحن میں ایک طرف عارضی باورچی خانہ بنا دیا گیا اس بارک میں پہنچتے ہی میں نے وہ مختصر بھارتی کرنسی چھپانے کا بندوبست کیا۔ چارپائی کے پائے کے نیچے سوراخ کیا۔ نوٹوں کی بتی بنا کر اس کے اندر ٹھونسے اور اوپر لکڑی کا ٹکڑا لگا کر مٹی سی لگا دی۔ یہ نیا ماحول اور نیا رویہ ایک قید خانے کے سے تاثرات پیدا کرتا۔ صبح کو ایک اردلی چائے کی بڑی کیتلی لئے اور دوسرا پوڑیوں کا تھابہ اٹھائے آ جاتا۔ ہر افسر چارپائی پر بیٹھا پوری اور چائے وصول کرتا، کھا پی کر پلیٹ اور مگ صاف کرتا، دوپہر کو اسی طرح بالٹی میں سالن لئے باورچی آتا، اپنی چارپائیوں پر ہی کھانا مل جاتا۔ کوئی اکیلے بیٹھ کر کھاتا اور کئی

تین تین چار چار کی ٹولیوں میں بیٹھ کر کھاتے۔ بعد از دوپہر چائے ملتی اور شام کو سورج کے غروب ہوتے ہی کھانا مل جاتا۔ دوپہر کو ہر روز دال ملتی اور شام کو آلو بینگن اور اکثر حلوہ کدو کی ترکاری ہفتے میں تین دفعہ شام کے وقت گوشت ملتا۔ غذا اس سے زیادہ کیا سادہ ہوگی۔ میں نے پورے قیام کے دوران اسی سادہ غذا پر گذار کیا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ سادہ غذا صحت مند اور تندرست رکھتی ہے۔ لذیذ غذا اور مزیدار چیزیں ہوں تو ظاہر ہے کہ آدمی کھاتا ہے جس سے پیٹ میں تکلیف، سر میں درد اور ان سے پھر اور بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ معدہ ٹھیک رہے تو صحت ٹھیک رہتی ہے اس نئی سائنس نے وٹامنوں اور پروٹینوں کا انکشاف کر کے اور فوڈ ویلیو کو اہمیت دے کر کچھ اس طرح کی ذہنیت پیدا کر دی ہے کہ ہمارے کئی ساتھیوں کو ہر وقت یہی فکر لاحق رہتا کہ اس سادہ غذا سے شاید صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔ اس لئے وہ ہر وقت اس کوشش میں ہوتے کر NOURISHMENT کے لئے وٹامن کی گولیاں واٹر بری کمپاؤنڈ اور الا بلا کھا کر اپنے آپ کو تسلی دیں۔ ہمارے اپنے ڈاکٹروں کا اندازہ تھا کہ جو ہمیں غذا ملتی ہے اس کی ۲۵۰۰ کے قریب کیلوریز بنتی ہے اور یہ ہمارے لئے کافی ہیں۔ خاص طور پر ہمیں یہاں کوئی جسمانی یا ذہنی کام نہیں کرنا تھا۔ اکثر کا وزن کم ہوا مگر وہ غذا کی کمی کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ غیر ضروری ذہنی تفکرات کی وجہ سے! صحت کا راز سادہ غذا اور ذہنی سکون میں مضمر ہے۔ اگرچہ ان حالات میں مکمل ذہنی سکون کا حصول شاید ناممکن تھا۔ لیکن حالات خواہ وہ سازگار ہوں یا ناسازگار ان سے ایسے انداز سے نبرد آزما ہونا ضروری ہے کہ وہ ہمیں اپنا محکوم نہ بنالیں ذہنی سکون کے حصول کے لئے ایسا اندازِ فکر معاون ثابت ہوتا ہے۔ خوشی کے وقت آپے سے باہر ہونا بھی صحت کے لئے زیادہ مفید نہیں اور مشکل وقت میں مایوس ہونا اور اپنے آپ کو کس مپرسی کی حالت میں دھکیلنا تو بے حد مضر ہے۔ ناسازگار حالات میں دل کو چھوڑنے کی بجائے کسی نہ کسی طرح کی کوشش جاری رکھنے۔ وقت کو مفید طور پر صرف کرنے اور خدا کی رضا پر یقین رکھنے سے ذہنی طور پر آدمی تسکین حاصل کرتا ہے۔ حالات انسان کے تابع

رہنے چاہیئے نہ کہ انسان حالات کا تابع۔ اسکے علاوہ یہ نہایت ضروری ہے کہ ماحول کی مطابقت میں اپنی عادت کو ڈھالا جائے جہاں تک اصولوں کا تعلق ہے ان پر تو ہر صورت میں کاربند رہنا چاہیے۔ چاہے حالات کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن کھانے پینے۔ رہنے سہنے، ملنے جلنے کے طور اطوار اگر ماحول سے ہم آہنگی اختیار کرلیں تو انسان غیر ضروری ذہنی کوفت سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے مثلاً اگر کوئی یہ چاہے کہ نظر بندی میں بھی افسرانہ ٹھاٹھ باٹھ برقرار رہے، اسے گہری خندق کی ٹٹی جو گندگی سے بھری ہو اور جہاں گندگی کو کیڑے کھاتے دکھائی دیتے ہوں، حاجت روائی کرنے میں گھن آئی ہو۔ غسلخانے میں سب سے مل کر نہانے میں عار محسوس ہوتی ہو بالٹی میں لائی ہوئی ترکاری کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائے۔ ایک ہی بیرک میں سب کے ساتھ رہتے ہوئے جہاں دونوں طرف چارپائیاں ساتھ لگی ہوں پرائیویسی کا متمنی ہو اگر وہ چاہے کہ COMMUNITY LIVING کے باوجود اس کے ذوق و مذاق کا ہر کوئی خیال رکھے تو پھر سوائے اس کے کہ وہ خود اپنی زندگی کو اجیرن بنائے اور کچھ نہیں کر سکتا افسروں کو خود اپنا کام اپنے ہاتھوں سے کرنے میں کسی قسم کی شرم محسوس کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنے برتن اور کپڑے خود دھونا، اپنے جوتے صاف کرنا، اپنے آپ کو مشغول رکھنے کے لئے ضروری کام تھے۔ ان کو کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرنا دماغی RIGIDITY اور ایک غلط SENSE OF PRIDE (احساس عزت) کی وجوہ سے ہی ہو سکتی ہے۔ جہاں اکثر افسروں نے حالات کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کی وہاں بعض ایسے بھی تھے جن کو دیکھ کر مجھ کو ترس آتا کیونکہ وہ غلط احساس عزت کے حصول کی خاطر اپنی مشکلات میں غیر ضروری اضافہ کر رہے تھے، گھروں میں تو شاید ہم سب کی یہ عادت ہو گئی کہ اگر کمرے میں ذرا شور ہو یا ریڈیو بج رہا ہو تو نیند نہیں آتی لیکن وہاں گھروں کے سے حالات پیدا کرنا تو مشکل تھا بجائے اس کے پرسکون اور خاموش حالات پیدا کرنیکی کوشش کی جائے آسان یہ تھا کہ خود ایسی عادت ڈالی جائے کہ شور میں بھی نیند آئے کہ گھوڑے بیچ

کر سویا ہو۔

ایک صاحب کے ساتھ والی چارپائی والے صاحب کو رات گئے دیر تک مطالعہ کرنے کی عادت تھی۔ چنانچہ چند روز کے ضبط کرنے کے بعد وہ ان سے یوں گویا ہوئے "دن کے وقت پڑھا کریں، تمہارے اوراق اُلٹنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اُس سے میری نیند میں خلل پیدا ہوتا ہے"۔ کوئی کمرے میں روشن بجلی کی وجہ سے نہ سو سکتا، کوئی کمرے میں خراٹے لینے والے سے بیزار ہوتا۔ چند حضرات رات کو سوتے میں باتیں کرتے وہ بعض کو پسند نہ آتیں۔ اگرچہ مرتے کیا نہ کرتے رفتہ رفتہ انہیں بادل نخواستہ اپنی ان عادات کو بدلنا پڑا۔ لیکن وہ ایک لمبے عرصے تک اپنی عادت کا غلام بن کر کشمکش میں گرفتار رہے، عادت کو بدلنا انسان کے بس میں ہے اس کے لئے صرف مستحکم ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی عادت کو ماحول کے مطابق نہ بدلنے کا رجحان انسانی کمزوری ہے۔

COMMUNITY LIVING میں جہاں یہ ضروری ہے کہ ہر کوئی دوسرے کے احساسات اور عادات کا احترام کرے وہاں یہ بھی ضروری ہے ہر کوئی دوسروں کی کمزوریوں کو نظر انداز کرے اور صرف ان کے اچھے خصائل کو سراہے اور اپنے کام سے سروکار رکھے جو دوسروں کے کام سے تعلق رکھنے کے عادی تھے ذرا ان کے تفکرات ملاحظہ ہوں۔

فلاں افسر دن میں تین دفعہ کیوں نہاتا ہے۔

فلاں کو کپڑے دھونے کا مالیخولیا ہے۔

فلاں پانچ روٹیاں ہڑپ کر جاتا ہے اور فلاں معلوم نہیں ایک پر کیسے گزارہ کرتا ہے۔

ایک بات اور جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ سینئر اور جونیئر کی تفاوت قید کے اندر وہ نہیں رکھی جا سکتی جو عام حالات میں ہوتی ہے اس کو اس حد تک گھٹانا ضروری ہوتا ہے کہ بالکل معمولی فرق رہ جائے اور وہ فرق بھی نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لئے۔ امن اور عام حالات کا طرز عمل اختیار کرنے سے رنجشیں ہی پیدا ہو سکتی ہیں۔ ایک دوسرے کا احترام اگر برابری کے اصولوں پر

رکھا جائے تو بہتر ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے۔

اس نئی بارک میں لیفٹیننٹ کرنلوں کو چاروں کمروں میں بانٹ دیا گیا۔ ہم پانچ لیفٹیننٹ کرنلوں کو جو سرنگ کھود رہے تھے مختلف کمروں میں تقسیم کیا گیا۔ اسی طرح جونیئر افسر جو سرنگ کھود رہے تھے ان کو علیحدہ کمروں میں بانٹ دیا گیا، مجھے اور شریف کو ایک ہی کمرے میں رکھا گیا اس کی چارپائی میری چارپائی کے ساتھ تھی۔ میرے لئے یہ خوشی کی بات تھی کیونکہ ایک طرح کا مزاج اور اندازِ فکر رکھنے والے زیادہ آسانی سے گزارہ کر سکتے ہیں۔ بیرک کے کمروں کے درمیان کوئی دروازہ نہ تھا رات کے وقت جب سب کے سب اندر ہوتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے ریل گاڑی میں سفر کر رہے ہیں کوئی سو رہا ہوتا، کوئی تاش کھیل رہا ہوتا، کچھ پڑھنے میں مشغول ہوتے۔ چوبیس گھنٹوں میں سات مرتبہ گنتی کے لئے فال ان ہونا پڑتا، یعنی سات رول کال ہوا کرتیں، صبح پانچ بجے، پھر آٹھ بجے گیارہ بجے، پانچ بجے شام، رات کو ۱۰ بجے اور پھر آدھی رات کو کسی وقت، ظاہراً تو یہ اس لئے کیا جاتا کہ اگر کوئی فرار ہو جائے تو اس کی غیر حاضری کا دو تین گھنٹے کے اندر پتہ چل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنی کڑی سیکورٹی کی ضرورت نہیں تھی یہ اقدام یا تو ہمیں تنگ کرنے کیلئے کئے گئے تھے یا وہ ہماری ایک کوشش کے بعد اتنے خائف ہو چکے تھے کہ بالکل چانس نہیں لینا چاہتے تھے۔ ویسے اگر کوئی ایک دفعہ باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتا اور اس میں ذرا بھی عقل ہوتی تو ایسے ملک میں جہاں شکل لباس اور زبان میں کافی یگانگت ہو اس کا پکڑا جانا بالکل ناممکن بات تھی۔ خیر! سیکورٹی کے سلسلہ میں کیمپ والے یہ اقدام لینے میں حق بجانب تھے، ہمیں ویسے بھی کونسی مشغولیت تھی اس بہانے دھیان لگا رہتا۔

تازہ تازہ ناکامی کے بعد پھر فرار کی منصوبہ بندی کا خیال اس وجہ نہ آتا کہ ہمارے افسر جو ہمارے ہم خیال نہ تھے کافی چہ میگوئیاں کرنے میں مصروف تھے، کہ اچھے خاصے آرام میں رہ رہے تھے خواہ مخواہ خود بھی تکلیف اٹھائی اور باقیوں کو بھی تکلیف میں ڈالا، ایسی کسی نئی تجویز کی مخالفت زیادہ پُر احتجاج ہونے کا امکان تھا جیسا کہ آئندہ ہوا۔ پڑھائی میں دل

نہ لگتا تھا۔ موسم بھی ضرورت سے زیادہ گرم تھا۔ چنانچہ وقت گزارنے کے لئے میں نے شطرنج کھیلنے پر زور دیا۔ یہ ایسا کھیل ہے جس کو سارا دن کھیلنے سے بھی دل نہیں بھرتا۔ اس کا خبط اگر ہو جائے تو یہ کسی موذی بیماری سے کم نہیں اس کے کھیلنے سے کافی دماغی مشق ہوتی دن میں پچیس پچیس بازیاں لگائی جاتیں۔ جب شطرنج کے چند مزید سیٹ آگئے تو یہ کھیل کیمپ میں بڑا مقبول ہوا۔ سوائے دو تین افسروں کے باقی تمام نے اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی۔ جون کے آخر میں کمرہ نمبر "۱، ۲ اور ۳، ۴" کے درمیان مقابلہ کروایا گیا۔ ہفتہ بھر بیحد رونق اور جوش و خروش رہا۔ سب اس سے بڑے محفوظ ہوئے۔ شطرنج میں میرا اپنا یہ حال تھا کہ جن کو میں اپنا شاگرد بناتا وہ چند روز کی مشق کے بعد مجھے مات دینا شروع کر دیتے شاید میں خود کھیلنے میں کمزور اور استادی میں بہتر تھا۔

اس دوران تلاشیوں کا سلسلہ جاری رہا، ہر دوسرے روز چارپائیاں اور سامان باہر نکالا جاتا، فرشوں کو ٹھونک بجا کر دیکھا جاتا۔ کپڑوں کی مارکنگ چیک کرتے، ہر دفعہ میرے لئے یہ مہم ہوتی کیونکہ میں نے ایک عدد غیر نشان شدہ کپڑوں کا جوڑا اور چند نوٹ چھپانے ہوتے، اس کے علاوہ میرے چند ساتھیوں کے پاس بھی غیر نشان شدہ کپڑے تھے ان کو ادھر ادھر کرنے کے لئے صلاح مشورہ کرنا پڑتا۔ باقیوں کے لئے یہ تلاشی تو صرف زحمت تھی مگر ہم دو تین افسروں کے لئے ہر دفعہ ایک چیلنج اور زبردست SUSPENSE ہوتا ہر تفصیل کی تلاشی کے دوران نہ تو وہ ہمارے کپڑے پکڑنے میں کامیاب ہوئے اور نہ ہی وہ چند نوٹ جو چارپائی کے پائے کے اندر ٹھونس کے چھپائے ہوئے تھے، بعد میں نوٹوں کو میں نے نکال کر ٹائلٹ سوپ کے اندر سوراخ کر کے اس کے اندر چھپا دیا۔ تلاشی کے وقت وہ صابن گیلی کر کے میں صابن دانی کے اندر رکھ دیا کرتا، ان کو شک تھا کہ شاید میرے پاس کچھ رقم ہے اور وہ زور لگا رہے تھے کہ یہ پکڑی جائے تو سزا دے سکیں۔

ایک روز انہوں نے اعلان کیا کہ اب بھی اگر کسی کے پاس کسی قسم کی نقدی ہے تو

وہ بتا دے تو اسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ زیادہ تر افسروں کا بھی یہی خیال تھا کہ پکڑے جانے سے بہتر ہے کہ خود ہی اس اعلان سے فائدہ اٹھا کر بتا دینا چاہیے۔ میں اس بات کے حق میں نہ تھا کیونکہ کون کہہ سکتا تھا کہ کس وقت بھاگنے کا موقع ہاتھ آجاوے، ہم نے پھر بھاگنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

جون کے وسط کا واقعہ ہے ہمارے بلاک میں ہمارے چند فوجی جوان کام کرنے کے لئے دوسرے کیمپ سے لائے گئے۔ کیونکہ ٹٹی خانے اور پانی کے تالاب کی تعمیر ہو رہی تھی۔ ہمیں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اُن سے کوئی بات چیت نہیں کرے گا۔ ان کا یہ حکم تھا کہ وہ ہمیں سلوٹ بھی نہیں کریں گے اور ہم ان کا حال تک نہیں پوچھیں گے۔ میرے نزدیک یہ حکم نامناسب اور ناجائز تھا۔ آخر ہم ان کے افسر تھے، ان کے لیڈر تھے اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وُہ ہمارے اتنے قریب آئیں اور ہم ان کو یہ بھی کہنے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں کہ تمہارا حال کیسا ہے یا ان کی طرف دیکھنے سے بھی گبھرائیں اور اگر دیکھیں تو مجبوراً اور بے لبسانہ انداز سے، اگر ہم اتنی بے بسی کا مظاہرہ کرتے تو جوانوں کا خود اپنا ردِعمل کیا ہوتا۔ چنانچہ ہم کچھ افسروں کا خیال تھا کہ اتنی بے بسی اور مجبوری کا مظاہرہ بُری بات ہے۔ چنانچہ ہم نے چوری چھُپے ان کی خیریت دریافت کی کچھ کھانے کے لئے بھیجا۔ اس سلسلہ میں سگرٹوں کی چند ڈبیاں پانی کے گھڑے کے اندر چھپا کر ان کو بھیجیں، جب دوسری دفعہ بھیجنے لگے تو بھارتی عہدیدار نے دیکھ لیا۔ کیپٹن ویدنے آکر پوچھا یہ کس نے بھیجی تھیں اس پر لیفٹننٹ منیر احمد بٹ نے اُسے بتایا کہ وہ ڈبیاں اس نے بھیجی تھیں، یہ کوئی جرم نہیں تھا، مگر اس کے عوض لیفٹننٹ منیر کو دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر کانٹے دار باڑوں سے باہر لے جاکر کڑکتی دھوپ میں ہماری بیرک کے سامنے کھڑا کر دیا۔ افسر کو سزا دینے کا یہ طریقہ جنیوا کنونشن کی سراسر خلاف ورزی تھی اور ہمارے لئے ناقابل برداشت۔ میں اور میرے چند ساتھی بیرک سے باہر آکر باڑ کے قریب دھوپ میں کھڑے ہو گئے تاکہ ایک نوجوان افسر یہ محسوس نہ کرے کہ

اس تکلیف میں اکیلا ہے۔ دوسرے افسروں کو بھی میں نے کہلا بھیجا کہ وہ بھی باہر آ جائیں۔ چند اور افسر باہر نکل آئے۔ کرنل جعفری نے باقیوں کو شرم دلائی تو قریباً تمام کے تمام افسر باہر نکل آئے اور باہر کے تار کے قریب دھوپ میں کھڑے ہو گئے۔ میں نے نائیک مہندر سنگھ کو بلا کر کہا کہ وہ اپنے کسی افسر کو بلا کر لائے یا لیفٹننٹ منیر کو اندر بھجوائے ورنہ ہم تمام بھی یہاں کھڑے رہیں گے۔ مہندر سنگھ گیا اور چند منٹوں کے بعد لوٹ آیا۔ اس نے ہمیں بیرک میں جانے کیلئے کہا اور سخت دھونس جمائی۔ اس پر سوائے چند کے باقی تمام افسروں نے بیرک میں واپس چلے جانے میں مصلحت سمجھی۔ مجھے اور میرے چند ساتھیوں کو بھی اس نے واپس جانے کے لئے کہا۔ میں نے اُسے نفی میں جواب دیا۔ اس پر اس نے کرنل غفور سے کہا وہ ہمارے کیمپ میں سینئر تھے، انہوں نے مجھے بیرک میں چلے جانے کے لئے کہا۔ میں بادل نخواستہ چلا آیا۔ چند لمحوں بعد منیر بٹ کو اندر بھیج دیا گیا۔ کچھ حد تک ہمارا یہ پُرضبط احتجاج کامیاب ثابت ہوا۔

اگلے روز لیفٹننٹ منیر کو پانچ روز قید تنہائی کی سزا ملی۔ اسے ہتھکڑیاں لگا کر اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھگاتے ہوئے لیجایا گیا۔ وہ گرا تو اُسے گھسیٹا گیا۔ ان پانچ دنوں کے دوران اسے ہر روز ایک سوکھی روٹی کھانے کے لئے دی گئی، یہ تھی بھارتی سورماؤں کی جنیوا کنونشن جس کی تعمیل کا وہ ہر روز ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے۔

کیمپ میں نئے سرے سے ہلچل شروع ہوئی۔ پچھلے چند روز میں یہ ہلچل کچھ دھیمی پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ اس حرکت پر اتھارٹی کا ردعمل ہونا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اپنے بھی پرائے بننے لگے۔ غیر ضروری نکتہ چینی اور بحث مباحثہ ہونے لگا۔ اس روز سے رات کو بیرک کے دروازے بند کر دیئے جانے لگے۔ پہلے ہی کافی گرمی تھی، دروازے بند ہونے سے اور زیادہ گرمی ہو گئی تو ہمارے زیادہ تر ساتھی جو بادل نخواستہ باہر آئے تھے یا جو بیرک کے اندر ہی بیٹھے رہے تھے ان کو احتجاج کی یہ حرکت غیر ضروری اور احمقانہ لگنے لگی۔ کہ ایسا کرنے سے کیا حاصل ہوا تکلیف ہی اٹھانا پڑی، وہ شاید یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ جب ایک نوجوان افسر

کے ساتھ ناجائز سلوک کیا جارہا ہو تو باقیوں کا بتوں کی طرح بے حس تماشائی بنے رہنا تمام کامریڈشپ کے اصولوں کے خلاف تھا۔ ہمارے خاموش مظاہرہ سے ہماری ایک دوسرے کے لئے ہمدردی اور ہمارے اتحاد کی ترجمانی ہوئی تھی اور اس ڈر سے کہ کیمپ میں کہیں گڑبڑ نہ ہو، پھر کبھی کسی افسر کو دھوپ میں نہ کھڑا کیا گیا۔

ہماری اس بیرک کی شمال کی جانب ہمارے سپاہیوں کا کیمپ تھا۔ ہمارے عقب میں ٹین کی چادریں لگا کر ان کا کیمپ ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا گیا تھا۔ صرف ایک کونے سے وہ چلتے پھرتے دکھائی دیا کرتے تھے۔ مشرق میں ایک بیرک چھوڑ کر جس میں بھارتی سنٹرل ریزرو پولیس (C. R. P.) کے پہرہ دار رہتے تھے، تین بیرکوں میں جے سی او کا کیمپ تھا۔ جس میں اندازاً ڈیڑھ سو کے قریب جے سی او صاحبان اور پولیس کے ڈی ایس پی اور انسپکٹر رہتے تھے مغرب میں سڑک کے پار کیمپ کمانڈنٹ کا دفتر اور سی آر پی کی کوارٹر گارڈ وغیرہ تھی۔ جنوب میں جس طرف ہماری بیرک کا منہ تھا کھلا میدان تھا۔ میدان کوئی چھ سو گز چوڑا اور ہزار گز لمبا ہوگا۔ جہاں یہ میدان ختم ہوتا وہاں سڑک تھی جو گوالیار شہر کیطرف جاتی تھی۔ اس سڑک کے پار ہزار بارہ سو گز دور پہاڑی پہ پانی کا ٹینک تھا جہاں سے سارے گوالیار کو پانی ملتا تھا۔ اس سے ذرا دور ہٹ کر مغرب کی جانب ایک پہاڑی کی چوٹی پر پیلے رنگ کی دو منزلہ بلڈنگ تھی جو پیر اسنٹر تھا اس کے مشرق میں چھوٹا سا گاؤں تھا۔

سامنے سڑک پر لوگ گزرتے دکھائی دیا کرتے۔ اکا دکا کار بھی گزرا کرتی۔ ہر اتوار اور چھٹی کے روز فوجی جوان اپنی بیگموں اور بچوں کو سائیکلوں پر بٹھائے شہر کی طرف جاتے دکھائی دیا کرتے۔ شاید اس بات کا ہمیں احساس نہ ہوتا مگر یہ معمولی منظر، رنگ برنگ کپڑے پہنے لوگوں کا گزرنا، قید کی جمود کو توڑتے رہتے۔ اسی طرح باڑ کے باہر جنوب کی طرف ہر طرف گھگھریاں پہنے غریب عورتیں بمعہ اپنے مردوں اور بچوں کے ہاتھوں میں ہلکی پھلکی کلہاڑیاں لئے اور گندے کپڑوں میں دوپہر کے لئے چند سوکھی روٹیاں باندھے شہر سے مشرق کی طرف

جاتے دکھائی دیتے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ ننگے پاؤں ہوتے۔ مشرق کی طرف جسے سی او کیمپ کے پار فائرنگ رینج تھے اور اس کے پار بیابان جنگل جس میں کہیں گاؤں تھے یہ لوگ اس بیابان میں لکڑیاں اور جھاڑیاں کاٹنے جایا کرتے۔ صبح کے گئے شام کو لوٹتے، ہر ایک کے سر پر ایک من کے قریب لکڑیاں کا گٹھا ہوتا، بچوں کے سر پر بھی بھاری بوجھ ہوتے وہ شہر کی طرف پلٹ رہے ہوتے کہ انہیں بیچ کر اپنا پیٹ بھر سکیں، شہر سے جہاں تک یہ لوگ جاتے تھے کوئی آٹھ دس میل کا فاصلہ ہوگا اور پھر اتنا ہی فاصلہ اتنے بوجھ تلے طے کرنا جبکہ سارا دن وہ لکڑیاں کاٹتے رہے ہوں بے حد مشقت کا کام تھا۔

ان کو جب میں بوجھ تلے دبے واپس جاتے دیکھتا خاص کر چھوٹے بچوں کو تو بے حد دکھ ہوتا، یہ معاشرے کی بے انصافی کا شکار ہو رہے تھے۔ ان کے لئے زندگی کتنی کٹھن تھی یہ نہیں کہ ایسا حال صرف بھارت کے غریب طبقہ کا تھا، ہمارے ملک میں بھی ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہے مگر بھارت میں غُربا کی حالت پاکستان کے غُربا سے بہت زیادہ خراب ہے، بھارت میں چیزوں کی قیمتیں پاکستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں، خاص کر غلے اور دوسری بنیادی ضرورت کی چیزوں کی۔

شاید ان غریبوں کو اس بات کا احساس تک نہ تھا کہ آرام بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ گوالیار کے علاقے میں عورتیں اکثر مزدوری کرتی دکھائی دیتیں، ان میں بوڑھی جوان اور چھوٹی چھوٹی لڑکیاں شامل ہوتیں، ان مزدوروں کے چہرے اور لباس سے یہ صاف عیاں ہوتا کہ وہ غربت کے مارے ہیں وُہ بیمار دکھائی دیتے جیسے ان کو پیٹ بھر کر کھانا بھی نصیب نہ ہوتا ہو، ان کی حالت دیکھ کر بعض اوقات اپنے لئے شکر کا مقام لگتا۔ کیونکہ اپنی یہ مصیبت اور نظر بندی تو ایک عارضی بات تھی۔ ان کی طرح تو ایک لامتناعی اور مسلسل عذاب نہ تھا، البتہ اُن لوگوں کو شہر کی طرف جاتا اور یوں کھلے بندوں پھرتے دیکھ کر اپنی نظر بندی کا احساس ذرا بڑھ جاتا کہ وہ آزاد فضا میں گھوم رہے تھے۔ اور ہم تھے کہ ان باڑوں کے باہر نہ

جا سکتے تھے، باہر پھرنے والے لوگ کیا ہر طرح کی قید سے آزاد تھے؟ ہم اس لحاظ سے مقید تھے کہ ہماری نقل و حرکت بند تھی۔ وہ شاید کئی گھریلو تفکرات میں گرفتار ہوں ہر شخص اپنی ضروریات میں مقید ہوتا ہے جو غم کا سبب بنی رہتی ہیں۔ ان مزدوروں کو دیکھ کر میں سوچتا کہ یہ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ کیا یہ ہماری زندگی پر رشک کر رہے ہیں کہ دیکھو آرام سے بیٹھے ہیں، نہ کوئی کام نہ کاج، نہ محنت نہ مزدوری نہ مشقت اور اس کے برعکس ان کی اپنی زندگی۔ شام کو روٹی پکانا، گھر کا دھندا، بچوں کو کھلانا اور پھر نڈھال جسم اور دماغ لئے فرش پر گر کر غلیظ، گندے اور مچھروں والے ماحول میں مردوں کی طرح سو جانا، شاید ان کو خواب میں بھی کوئی سہانا منظر دکھائی نہ دیتا ہوگا۔ خوابوں میں بھی وہ کراہتے ہوں گے۔ سوتے میں بھی انہیں آنے والے دن کی مشقت کا خیال تنگ کرتا ہوگا۔ زندگی کے کس لمحہ میں وہ آرام سکون اور مسرت کا سانس لیتے ہوں گے۔ کیا انہیں اپنی آزاد زندگی کا کبھی بھی خیال آتا ہو گا یا شاید وہ اپنی زندگی سے ہماری زندگی کو ترجیح دینے کو تیار ہوں، جہاں وہ بندش کی گرفتاری کو قبول کر کے دن بھر کی جسم توڑ دینے والی مشقت اور پیٹ بھرنے کی فکر سے آزاد ہو جائیں۔ ملک کی آزادی صحیح معنوں میں جب ہی ہو سکتی ہے جب اس کے عوام کو بنیادی ضرورت زندگی کے غموں سے آزادی حاصل ہو۔ ورنہ وہ آزادی نہیں آزادی کا سراب ہے کہ پیاسا اس کی طرف دوڑتا ہے اور وہاں پہنچنے پر اسے پانی اور دور نظر آتا ہے اور اس کے حصول کی خاطر وہ بھاگ بھاگ کر اپنی جان کھو دیتا ہے۔

کیمپ کے اندر والی سڑک سے جب یہ مزدور گزرتے تو وہ ہماری موجودگی سے بالکل ناواقف دکھائی دیتے، یہ تو ضرور جانتے ہوں گے کہ ہم کون ہیں مگر ان کے چہروں سے کسی ایسے تاثر کی جھلک نہ ملتی کہ وہ لوگ یہ محسوس کر رہے ہوں کہ وہ اس قوم کے باشندے ہیں جنہوں نے ہمیں قید کر رکھا، شاید وہ اپنے ملک کی اس فتح سے بالکل بے نیاز تھے جیسے ان کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو یا انہوں نے یہ کامیابی حاصل ہی نہ کی ہو۔ یا وہ دل میں

کہہ رہے ہوں فتح ہوئی تو ہماری بلا کو، ہماری تو وہی بے ڈھنگی چال ہے جو پہلے تھی، اس فتح سے انہیں کیا ملا۔ شاید ان کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ قیمتیں اور بڑھ گئیں اور اب قحط پڑتا دکھائی دیتا۔ وہ اپنے ملک کی فتح سے لاتعلق دکھائی دیتے۔ یونانی فلاسفر پلیٹو ایک HARMONIOUS قوم کی تعریف یوں کرتا ہے۔

اس قوم کی ہر خوشی اور غمی ہر کامیابی اور ناکامی میں ہر کوئی یکساں جذبے کے ساتھ برابر کا شریک ہو، شکست ہو تو ایسی شکست سے مغموم ہوں۔ فتح ہو تو اس کی خوشی اُوپر سے نیچے تک کے ہر طبقہ کے لوگوں کو برابر ہو۔ بھارت کے لوگوں میں ایسی HARMONY نہ پائی جاتی تھی، اس کے برعکس میں پاکستان کے متعلق بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران اور اس کے بعد ہر چھوٹے بڑے امیر غریب، دوکاندار، بیڑی فروش مل کے مالک اور محنت کش اور سرکاری افسر تمام میں برابر کا قومی جوش و خروش پایا جاتا تھا مجھے شک نہیں کہ ۱۹۷۱ء کی شکست میں بھی خیبر سے لے کر کراچی تک اور گلگت سے لے کر چمن تک قوم کے ہر طبقہ کے لوگوں میں غم و غصہ کے جذبات پائے جاتے ہوں گے۔

بھارتی فوج کے جوانوں اور افسروں کے ساتھ واسطہ پڑنے کے بعد اپنی شکست کا افسوس مزید بڑھ گیا۔ فتح و شکست تو خدا کے ہاتھ ہوتی ہے اگر کسی ایسی قوم سے پٹتے جو اعلیٰ روایات کی حامل ہوتی تو شاید افسوس کم ہوتا۔ ہم خود اگر فتح کے مستحق نہ تھے لیکن یہ لوگ بھی اتنی بڑی کامیابی کے ہرگز حقدار نہ تھے۔ ایسی فتح تو ان لوگوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ ہماری کمزوریوں نے ان کو اس جنگ میں کامیاب بنایا ورنہ ان کی اپنی اہلیت انہیں نہ اس سہرا کی امیدوار بنا سکتی تھی اور نہ مستحق۔

لیفٹننٹ منیر کے سلسلے میں کئے گئے ہمارے احتجاج کے ردعمل میں ہماری ایک زبردست طرح کی تلاشی لی گئی۔ یوں کہیے کہ تلاشی تو ایک بہانہ تھی اصل میں ہمیں رسوا کرنے کا منصوبہ تھا۔ سب سامان کو بڑی تفصیل سے دیکھا گیا۔ ہمارے تمام کپڑے اتروا کر تلاشی

لی گئی۔ جس دن تلاشی ہوئی اس دن غضب کی گرمی تھی ہمیں قریباً سارا دن باہر صحن میں کڑکتی دھوپ تلے گزارنا پڑا کسی سے کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ ہم بمعہ اپنی چھپائی چیزوں کے بچ گئے۔

ان کے اس رویے اور حرکت سے جہاں ہم سب کو غصہ تھا وہاں ہمارے ساتھیوں میں سے کافی کو ہم پر غصہ تھا کہ خواہ مخواہ یہ احتجاج کر کے اس رسوائی کا شکار ہوئے۔ میری اپنی رائے یہ ہے کہ میں اب بھی وہی فیصلہ کروں گا جو اس وقت کیا تھا۔ اپنی احتجاجی کاروائی پر ہمیں فخر تھا کہ اپنے ساتھی کی تکلیف کو ہم نے اپنی تکلیف سمجھ کر اور نتیجہ سے بے پرواہ ہو کر مظاہرہ کیا۔ ایسے مظاہروں میں گولی بھی چل سکتی تھی۔ لیکن کیا جہاں گولی چلنے کا ڈر ہو وہاں اپنے قدم آگے بڑھانے سے گریز کرنا چاہیئے۔ اور جہاں تک اس رسوائی کا تعلق ہے اس میں ہماری رسوائی کیا تھی۔ رسوائی تو ان کی تھی جو یہ رویہ اختیار کر رہے تھے۔ اگر کوئی ایک شخص محفوظ مقام پر چڑھ کر جو اس کے حریف کی پہنچ سے باہر ہو اپنے حریف کو گندی گالیاں دے تو اس میں رسوائی حریف کی نہیں بلکہ خود گالیاں دینے والے کی ہے۔ میں تو اس سارے واقعہ کو اسی نظر سے دیکھتا ہوں۔

## ۱۵

جون کے تیسرے ہفتے میں بریگیڈیر کٹاریہ آیا۔ سب افسروں سے ملا۔ اردلیوں سے ملا پھر ہم سب کرنلوں سے خطاب کیا۔ اپنی میٹھی باتوں میں ہندو ذہنیت کا زہر گھول کر پیش کیا۔ کچھ گری ہوئی باتیں کیں۔ مثلاً یہ کہ پاکستان نے سارے اسلام کا ٹھیکہ لے رکھا ہے واہ! یہ بھی کوئی بات کرنے کی تھی۔ ہم کون سے وہاں سوداگری کے لئے آئے تھے۔ ٹھیکہ کا کیا تعلق تھا۔ آخر بنیا جو ٹھہرا بھٹو صاحب وہاں پاکستان میں آپ کی فیملیز کو رشوت کے طور پر پوری تنخواہ دے رہے ہیں۔ واہ! بھٹو، ملک، پیسے ہمارے، تنخواہ دیتے جانے سے تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے کچھ اور اپنے ملک کی بڑائی جتاتا رہا اور شیخیاں بگھارتا رہا۔

کرنل مرزا نے اپنی گھڑی کے چُرائے جانے کی شکایت کی، اس پر بریگیڈیر کٹاریہ نے ایک گھٹیا قسم کا بازاری لطیفہ سنایا۔ جو اس کے گندے ذہن کی ترجمانی کرتا تھا۔ (بریگیڈیر کٹاریہ ریٹائر ہونے کے بعد گوالیار میں مرغی انڈوں کا دھندہ کر رہے ہیں جو ان کے کردار کی قدروں کے زیادہ قریب ہے۔)

جوں جوں جون کا آخر قریب آتا جا رہا تھا اندرا بھٹو مذاکرات کے سلسلہ میں کیمپ میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر کوئی اپنا اندازہ لگانے میں مشغول تھا، ۲۸ جون سے یہ مذاکرات شروع ہونے تھے۔ ہر کوئی اپنی پیش گوئی کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں اپنی پیشین گوئی جو دیوار پر کندہ کر دی گئی تھی یہ تھی، ۔

۱۔ بھارت پاکستانی علاقے خالی کر دے گا۔

۲۔ کشمیر میں دونوں فوجیں اپنی اپنی پوزیشنوں پر قائم رہیں گی۔

۳۔ ڈپلومیٹک۔ تجارتی اور مواصلاتی رشتے استوار کئے جائیں گے۔

۴۔ جنگی قیدیوں کا مسئلہ آئندہ ملاقات میں طے کرنے کے وعدے وعید ہوں گے۔

رجائیت پسند حضرات اس ملاقات کے فوراً بعد واپسی کی توقعات لئے بیٹھے تھے کہ اب نظر بندی کے ایام بس ختم ہونے کو ہیں۔ میرا اپنا اندازہ اس سے مختلف تھا۔ مجھے مستقبل قریب میں فی الحال کوئی اُمید نظر نہ آتی تھی، گفتگو شروع ہوئی اُن دنوں ہمارے پاس ریڈیو نہیں تھا۔ لاؤڈ سپیکر پر ہمیں خبریں سنائی جاتی تھیں، یا پھر اخبار سے خبر ملتی تھی۔ ان دنوں قدرتی طور پر ہر کسی کے دل میں کچھ کچھ لگی ہوئی تھی۔ آخر یہ اہم ملاقات تھی جس پر اگر اس دفعہ نہیں تو مستقبل میں ہماری واپسی کا انحصار تھا۔ ۲۸ جون گزری پھر ۲۹ جون بھی گزر گئی، وہ دن لمبے ہو گئے تھے وقت کی رفتار ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ ۲۴ گھنٹے گزرنے کے لئے ۷۲ گھنٹوں کے برابر وقت لیتے پھر یکم جولائی آئی تو افسر کچھ مایوس مایوس نظر آنے لگے۔ خبروں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مذاکرات بالکل ناکام ہونے والے ہیں۔ اگرچہ میں اپنے ساتھیوں میں اپنی واپسی کے

متعلق ان مذاکرات کے بارے میں قنوطی تھا لیکن بالکل ناکامی کی مجھے بھی امید نہ تھی۔ ۲ جولائی کی خبروں میں مذاکرات کی قریباً قریباً ناکامی کا ذکر تھا۔ اُس رات سونے والوں کے دل کافی بوجھل تھے۔ تین جولائی کو صبح سویرے ہی کرنل آنند سنگھ آیا اور مذاکرات کی کامیابی کی خبر دی اور مبارک بھی۔

مذاکرات کی کامیابی پر ہر کوئی خوش تھا۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ عنقریب ہمارے علاقوں سے بھارتی فوجیں ہٹالی جائیں گی، بین الاقوامی معاملات میں قابض شدہ علاقوں سے دشمن کی فوج کا انخلا مشکل بھی ہوتا ہے اور وقت بھی لیتا ہے۔ اس ضمن میں شملہ معاہدہ پاکستان کے حق میں تھا۔ قیدی تو آخر واپس چلے ہی جائیں گے۔ آج نہیں تو دو سال بعد ہی سہی۔ پھر اس روز جب صدر بھٹو نے لاہور کے ہوائی اڈہ پر پہنچ کر عوام سے خطاب کیا اس تقریر سے ہم بڑے متاثر ہوئے۔ خاص کر ان کے یہ کہنے سے کہ وہ شملہ میں قیام کے دوران فرش پر سوتے رہے کیونکہ ان کو یہ خیال تھا کہ اُن کے قیدی بھی وہاں زمین پر سو رہے ہیں، قوم کے لیڈر میں اپنے لوگوں کے لئے ایسے احساس کی ایسی جھلک کا بے پایاں اثر ہوا۔ اس کے بعد بھی ہم ریڈیو پر صدر بھٹو کی تقریریں سنتے رہے۔ ان کی باتوں سے خود اعتمادی بڑھی اور جنگ کے بعد جو بے اعتمادی کے ابر چھا گئے تھے وُہ چھٹتے دکھائی دینے لگے۔ قریباً قریباً ہر قیدی کو اپنے صدر کی قیادت پر پُورا بھروسہ اور اعتماد تھا اسی لئے ہم سب کو پاکستان کا مستقبل درخشندہ و تابندہ نظر آتا۔ ہر تقریر کے چند روز بعد تک ان کے چند چست فقرات ہر ایک کی زبان سے سُننے جاتے مثلاً سردار سورن سنگھ کا دہلی میں یہ کہنے پر کہ پاکستان کو بنگلہ دیش کو ماننا دینی پڑے گی۔ صدر کا یہ جملہ "سورن سنگھ شٹ اپ" کیا آپ شٹ اپ کا مطلب سمجھتے ہیں؟ میں کہتا ہوں سورن سنگھ بکواس بند کرو، یا ہم نے بھارت کی کورٹ میں بال نہیں فٹبال پھینک دیا ہے وغیرہ وغیرہ اخبارات میں صدر بھٹو کی آمد اور شملہ میں مذاکرات کو نمایاں

طور پر شائع کیا گیا۔ صدر بھٹو کی صاحبزادی بے نظیر سے بھارت کے صحافی کافی متاثر معلوم ہوتے تھے کیونکہ اس کے متعلق کافی تعریفی مضامین اور خبریں شائع ہوئیں۔

پورے قیام کے دوران بھارتی اخبارات پڑھنے سے یہ عیاں تھا کہ یہاں کے اخبار والوں کو صدر بھٹو سے کافی چڑ ہے۔ ان کے اندازِ تحریر سے یہ معلوم ہوتا کہ وہ جہاں ہمارے صدر کی فراست اور سیاسی اہلیت کو مانتے ہیں وہاں ان کی انہی خصوصیات سے خائف بھی ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق پاکستان کو قائداعظم کے بعد پہلا سیاستدان لیڈر مِلا تھا جو بھارت کی قیادت کو پچھاڑنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

اخباروں میں دی گئی خبروں کا مفہوم ہمارے ملک کے خلاف اور بھارت کے حق میں ہوتا۔ یعنی یہ کہ بھارت کی حکومت تو ہمیشہ سے امن کی خواہاں رہی ہے اور ہر دفعہ جنگ میں پہل پاکستان کرتا رہا ہے۔ بھارتیوں اور پاکستانیوں کا تہذیب و تمدن زبان، رہن سہن سب کچھ یکساں ہے اور برصغیر کی تقسیم بے سود ہوئی۔ پاکستان کی چھوٹی موٹی گڑبڑ کو بڑھا چڑھا اور مبالغہ آمیز طور پر شائع کیا جاتا۔ جس سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی کہ پاکستان کی حالت بے حد خراب ہے۔ بھارت کے صحافی اپنے ملک کے لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

جو اخبارات ہمیں ملتے تھے ان میں دو اُردو کے اور تین انگریزی کے ہوا کرتے تھے۔ ملاپ اور پرتاپ اردو کے اخبار تھے۔ ان کا سٹینڈرڈ بے حد گرا ہوا تھا۔ پاکستان اور صدر بھٹو کے متعلق تمام خبریں اور اداریئے دشنام طرازی سے بھرے ہوتے۔ ہندوستان ٹائمز، ٹائمز آف انڈیا اور انڈین ایکسپریس انگریزی کے اخبار تھے۔ ان کو پڑھنے سے میں نے یہ محسوس کیا کہ یہاں کے اخبارات کو ہمارے ملک کے معاملات سے زیادہ سروکار ہے اور اپنے ملک کے معاملات سے کم۔ کم از کم ایک چوتھائی اخبار پاکستان کی خبروں سے بھرا ہوتا۔ ان کے اداریوں میں پاکستان کی سیاسی، معاشی، فوجی، ثقافتی کارکردگی اور

مستقبل پر تبصرہ ہوتا۔ جن دنوں آندھرا پردیش میں افراتفری کا عالم تھا تب بھی ہمارے ملک کی خبروں کی سرخیاں موٹی ہوتیں جب پاکستان کی حزبِ اختلاف کی پارٹیوں نے اسمبلی میں آئین کا بائی کاٹ کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ اخباروں کی سب سے نمایاں سرخی تھی۔ لیکن جب پاکستان کا آئین تمام پارٹیوں کی رضامندی سے پاس ہوا تو یہ خبر کہیں اندر کے صفحہ میں دو سطور میں شائع کی گئی جس سے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ پہلی خبر سے وہ کتنے خوش ہوئے اور دوسری سے جیسے ان کی ماں مرگئی ہو۔ ہمارے ملک کی مشکلات کو بڑھا چڑھا کر شائع کرنا بھارت کے صحافی اپنے لوگوں کا دل بہلانے کا سامان سمجھتے تھے اور خود اپنے ملک کی مشکلات کو پس منظر میں دھکیلنا چاہتے تھے، اس میں شک نہیں کہ بھارت میں صحافت پر اتنی پابندیاں نہیں جتنی ہمارے ملک میں ہوا کرتی تھیں خیالات کے اظہار کی وہاں زیادہ آزادی ہے مگر یہ بات بھی قابلِ فہم ہے کہ وہاں کے صحافی اپنے قومی مفادات کو خوب سمجھتے ہیں، ظاہر ہے کہ پچھلے ۲۷ برس کی جمہوریت نے ایسی سوجھ بوجھ کا جذبہ پیدا کرنے کا موقع دیا ہوگا۔ اظہارِ خیالات کا کھلا اختیار ملنے سے رفتہ رفتہ صحافت خود بخود ایسے اصولوں کی پابند ہو جاتی ہے جن سے قومی مفادات کا تحفظ بھی ہوتا رہے اور خیالات کا اظہار بھی بغیر کسی گرفت کے کیا جا سکے۔ کئی اخباروں اور میگزینوں خاص کر السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں کافی خطوط شائع ہوتے۔ جن میں جنگی قیدیوں کی مسلسل نظربندی کے خلاف احتجاج کیا ہوتا۔ یہ اگرچہ حکومتِ ہند کی پالیسی کے خلاف تھا مگر ایسے اظہارِ خیال پر ان پر کوئی پابندی یا بندش نہ تھی۔ سردار خشونت سنگھ نے جو ویکلی کے چیف ایڈیٹر ہیں پاکستان کی مشکلات کو اکثر سراہا اور جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے آواز بلند کی۔ فرینک موریس نے ایک اداریہ لکھا جس میں قیدیوں کی مسلسل نظربندی پر کڑی تنقید کی۔

مختلف اخبار پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا کہ حکومت کی اہم پالیسیوں پر خاص کر خارجہ پالیسی کے متعلق تمام اخباروں کو حکومت کی طرف سے ایک خاص طور اور انداز میں لکھنے

کی ہدایت دی جاتی اور تمام اخباروں کے ایڈیٹروں کو اکٹھا کر کے آگاہ کیا جاتا. کیونکہ اکثر دیکھنے میں یہ آیا کہ کسی خاص عنوان کے تحت تمام اخباروں کا طریقِ فکر ایک ہی طرح کا ہوتا.

جولائی کے شروع میں پھر سے فرار کے منصوبے بننے لگے. کیپٹن ندیم احسن ہاکی کا اچھا کھلاڑی تھا اور بھاگنے میں تیز. اس کا خیال تھا کہ وہ ہسپتال بیمار بن کر جائے اور وہاں سے بھاگ نکلے. یہ منصوبہ کچھ زیادہ خطرناک تھا. مگر میں اُسے منع نہ کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے اُسے بیمار بن کر ہسپتال جانے کے لئے کہا. تاکہ وہ جا کر حالات کا خود جائزہ لے سکے. وہ گیا. واپس آ کر اس کا خیال تھا کہ اگرچہ کامیابی کے چانسز کم ہیں پھر بھی کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں. دو اور افسروں کو ہسپتال بھیجا گیا تاکہ وہ اپنی رائے اس بارے میں دیں ان کا خیال تھا کہ بالکل کامیابی کی صورت کوئی نہیں. ہم ابھی انہی جائزوں میں مصروف تھے کہ آگرہ کے ہسپتال سے ایک قیدی کے بھاگ نکلنے کی خبر آئی اور اس کے ساتھ ہی یہ حکم صادر ہوا کہ تمام قیدیوں کو ہسپتال لے جاتے وقت ہتھکڑیاں لگا کر لے جایا جائے. یہ منصوبہ دھرا کا دھرا ہی رہ گیا.

انہی دنوں کافی مزدور ہمارے کیمپ میں کام کرنے کے لئے آتے کیونکہ پانی کے تالاب اور نئی ٹٹیوں کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا. مزدوروں جیسے کپڑے پہن کر ان کے ساتھ ہی سر پر مٹی کی بوری رکھ کر باہر نکلنے کی کوشش کی جا سکتی تھی. میں نے اور ندیم نے میلے کپڑے نکال کر ٹٹی کے اندر زمین میں چھپائے اور تین دن مزدوروں کی نقل و حرکت کا جائزہ لیا. آئندہ پیر کے دن ارادہ تھا کہ چل نکلیں مگر اس پیر سے مزدوروں کی جگہ اپنے فوجی جوانوں کو دوسرے کیمپ سے لا کر کام پر لگا دیا. یوں بھی کام نہ بن پایا.

جولائی کے تیسرے ہفتے میں مسٹر یونس خان ہمارے کیمپ میں آئے. یہ صاحب حکومت ہند کے سیکرٹری محکمہ تجارت تھے. اس سے پہلے وہ عبدالغفار خاں کے پرائیویٹ سیکرٹری بھی رہ چکے تھے، صوبہ سرحد میں وہ چچا یونس کے نام سے مشہور تھے. پاکستان

بننے کے بعد وہ دلی آ گئے کیونکہ وہ کانگرسی تھے اور قیام پاکستان کی مخالفت کرتے رہے تھے، انہوں نے ہم تمام افسروں کو اکٹھا کر کے یوں خطاب کیا۔

بھارت پاکستان کی آپس کی دشمنی سے صرف بڑی طاقتیں فائدہ اٹھا رہی اس دشمنی کی ذمہ داری پاکستان پر عائد ہوتی ہے ورنہ ہندوستان تو ہمیشہ امن اور دوستی کا خواہاں رہا ہے۔ اگر بھارت اور پاکستان آپس کے اختلافات طے کر لیں تو دونوں ممالک کو بیحد فائدہ پہنچے گا جو بیش بہا خرچ فوجیں رکھنے پر کیا جا رہا ہے وہ عوام کی بہبود پر خرچ کیا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ دونوں ممالک مل کر ایشیا اور افریقہ میں پیدا شدہ مسائل کا حل ڈھونڈنے میں مددگار ثابت ہو سکیں گے۔ فلسطین کا مسئلہ کب کا طے ہو گیا ہوتا اگر بھارت اور پاکستان میں دشمنی نہ ہوتی۔ افریقہ میں نو آبادت ختم ہو گئی ہوتیں۔ اُسے برصغیر کی تقسیم کی دانشمندی پر شک تھا وہ اس بات کے قائل تھے کہ مذہب کے اختلاف کے باوجود پورے برصغیر کے لوگوں کا تمدن اور تہذیب ایک ہونے کی وجہ سے آپس میں بڑی یگانگت تھی، انہیں اس بات کا بھی درد تھا کہ انہیں صوبہ سرحد کو خیر باد کہنا پڑا۔ اور پھر وہ کبھی واپس نہ جا سکے، ان کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ نہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کیسا تھ بھارت میں زیادتی کی جا رہی ہے جس کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ وہ مصر میں سفیر تھے تو اُن کی سالانہ رپورٹ میں ہند کے وزیر خارجہ نے لکھ دیا کہ انکی وفاداری کو شک کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس پر انہوں نے ایک زبردست احتجاجی چٹھی وزیر خارجہ اور وزیر اعظم کو لکھی۔ وزیر خارجہ کے دماغ میں ان کی وفاداری پر شُبہ کا خیال تک کیوں آیا۔ چنانچہ وزیر اعظم نے وزیر خارجہ کو ایسا کرنے پر تنبیہ کی،، انہوں یہ بھی کہا کہ بھارت کے لوگوں کو پاکستانیوں سے کوئی دشمنی نہیں، اس کے برعکس پاکستان کی حکومتیں پاکستانیوں کو بھارت کے خلاف اکساتی رہی ہیں۔ یونس صاحب شملہ کانفرنس کے وقت شملہ میں موجود تھے چنانچہ وہاں کے مذاکرات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ مسز اندرا گاندھی رات

گئے تک خود اپنے مہمانوں اور خاص طور پر صدر بھٹو کی رہائش کے انتظامات کا معائنہ کرتی رہی تھیں اور یہ بھارت کی قیادت کی پاکستان دوستی کی زندہ دلیل تھی کہ وہ پاکستان کے لوگوں کے لئے اچھے جذبات رکھتی تھیں" جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکے تو میں نے مختصر الفاظ میں ان کو کچھ اس طرح کا جواب دیا۔ جہاں تک بھارت کے لوگوں کے ساتھ رویّے کا تعلق ہے اس کی جھلک ہم نے پچھلے چند ماہ کی نظر بندی کے دوران ایسی دیکھی ہے کہ اب شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے وُہ گرا ہوا ہے۔ فوج کے سنیئر افسر نے یہاں آن کر ہمیں گندی گالیاں دیں۔ ایک افسر کو مارا اور پیٹا گیا ہمیں بھوکا رکھا گیا، ایک بریگیڈیر صاحب آتے اور ہمارے ملک اور ہمارے لیڈروں کے خلاف زہر اُگل کر چلتے بنے۔ ہم افسروں کے ساتھ کئے گئے سلوک کے بعد آپ کے عوام کے روّیے کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، آپ لوگوں کے کہنے اور کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کہنے کو تو یہاں جنیوا کنونشن کے مطابق ہمارے ساتھ سلوک کیا جا رہا ہے مگر حقیقت میں جنیوا کنونشن کی اتنی خلاف ورزیاں کی گئی ہیں کہ جنیوا کنونشن پارہ پارہ بکھری پڑی ہے۔

جہاں تک بھارت پاک دشمنی کا تعلق ہے اس کے متعلق تو کوئی پاگل ہی کہے گا کہ ایسی دشمنی سے کسی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اس دشمنی کا ذمہ دار بھارت ہے نہ کہ پاکستان۔ پاکستان کے ساتھ بھارت نے کشمیر کے سلسلہ میں ناانصافی کی ہے وہ اپنے بین الاقوامی وعدوں کو پورا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ ہمسائے کا حق مارنے کے بعد اور اس کے ساتھ ناانصافی کر کے یہ امید رکھنا کہ وہ دوستی کا خواہشمند ہو گا زیادتی ہے بھارت کی دوستی کا مزید ثبوت اس کے مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے پاکستان کے ٹکڑے کرنے میں ملتا ہے اگر اس کو آپ دوستی کہتے ہیں تو پھر دشمنوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

یونس خان کے ساتھ آرمی ہیڈ کوارٹرز دہلی سے بریگیڈیر لمزارس آئے تھے جو

جنگی قیدیوں کے ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہمیں کس نے گالیاں دی تھیں اور کس نے کس افسر کو پیٹا تھا اور کس نے ہمارے ملک اور لیڈروں کو برا بھلا کہا تھا۔ میں نے ان کو تفصیلات بتائیں اور بریگیڈیر گھوش اور بریگیڈیر کٹاریہ کے رویہ اور کردار کی کہانی سنائی۔ اس پر انہوں نے افسوس کا اظہار کیا۔ شاید ہماری شکایت ان دونوں حضرات کے ذریعہ اوپر تک پہنچی کیونکہ اس کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ کیمپ اتھارٹی کے رویہ میں کچھ حد تک تبدیلی واقعہ ہوئی۔ اس شکایت کے بعد بریگیڈیر کٹاریہ ہمارے کیمپ میں سوا سال تک نہ آیا حالانکہ وہ سٹیشن میں ہر ماہ دورہ پر آیا کرتا تھا۔

میری رائے یہ ہے کہ جہاں تک اعلیٰ سطح پر حکومت ہند یا آرمی ہیڈکوارٹرز کا تعلق تھا ان کی پالیسی ہمارے ساتھ جنیوا کنونشن کے مطابق سلوک روا رکھنے کی تھی مگر اسے تنگ نظری کہہ لیجئے یا بدطینتی کہ کیمپ سٹاف کا رویہ اور سلوک اس پالیسی کی مطابقت میں نہ تھا۔ اگرچہ چھوٹے پیمانے پر بے شمار خلاف ورزیاں کی گئیں۔ عام طور پر رہنے سہنے کا تسلی بخش بندوبست تھا۔ یہ لوگ اگر سوجھ بوجھ رکھتے تو ان کو جاننا چاہیئے تھا کہ ایک سپاہی کو اپنی جسمانی ضروریات سے زیادہ اپنے وطن کے نام سے اپنے ملک کی قیادت اور وہاں کے لیڈروں سے اپنے ملک کے نظریہ اور نظریۂ حیات سے اپنے مذہب اور اپنی عزت سے محبت ہوتی ہے جو جو خلاف ورزیاں کی گئیں وہ کچھ اتنی گھٹیا درجے کی تھیں اور بالکل لاحاصل کہ میں ایسی خلاف ورزیوں کی ضرورت کو سمجھنے سے قاصر ہوں ان کیمپ کے عہدیداروں نے اپنے اچھے کئے پر پانی پھیر دیا۔ اور اپنے لئے بُرا نام پیدا کیا ورنہ ان کے لئے یہ ایک نادر موقع تھا کہ پاکستانیوں کی اتنی بڑی تعداد کے دلوں کو موہ لیں۔ شرافت سے کی گئی بات سے انسان زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ کھانے پینے اور آسائش کے سامان سے کم۔

جب شروع شروع میں پیرا سنٹر والوں سے ہمارا واسطہ پڑا اور انہوں نے

اچھے رویّے کا مظاہرہ کیا تو مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے نوجوان افسر اور سپاہی دشمن کی شرافت سے اس قدر متاثر ہوں کہ وہ اپنے ملک کے نظریہ اور ان لوگوں سے علیحدگی کی دانشمندی کو شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ یہ نوجوان تو قیامِ پاکستان سے بعد کی پیدائش تھے اور کئی پاکستان کے پہلے کے واقعات، حالات اور ماحول سے اچھی طرح واقف نہ تھے، وہ ہندوؤں کی اصلی ذہنیت کو نہ جانتے تھے اس لئے ان کا یوں متاثر ہونا حقیقت شناسی نہ ہوتی۔ اس لحاظ سے ہمارے ساتھ کی گئی بدسلوکیوں کو میں نے اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی چھپی نعمت گردانا اور یہ لوگ اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوئے۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو ایسے موقع سے قومی مفاد کی خاطر فراخدلی کا ثبوت دے کر قیدیوں کی بڑی تعداد کو اپنی قوم کی اعلیٰ روایات کا قائل بنا دیتا۔

اپریل کے مہینے میں رام گڑھ کے کیمپ میں جولائی کے ماہ میں الہ آباد کے کیمپ میں اور اسی طرح چھ سات اور کیمپوں میں ایسی وارداتیں ہوئیں جن جنگی قیدیوں کو فرار کی کوشش کرتے وقت بغیر تنبیہہ کئے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ ایک ایسے ہی حادثے کے بارے میں انٹرنیشنل ریڈ کراس کے نمائندوں کی رپورٹ کے مطابق تین قیدیوں کو بلاوجہ جان بوجھ کر قتل کیا گیا۔ اول تو حفاظتی تدابیر اتنی کڑی تھیں کہ ان کے باوجود فرار ہونا آسان نہ تھا۔ ان حفاظتی تدابیر کو مزید کڑا کیا جا سکتا تھا تاکہ فرار کی کوشش زیادہ مشکل ہو جائے۔ اور کسی کو بلا ضرورت گولی مارنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اس کے علاوہ اگر ۹۳ ہزار قیدیوں کی اتنی بڑی تعداد میں سے چند درجن فرار ہونے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو کونسی آفت آجاتی۔ فرار ہونے والوں کو گولی کا نشانہ نہ بنا کر بھارت اپنی فراخدلی اور بہتر نام کی دلیل پیش کر سکتا تھا لیکن ایسا اندازِ فکر رکھنے کے لئے فراخدلی کا ہونا ضروری ہے اور میں تو یہ کہوں گا کہ یہ سارے بھارت کے عوام کی بدقسمتی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ دوسروں کے ساتھ برتاؤ اور لین دین میں تنگ نظری کا ثبوت دیا۔ بین الاقوامی

سطح پر اور دوسری قوموں کے ساتھ مراسم استوار کرنا اور لین دین میں عارضی مفاد کو مدنظر رکھ کر سودے بازی سے کام لینا دانش مندی نہیں۔ اگر کشمیر کے بارے میں بھارت کی قیادت تنگ نظری اور ہوس سے کام نہ لیتی اور انصاف کے تقاضوں کا پاس رکھتے ہوئے وہاں کے لوگوں کو منصفانہ طور پر حق خود ارادیت بہم پہنچا کر اپنی قسمت کا آپ فیصلہ کرنے کا موقع دیتی جس کا کہ وہ خود وعدہ کر چکی تھی تو اس برصغیر میں نہ صرف امن و امان رہتا بلکہ بھارت ایشیا میں ایک معتبر ملک کی حیثیت اختیار کر سکتا تھا۔ بھارت کے لیڈروں کی ایسی تنگ نظرانہ روش کی وجہ سے بھارت اور چین کے تعلقات اتنے بگڑے کہ آخر انہیں چین کے ہاتھوں شرمناک شکست کھانی پڑی، مشرقی پاکستان کے اندرونی حالات سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کے بزور طاقت ٹکڑے ٹکڑے کرنیکا منصوبہ بھی میری رائے میں بھارت کے لئے دُور اندیشانہ قدم ثابت نہیں ہوگا۔ یہ تو مستقبل کی تاریخ بتا سکے گی کہ ہند نے بین الاقوامی اصولوں کو پامال کر کے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ عین ممکن ہے کہ بھارت کے اندر بھی ویسی ہی صورت حال پیدا ہو جائے جیسا کہ مشرقی پاکستان میں ہوئی تھی پھر انہی کے بنائے گئے غلط اصولوں کا ہند کے خلاف استعمال کرنے میں کوئی بیرونی طاقت حق بجانب ہوگی۔ یہ پُورے برصغیر کے عوام کی بدقسمتی ہے اور اس میں ہم بھی شامل ہیں کہ پاکستان کو ایک تنگ نظر قوم کے لیڈروں سے واسطہ پڑ گیا ہے۔

بھارت اور پاکستان کی افواج اور لوگوں کے درمیان ایسی صحت مندانہ روایات کا قائم کرنا جو انسانی اصولوں، جنیوا کنونشن کی دفعات فراخدلی اور بہادری پر مبنی ہوں نہایت ضروری ہے قوموں کے درمیان جنگیں تو انسانی تاریخ کے آغاز سے ہونی شروع ہوئیں اور انجام تک چلتی رہیں گی۔ پاک ہند کی دشمنی بھی صدیوں پرانی ہے۔ یہ کوئی ۱۹۴۷ء کی بات نہیں بلکہ اس وقت سے یہ دشمنی چلی آ رہی ہے جب محمد بن قاسم نے پہلی دفعہ سندھ

کی سرزمین پر قدم رکھا اور اس برصغیر میں دو قومیں معرض وجود میں آئیں۔ کبھی یہ دشمنی کم ہوگئی اور کبھی بڑھ گئی مگر بالکل ناپید کبھی نہ ہوئی۔ اس وقت سے ہندو مسلم اختلافات رہے اور دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر شمال مشرق کی طرف سے آنے والے مسلمانوں نے سات آٹھ سو برس تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اس دور میں ہندو مغلوب رہے لیکن انہوں نے اپنی قومیت کو خیرباد نہ کہا اور وہ مسلمانوں کے زیر سایہ پنپتے رہے۔ یہ ہزار ہا سالوں کی رنجشیں چند مہینوں میں تو ختم نہیں ہو سکتیں۔ اس دشمنی کی تہہ میں ایک دوسرے کے متعلق شکوک و شبہات میں جن کو مٹانے کے لئے دونوں ملکوں کو فراخدلی، رواداری اور منصفانہ اصولوں کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ لیکن قومیں اپنی ذہنیتیں آسانی سے نہیں بدلا کرتیں اس لئے بھارت کی دشمنی کو دوستی میں بدلنے کے لئے کافی وقت لگنے کا احتمال ہے، تب تک پاک و ہند کی آپس میں کئی جنگیں ہوں گی۔ از خود جنگ اتنی بری بات نہیں۔ اگر اس میں بھی شجاعت کے اصولوں کا پاس رکھا جائے ۱۹۴۷ء کے ہندو مسلم فسادات میں جو کچھ ہوا وہ شجاعت بہادری و جوانمردی نہ تھی بلکہ بزدلی تھی۔ دیوانگی تھی، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں کو ایسی بے رحمی سے مارا گیا کہ خود انسانیت شرم کے مارے ڈوب مری۔ یہ پاگل پن تھا۔ میدانِ جنگ میں مسلح دشمن کو مارنے اور اپنے جوہر دکھانے میں تو جوانمردی ہے مگر غیر مسلح قابو آئے ہوئے قیدی کو مار پیٹ کر دشمن کے متعلق معلومات حاصل کرنا جنگی قیدی سے برا سلوک کرنا۔ سویلین آبادی کے ساتھ زیادتی کرنا۔ جیتے ہوئے علاقہ میں لوٹ مار کا بازار گرم کرنا یا وہاں کے لوگوں کا قتل عام کرنا بہادری نہیں بزدلی ہے ہار اور جیت دونوں میں ہم فراخدلی کا ثبوت دیں۔ جنگ سے پہلے اس کے دوران اور اس کے بعد ایسی روایات قائم کریں کہ جن پر نہ صرف ہم خود فخر کر سکیں۔ بلکہ دوسری قومیں بھی ان پر نازاں ہوں اور ان سے سبق حاصل کریں۔ ایسی روایات کے قائم کرنے

کے لئے نہ صرف دونوں اطراف کی افواج کے اعلیٰ افسروں کی کوشش ضروری ہے بلکہ دونوں ممالک کی حکومتوں۔ ادیبوں، شعرا اور صحافیوں کو امن اور جنگ کے وقت ایسی روایات کی اہمیت کو اجاگر کر کے اپنے عوام اور افواج کو پابند بنانے کی ضرورت ہیں۔ اس سلسلے میں فیلڈ مارشل آکن لیک کے الفاظ جو انہوں نے مسٹر بیون کے نام نہاد ٹریڈ یونین آف جنرلز کے الزام کے بارے میں کہے۔ برمحل ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

" جہاں تک میں جانتا ہوں کہ اگر کوئی ایسی فیلو شپ ہے تو اس کی ممبر شپ کا اس سے زیادہ مطلب نہیں کہ میدان جنگ میں ایک فوجی اپنے حریف کی ان خصوصیات کو سراہے جن کے حصول کا وہ خود خواہشمند ہو۔ یعنی بہادر، قابل اور غیر زیادتی پسند حریف کی عزت اور اس بات کی خواہش کہ اس کے حریف کے ساتھ اس کی شکست کی صورت میں ایسا برتاؤ اور سلوک کیا جائے جیسا کہ اپنی شکست کی صورت میں وہ اپنے ساتھ کیا جانا پسند کرے گا اسے شجاعت کہا جایا کرتا تھا۔ بہت سے لوگ اسے احمقانہ قرار دیں گے اور کہیں گے کہ وہ دن جبکہ جنگ میں ایسے جذبات زندہ رکھے جا سکتے تھے گزر چکے ہیں اگر ایسا ہے تو مجھے اس کا بے حد افسوس ہے"

## ۱۶

جولائی کے آخر میں کرنل آنند سنگھ آیا۔ اس دن اس کا رویہ کچھ بدلا بدلا تھا۔ معلوم نہیں یہ ہماری شکایت کا اثر تھا یا شملہ معاہدہ کا۔ بہرصورت رویہ مصالحانہ معلوم ہوتا تھا۔ کرنل آنند سنگھ بذات خود زیادہ برا آدمی نہ تھا لیکن ہم سب یہ محسوس کرتے کہ اس کے ماتحتوں نے اسے قابو میں کر رکھا ہے کیونکہ کئی مرتبہ یوں ہوا کہ وہ ہماری مشکلات کے پیش نظر کچھ فیصلہ دے کر گیا ہو اس کے ماتحتوں نے بعد میں منسوخ کر دیا اس دن اس کی تمہید سے ہی یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید اوپر سے کوئی جھاڑ رسید ہو چکی ہے اس

نے کہا کہ " آپ لوگوں نے پچھلے چند ماہ میں دیکھ لیا ہو گا کہ باوجود ریڈ کراس اور سینئر افسروں کو شکایت کرنے کے آپ کی بالکل دال نہیں گلی۔ اگر کوئی آپ کی مدد کر سکتا ہے تو وہ یہاں کیمپ کے افسر ہیں، آج میں نئے باب کا آغاز کرنے آیا ہوں۔ ہم نے جو مراعات پہلے دے رکھی تھیں وہ آپ لوگوں میں سے کچھ نے سرنگ کھود کر فرار ہونے کی کوشش کر کے خود انہیں سلب کروایا۔ آج میں یہاں پرانی باتوں کو معاف کرنے کی غرض سے آیا ہوں۔ آج سے آپ کو ایک ٹرانسسٹر رکھنے کی اجازت ہو گی تاکہ آپ خبریں سن سکیں اس کے علاوہ کینٹن کا سامان جو پچھلے تین ماہ سے قریباً قریباً بند کر دیا گیا تھا چند بندشوں کے ساتھ آپ کو خریدنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ رات کو بارک کے اندر چلے جانے کا وقت ساتھ بجے سے بڑھا کر نو بجے کر دیا جائے گا۔ چند اور ضروری کپڑے آپ لوگوں کو رکھنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر آپ کی کوئی فرمائش ہو تو مجھے بتائیں میں اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس نئے باب کے شروع ہونے کا سن کر اکثر ساتھی کافی خوش نظر آنے لگے مجھے کرنل آنند سنگھ کی باتوں پر سخت غصہ آرہا تھا۔ حقیقت میں سوائے ٹرانسسٹر کے یہ کوئی رعائت نہ تھی بلکہ ان تمام باتوں کا جنیوا کنوینشن کے تحت ہمیں حق پہنچتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا

"کرنل آنند! یہ تمہاری خام خیالی ہو گی اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم ایسی مراعات کی پیش کش کر کے ہماری قومی وفاداری اور فرض شناسی کا سودا کرنے میں کامیاب ہو سکو گے۔ ہمیں یہاں تمہاری مراعات کی ضرورت نہیں اگر تم چاہو تو جو مراعات تم نے پہلے بھی دے رکھی ہیں وہ بھی چھین لو ان تمام مراعات سے ہمیں اپنی عزت پیاری ہے جس کا یہاں پاس نہیں رکھا جاتا۔ اگر ہمارے قیام کے دوران ہمارے ساتھ صرف سپاہیانہ سلوک کی ضمانت دے سکو تو یہ ہمارے لئے کافی ہو گا ہم تمہاری ایسی ضمانت کو تمام مراعات پر ترجیح دیں گے"۔ ہمارے کچھ ساتھیوں نے میرے

یوں کہنے کو ناگوار اور غیر ضروری گردانا۔ کرنل آنند سنگھ نے جواب میں کہا کہ اسکا ہماری وفاداری کا سودا کرنے کا ہرگز ارادہ نہیں وغیرہ وغیرہ پھر اس نے پوچھا کہ ہم اور کس کس چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟ لمحہ بھر کے لئے ہر طرف خاموشی چھا گئی اور پھر ہمارے ایک ساتھی نے اٹھ کر کہا "کیا ہمیں حلوے کے لئے سوجی مہیا کی جا سکتی ہے"؟ اسے اس وقت سوجی کے حلوے کا کیونکر خیال آیا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ غالباً غیر ارادی طور پر اور محض کچھ کہنے کی غرض سے یہ اس کے منہ سے نکل گیا ہو لیکن اس کے اس معمولی سے جملے نے میری تمام حسرتوں کا خون کر دیا۔ یہ میرے نقطۂ نظر کے بالکل الٹ تھا جس کی میں آنند سنگھ کو تلقین کر رہا تھا۔ اس کے بعد دیگرے فرمائشوں کا تانتا بندھ گیا۔ پاجامہ کرتا۔ دھوتی۔ چادر۔ تولیہ۔ مجھے اس سے بڑی کوفت ہوئی میں نے تو اپنی عزت کی اہمیت جتانے کی کوشش کی تھی اور ان فرمائشوں سے ہماری جسمانی ضروریات کا ترجیحی پن ظاہر ہوتا تھا شاید یہ نظر بندی میں چند ماہ کی سختیوں کا اثر تھا جن کا بوجھ اٹھانے سے ہمارے چند ساتھی قاصر تھے یا ہو سکتا ہے کہ ان کا نقطۂ نظر اور انداز فکر مجھ سے مختلف ہو۔ قصہ مختصر وہ کچھ وعدہ وعید کر کے چلا گیا مگر اس کے چند ہفتے بعد تک سوائے اس کی ایک آدھ بات کے دوسروں پر کوئی عمل درآمد نہ ہوا ان چند ساتھیوں کا خیال تھا کہ یہ مراعات میں تاخیر میری گستاخ کلامی کی وجہ سے ہو رہی ہے اس بات کا ان کو کافی دیر تک بے حد غصہ رہا۔ اگست کے شروع کا واقعہ ہے کہ ایک روز ہمیں اخبار ملا تو اس میں سے چند خبروں کا حصہ کاٹا ہوا تھا۔ اخبار سنسر کرنے کے بعد ہمیں دیا جاتا تھا۔ اس سے پہلے بھی اپریل کے مہینے میں اخبار ہمیں کاٹی ہوئی خبروں کے ساتھ ملا تھا۔ جس کے چند روز بعد ہمیں معلوم ہوا کہ کسی کیمپ میں چند قیدیوں کو شہید کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ہم سب کا خیال تھا کہ پھر کہیں ایسا ہی واقعہ رونما ہوا ہے اس کے دو چار روز بعد ہی ہماری کھڑکیوں پر سلاخیں نصب کی جانے لگیں۔ پھر ریڈیو پاکستان کی خبروں سے ہمیں پتہ چلا کہ الہ آباد کے ایک کیمپ میں سات جنگی قیدیوں کو شہید اور ۳۶ کو زخمی کر دیا گیا تھا۔ اس ماحول

میں سوائے غم وغصہ کے اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا ہم سب نے مل کر ختم قرآن کیا اور شہدا کے لئے دعائے مغفرت کی۔ سلاخیں لگ گئیں آخر والے چھوٹے کمرے کیساتھ باہر برآمدے میں ایک چھوٹا کمرہ بنا دیا گیا جہاں دو عدد کموڈ رکھ دیئے گئے تاکہ رات کے وقت پیشاب اور پاخانہ کے لئے باہر نہ جانا پڑے اس کمرے کے بننے سے پہلے شام کو سات بجے کے بعد صرف ایک آدمی ایک وقت میں سنتری سے پوچھ کر باہر ٹٹی خانے کو جا سکتا تھا۔ اب رات کو ہمیں بند کر دیا جاتا اور صبح کے وقت نکالا جاتا۔ سلاخوں کی وجہ سے بیرک جیل خانہ دکھائی دینے لگی اور اس کے ساتھ قید کا احساس زیادہ ہونے لگا لیکن اضافہ عارضی تھا چند روز کے بعد طبیعت ان سلاخوں سے بھی مانوس ہو گئی۔ ساری نظر بندی کے دوران ہمیں عبادت کی پوری آزادی تھی نہ صرف یہ بلکہ مذہبی جذبات کا پورا خیال رکھا جاتا۔ نماز باجماعت پڑھنے یا قرآن خوانی یا اذان دینے میں کسی قسم کی بندش نہ تھی یہ رویہ قابل تعریف تھا۔ قرآن مجید اور دیگر مذہبی کتابیں خریدنے کی سہولت بہم پہنچائی جاتی۔ جب ہم پہنچے تو صرف تین چار قرآن مجید کی جلدیں کیمپ میں تھیں۔ جو چند افراد اپنے ساتھ لائے تھے یہاں آن کر قریباً ہر ایک افسر نے قرآن مجید خرید لیا اس کے علاوہ تفہیم القران اور تفسیر ابن کثیر کی جلدوں کی کاپیاں خرید لی گئیں، میں نے یہ سختی سے محسوس کیا کہ ہم میں مذہب کے بارے میں گفتار کا زیادہ تعلق ہے، اور عمل کا کم۔ ہم کل ۱۶۳ افسر تھے اندازاً پچاس فیصد ایسے تھے جنہوں نے پورا قرآن نہیں پڑھا تھا۔ جنہوں نے پورا پڑھا بھی تھا وہ بھی صرف عربی میں مشکل سے صرف سات افسر ایسے تھے جنہوں نے قرآن پاک کا مطالعہ با معنی کیا ہو۔ یعنی یہی تھے جو جانتے تھے کہ قرآن میں لکھا کیا ہے اسی طرح صرف چار پانچ افسر تھے جو باقاعدہ نماز کے پابند تھے اگر ہماری قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ کا یہ حال ہے تو پھر عوام الناس کس حال میں ہوں گے اس کا اندازہ لگانے میں زیادہ دقت محسوس نہیں ہونی چاہیے قرآن شریف کی آیات منتر نہیں کہ ان کو بے سمجھے بوجھے پڑھ کر پھونک مارنے

سے عبادت کا حق پورا ہو جاتا ہے قرآن کی آیات دانشمندی اور اعلیٰ اصولوں کی زندگی بسر کرنے کا راستہ دکھاتی ہیں ظاہر ہے کہ ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے ان کا مطلب سمجھنا ضروری ہے اس لئے قرآن کو معنوں کے ساتھ پڑھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ صحیح معنوں میں اسلام کی روح کو پا سکے یہ جائزہ کسی طرح محض فوج کی عکاسی نہیں کرتا اور نہ ہی اس میں فوج کا کچھ دوش ہے بلکہ یہ شاید پوری قوم کا آئینہ دار ہے۔ مذہبی تعلیم کی ذمہ داری اولاً والدین اور پھر ہمارے تعلیمی اداروں پر عائد ہوتی ہے دینیات کی تعلیم کو ہمارے سکولوں اور کالجوں میں جس انداز سے لیا جاتا ہے وہ کسی سے چھپی بات نہیں اور یہ ہماری کمزوریوں میں سب سے بڑی کمزوری ہے۔

انسان جب تکلیف سے گھبراتا ہے تو خدا کو یاد کرتا ہے اس لحاظ سے نظر بندی کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ماسوائے چار پانچ کے باقی تمام افسروں نے خدا کی طرف رجوع کیا۔ قرآن مجید با ترجمہ پڑھا۔ جنہوں نے پہلے کبھی نہ پڑھا تھا انہوں نے شروع سے شروع کیا۔ کافی افسروں نے تفسیر بھی پڑھی۔ اسی طرح نماز بھی کافی باقاعدگی سے پڑھی جانے لگی۔ قیدیوں نے کافی ثواب کمایا اور اپنے ماضی کے گناہوں کی معافی مانگی اسی طرح سوائے چار پانچ افسروں کے باقی تمام نے پورے روزے رکھے کہا نہیں جا سکتا کہ نماز روزہ اور قرآن خوانی کی یہ عادت سب وطن واپس جانے کے بعد بھی برقرار رکھ سکیں گے یا نہیں یا جیسے اللہ میاں نے کہا ہے کہ جب لوگ مشکل میں گھر جاتے ہیں تو مجھے یاد کرنے لگتے ہیں اور جب میں ان کو مشکل سے نجات دیتا ہوں تو اس نجات کو اپنا حق سمجھ کر مجھ سے منہ پھیر لیتے ہیں بہر صورت یہاں کی گئی عبادت سے ہم سب کے اعمال اور اندازِ فکر کو نیک راہوں پر گامزن ہونے میں تقویت ملتی رہا کرے گی۔

کیمپ میں پانچوں وقت کی نماز باجماعت ہوتی۔ کھجور کی بنی ہوئی چٹائیاں ہم نے خریدیں برآمدے یا باہر صحن میں نماز ہوا کرتی۔ ماہ رمضان میں تراویح پڑھنے کا بندوبست کیا گیا کیپٹن صدیقی جو حافظ قرآن تھے وہ امامت کرتے انہوں نے پہلے دس سیپارے تراویحوں کے دوران پڑھ کر سنائے۔ ہمارے اپنے چھ ڈاکٹر اور ایک دندان ساز ہمارے ساتھ کیمپ میں تھے تین مئی سے پہلے تو وہ ہمارے جوانوں کے کیمپوں میں لے جائے جاتے اور ان کی طبی لحاظ سے دیکھ بھال کرتے مگر ۲۸ مئی کو ان سب کو بھی ہمارے ساتھ رکھ دیا گیا اور ان سے بالکل کوئی کام نہ لیا جاتا ظاہر تھا کہ ایک ڈاکٹر اتنی بڑی تعداد کی دیکھ بھال نہ کر سکتا تھا جب افسروں کو طبی لحاظ سے تکلیف تھی تو جوانوں کی تکلیف کا اندازہ لگانا آسان ہونا چاہیئے دوائیوں کی بے حد کمی تھی اکثر ان کے بغیر ہی گزارہ کرنا پڑتا۔ جوانوں کے کیمپوں میں بڑی تعداد کو خارش کی بیماری لگی ہوئی تھی ان سے گندی نالیوں سے پانی نکلوا کر زمین پر لیپ کروایا جاتا جس سے ان کو خارش ہو گئی پھر علاج اور دوائیوں کا خاطر خواہ بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے انہیں بیحد تکلیف اٹھانا پڑی۔ اگست کے وسط میں میڈیکل کور کے ایک میجر جنرل آئے تو ان کی ہدایت پر سکن سپشیلسٹ بھیجا گیا۔ سننے میں آیا کہ جوانوں کی قلیل تنخواہ سے کٹوتی کر کے انہیں دوائی بہم پہنچائی گئی پورے قیام کے دوران ہمارے ڈاکٹر کو کام کرنے کی اجازت نہ دی گئی اور ان کو بالکل جنگی قیدیوں کی طرح رکھا گیا۔ حالانکہ ان کو حفاظتی عملہ (PROTECTED PESONNEL) کے طور پر رکھا جانا چاہیئے تھا۔

جون کے ماہ میں ہمارے دو جوان ہیٹ سٹروک کی وجہ سے وفات پا گئے اس طرح مئی ۱۹۷۳ء میں ہمارے ساتھ والے کیمپ میں حوالدار محمد شفیق کو ہیٹ سٹروک ہوا اور وہ فوت ہو گیا اس کے متعلق یہ علم ہوا کہ اسے ۸ مئی کو تیز ۱۰۶ درجہ بخار ہو گیا سر پر پٹیاں رکھی جانے لگیں مگر اس کو ہسپتال نہ لے جایا گیا۔ آخر ۱۴ مئی کو جب اسکی

حالت بالکل خراب ہوگئی تو اسے ہسپتال لے جانے کا بندوبست کیا گیا اور وہ بے چارہ وہاں پہنچتے ہی فوت ہوگیا ایسے لاپرواہانہ سلوک کا ہمیں دکھ بھی تھا اور غصہ بھی، اس کے لئے ختم قرآن اور دعائے مغفرت کی گئی اور جب ریڈ کراس کے نمائندے آئے تو ان کو رپورٹ کی گئی۔

انٹرنیشنل ریڈ کراس کے نمائندے ہر تین ماہ کے بعد کیمپوں کا چکر لگاتے تھے وہ کیمپ سٹاف کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کا اختیار تو نہ رکھتے تھے۔ البتہ ہماری شکایات پر مبنی وہ رپورٹ سوئٹزرلینڈ بھیج کر درست صورت حال سے دنیا کو آگاہ کرنے کا حق رکھتے تھے جس سے حکومتِ ہند کے ڈھول کا پول کھل سکتا تھا وہ تو دنیا کو بتانے میں مصروف تھی کہ قیدیوں کے ساتھ جنیوا کنونشن کے مطابق برتاؤ کیا جا رہا تھا۔ ریڈ کراس کے نمائندوں کے ساتھ کیپٹن وید یا کوئی اور بھارتی افسر آیا کرتا اور وہ نظر رکھتا کہ کون کون ان کے خلاف رپورٹ کر رہا ہے جو نمائندے جولائی اور نومبر کے مہینوں میں آئے ان کو اس بات کا شوق تھا کہ وہ اندرونی اور صحیح حالات سے واقفیت حاصل کریں۔ میں نے دونوں دفعہ ان نمائندوں کو مکمل حالات سے آگاہ کیا اور درخواست دی جو میں نے پہلے سے تیار کر رکھی تھی اور جن میں جنیوا کنونشن کی پچاسی خلاف ورزیوں کا ذکر تھا کیپٹن وید نے یہ درخواست دیتے ہوئے مجھے دیکھ لیا اور نمائندوں کے چلے جانے کے بعد مجھے بلا کر متنبہ کیا۔ ایسی شکایتیں لگانے کا مجھے خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔ ریڈ کراس کا نمائندہ میری تفصیلی رپورٹ وصول کر کے بے حد خوش نظر آتا تھا اس نے مجھ سے کہا کہ یہ تمام باتیں وہ ضرور اپنی رپورٹ میں درج کرے گا ان دنوں بھارت میں انٹرنیشنل ریڈ کراس کے مشن کا چیف مسٹر ہاف مین تھا وہ اپنی ذمہ داری سے بڑی اچھی طرح عہدہ برآ ہوا اس نے اپنی رپورٹ جو جنیوا بھیجی اس میں بھارت کے خلاف سنگین الزامات جن کا ذکر بھارت پاکستان اور بیرونی ممالک کے اخبارات میں ہوا ہم نے جتنی شکایات

کی تھیں ان میں کبھی بھی مبالغہ آمیزی یا الزام تراشی کی غرض سے کام نہ لیا بلکہ ہمیشہ سچی بات کہی۔ خیر! مسٹر ہاف مین کی رپورٹوں کے خلاف بدلہ کے طور پر حکومت ہند نے اُسے اور اس کے بیشتر ساتھیوں کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر ملک سے نکل جانے کا حکم دیا اس کے ساتھ ہی حکومت ہند نے کیمپ کے عہدیداروں کو ہدایات بھی جاری کیں کہ وہ حالات کو بہتر بنائیں کیونکہ بین الاقوامی پریس میں بھارت کی بے حد بدنامی ہو رہی تھی ہم سب جنگی قیدی مسٹر ہاف مین اور اس کے تمام ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنا فرض غیر جانبدارانہ اور منصفانہ طریق سے ادا کیا۔ ایسی بین الاقوامی ملازمتوں اور عہدوں پر بھاری تنخواہیں ملتی ہیں اور بڑی مراعات حاصل ہوتی ہیں ہر کوئی اپنے ذاتی مفاد کو اپنے فرض کی انجام دہی کے لئے ٹھوکر لگانے کو تیار نہیں ہوا کرتا۔

مسٹر ہاف مین اور ان کے ساتھیوں کے چلے جانے کے ساتھ ہی انٹرنیشنل ریڈ کراس کے نمائندوں پر پابندی لگا دی گئی جو کئی ماہ جاری رہی پھر ان کا نیا چیف پوسٹ ہوا اور اس کے ساتھ ان کے نئے نمائندے مگر مسٹر ہاف مین کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اسکی وجہ سے وہ محتاط نظر آتے ہمیں ملتے اور شکایات سنتے وقت ڈپلومیسی سے کام لیتے ان کی کوشش یہی ہوتی کہ کسی طرح ہم شکایات نہ ہی کریں تو بہتر ہے کیونکہ وُہ کہتے کہ ہم موثر کاروائی کرنے سے معذور ہیں اور محض رپورٹ کرنے سے کیمپ سٹاف ناراض ہو کر زیادہ ہی تنگ کریں گے اکثر ان کا رویہ یہ ہوتا کہ جنیوا کنونشن کی خلاف ورزیوں پر پردہ پوشی ہی کریں اغلباً وہ مصلحتاً یوں کرنا چاہتے تھے کچھ ہمارے آرام کا ان کو پاس ہوتا اور کچھ اپنے مفاد کا۔ یہ ان کا نقطہ نظر اور پالیسی تھی جس میں ہم دخل دینے کا اختیار نہ رکھتے تھے۔

لاؤڈ سپیکر پر آل انڈیا اور پاکستان کی خبروں کے علاوہ دن میں تین مرتبہ قیدیوں کے لئے اور پاکستان کے لوگوں کے لئے پروپیگنڈے کا پروگرام نشر ہوتا اس میں قیدیوں

کے پیغامات اپنے عزیزوں کے نام، فلمی گانے اور حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوا کرتا اس تبصرہ میں پروپیگنڈے کا عنصر شامل ہوتا۔ اس کے علاوہ گانے لگے رہتے جن کو سن کر تھکاوٹ ہو گئی اگرچہ جب وہ بج رہے ہوتے تو بعض دفعہ یوں معلوم ہوتا اور خاص طور پر رات کے وقت جیسے بھرے بازار میں کسی نان بائی یا سستے ہوٹل میں بیٹھے ہوں کیمپ کی باڑوں پر دس گز کے فاصلے پر روشن ٹیوبیں لگی تھیں اس لئے کیمپ کے صحن میں رات کے وقت بھی دن چڑھا ہوتا تھا اگرچہ بارک کے اندر بجلی اکثر خراب ہوتی رہتی مگر کیمپ کے اردگرد کی روشنی کے انتظام کے لئے ایک سٹینڈ بائی انجن کا بندوبست تھا جو بجلی کے خراب ہونے کے ساتھ ہی آن کر دیا جاتا کبھی بھی ایسا نہ ہوا کہ باہر کی روشنی چند منٹوں کے لئے بھی گل رہی ہو یہ سیکورٹی کے لئے ضروری تھا تاکہ اندھیرے میں کوئی فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔

بھارت موسیقی کے میدان میں پاکستان سے بہت آگے ہے ہونا بھی چاہیئے کیونکہ رقص و ساز ہندوستانی تہذیب و مذہب کا ایک اہم جزو ہیں بھارت کے فلمی گانوں کے بہتری کے باوجود ہمارے تمام ساتھی پاکستانی گانے سن کر زیادہ محفوظ ہوتے ہیں، میں اکثر دیکھا کہ وہ ہندوستانی گانوں کے مقابلے میں پاکستانی گانوں کو ترجیح دیتے وطن سے آئی ہوئی آواز اور وطن کے گلوکاروں اور گلوکاراؤں کے ناموں اور آوازوں سے یہ انس اور اس سے بڑھ کر وہ جذبات جن کا بیان کرنا اور ان کا تصور بھی مشکل ہے اس ترجیح کے سبب ہو سکتے ہیں ان دنوں قومی گانوں۔ سے خون میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ دو نغمے بے حد پسند آئے۔

۱۔ سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد

۲۔ جگ جگ جئے میرا پیارا وطن

پہلا ترانہ سب سے پہلے کراچی میں ایک جلسے میں جہاں صدر بھٹو تقریر کر رہے

تھے بچوں کی آواز میں سنا اس کے وزن اور اسی بحر پر کیپٹن ذاکر نے بھی ایک ترانہ لکھا جو ہم اکثر کیمپ کے اندر منعقد ہونیوالی محفلوں میں ملکر پڑھا کرتے تھے اس کے بند بھی بڑی اچھی طرح حب الوطنی کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اگست میں ایک تفصیلی تلاشی ہوئی یہ تلاشیوں کا سلسلہ گاہے لگاہے جاری ہی رہا۔ چیکنگ کرنے والے این سی او نے کیپٹن طارق کے ساتھ ترش کلامی کی جسکا جواب اس نے ایسی ہی ترشی اور تلخی سے دیا۔ یہ بات کیپٹن وید کو پسند نہ آئی اس بات پر اسکو چارج پر رکھدیا گیا اور بہانہ یہ لگایا کہ اس کے کپڑوں پر مارکنگ ٹھیک طور پر نہ تھی۔ اسے پانچ روز کی قید تنہائی کی سزا دی گئی اسی روز لیفٹنٹ علی کے شیونگ بیگ کے اندر سے چند پاکستانی نوٹ برآمد ہوئے اسے بھی پانچ روز کی سزا دی گئی۔ چنانچہ ہمارے دونوں افسروں کو پرانے کیمپ کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ پانچوں روز ان کو روزانہ صرف ایک سوکھی روٹی دی گئی یہ جینیوا کنوینشن کی خلاف ورزی تھی جس دن وہ واپس آئے ہم سب نے مل کر ان کی دعوت کی وہ بے حد مشکل وقت گزار کر آئے تھے ان کی باتوں سے ان کی بلند حوصلگی اور اولوالعزمی ظاہر ہوتی یہ پانچ روز کی سختی جھیلنے کے بعد انہوں نے اپنی مستقبل کی زندگی کے لئے قیمتی سبق سیکھے جو ان کی زندگی کے ہر موڑ پر خاص کر آڑے وقت میں کام آئیں گے سزا یافتگان کی آمد پر یہ دعوت اور خاطر کی رسم بن گئی تھی ایک دو روز کے لئے ان کو گھی دال روٹی دی جاتی اور ان کی واپسی کی خوشی میں ایک عدد محفل منعقد کی جاتی کیمپ سے تو واپس پاکستان جانے کی تمنا دل میں ہوتی لیکن جب کسی کو سزا اور اسے دوسرے کیمپ کے کمرے یا کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا تو پھر وہ واپس کیمپ پہنچنے کے دن کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتا اور کیمپ کی بندشیں اور مشکلات اسے سہل دکھائی دینے لگتیں۔ مشکل اور آرام کا تصور اصل میں مقابلتاً ہے ایک وقت ایسا ہوتا ہے جب معمولی مشکل کی زندگی بڑی پرعذاب

معلوم ہوتی ہے اور اگر مشکلات میں اضافہ ہو جائے تو پھر معمولی مشکل والی زندگی ایک نعمت سی نظر آنے لگتی اس بارے میں شیخ سعدی نے اپنی گلستان میں لکھا ہے کہ اگر آپ بہشت والوں سے اعراف کے متعلق پوچھیں گے تو وہ کہیں گے کہ اعراف دوزخ ہے مگر اگر دوزخ والوں سے پوچھیں گے تو انہیں اعراف جنت دکھائی دے گی۔

ستمبر کے آخر میں جوانوں کے بلاکوں میں تین دفعہ گولی چلنے کی وارداتیں ہوئیں۔ جوانوں کو شام کو بیرک سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی شاید اس وقت ان کی بیرک کے اندر پیشاب خانہ نہ بنا تھا چنانچہ پیشاب کرنے کی خاطر یہ چند جوان برآمدے میں نکلے اور بغیر کسی تنبیہہ کے سنتری نے ان پر گولی چلادی۔ یہ واقعات ۲۳ ستمبر ۲۵ ستمبر اور ۲۷ ستمبر کو رونما ہوئے۔ ان میں سے دو وارداتوں میں ہمارے دو سپاہی زخمی ہوئے اور یہ ہمارے عقب کی بیرک میں ہوئیں۔ ہمیں گولی چلنے کی آواز آئی۔ آئندہ روز اس بیرک کے تمام قیدیوں کو دو تین روز تک سزا کے طور پر دھوپ میں بٹھا رکھا گیا اور ان کو زدوکوب کیا گیا۔ ہم سب نے اکٹھے ہو کر میٹنگ کی تاکہ اس بارے میں اپنا ردعمل تجویز کریں میں اور میرے چند ہم خیال لوگ اس بات کے حق میں تھے کہ اگر ہمارے جوانوں کے ساتھ زیادتی کی جا رہی ہو تو ہم تماشائی بن کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمیں پرزور احتجاج کرنا چاہیے اور انٹرنیشنل ریڈ کراس کے نام فی الفور ایک شکایت درخواست کی شکل میں روانہ کر دینی چاہیئے مگر ہمارے ساتھیوں کا بھاری طبقہ ایسا تھا جو نہ تو احتجاج کے حق میں تھا اور نہ ہی ریڈ کراس کو درخواست دینے کے حق میں ان کا خیال تھا کہ صرف کیمپ کمانڈر سے ہمارا نمائندہ ملکر اپنی تشویش کا اظہار کر کے چھوڑ دے کیونکہ احتجاج سے شاید جوانوں کو زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑے اور شکایت بھیجنے سے ہمارے خلاف بھی کچھ پابندیاں عائد کر دی جائیں خیر! کافی بحث مباحثہ کے بعد ریڈ کراس کے نام درخواست دی گئی لیکن بعد میں کمانڈنٹ کی یقین دہانی کی بنا پر واپس لے لی گئی

ہم چند تو اس بات کے قائل تھے یعنی وہی سرنگ میں حصہ لینے والے کہ ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت اگر ہمیں جوانوں کے حق میں احتجاج سے تکلیف کا سامنا کرنا پڑے تو سر آنکھوں پر مگر دانشور اکثر مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کے قائل ہوا کرتے ہیں کیونکہ ایک لحاظ سے اس رویے میں آسانی اور آرام پنہاں ہوتا ہے اور یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ آسانی و آرام کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے لیکن مشکلات کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے طبعیت پر بوجھ ڈالنا اور دل و دماغ کو مجبور کرنا پڑتا ہے۔ اسی بوجھ ڈالنے اور دل و دماغ کو مجبور کرنے کو دوسرے الفاظ میں یقین محکم اور عمل پیہم کہتے ہیں۔

جون کا مہینہ شطرنج کھیل کھیل ضائع کرنے کے بعد اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ اتنے قیمتی وقت کو اس طرح بیکار صرف کرنا بہت بڑی حماقت ہے یہ کہنا کہ قید خانہ کے اندر کوئی مفید کام نہیں کیا جاسکتا۔ بجا نہیں۔ ان نظر بندی کے ایام میں سوچ و بچار۔ کتابوں کا مطالعہ۔ تحریر زبان سیکھنے اور عبادت خدا کے لئے وقت ہی وقت تھا، یہ انسانی عادت ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کئی کام کرنے کی ٹھانتا ہے کئی منصوبے اس کے دماغ میں آتے ہیں مگر وہ ان کو ملتوی کرتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنی زندگی کے آخری مراحل تک آپہنچتا ہے باوجود پچاس ساٹھ یا ستر سال زندہ رہنے کے اسے پھر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام وقت تو آنکھ جھپکنے میں ہی گزر گیا اور اس کے تمام منصوبے محض خیالوں کے جال ہی بنے رہے، جب دل میں کچھ ٹھان لیا جائے تو پھر فوراً اسے کر گزرنا چاہیئے۔ التوا سے اکثر یوں ہوتا ہے کہ وہ کام کبھی ہو نہیں پاتا۔ انسانی دماغ کی اہلیت اور جسمانی قوت اتنی غیر محدود ہے کہ اس تھوڑی سی زندگی میں بے شمار کام کئے جاسکتے ہیں تاکہ زندگی کے آخری ایام میں یہ حسرت نہ رہے کہ وقت مفید طور پر صرف نہ ہو سکا، مثلاً ایک شخص یہ سوچتا ہے کہ فلاں مضمون پر کتاب لکھوں گا

اس کی خواہش بھی ہوتی ہے کچھ مواد بھی موجود ہوتا ہے مگر وہ شروع کرنے کا ارادہ ہی کرتا رہ جاتا ہے وقت کی رفتار بڑی تیز ہے وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا یہ ہم سب سنتے آتے ہیں مگر ان مقولوں پر کبھی سنجیدگی سے غور کر کے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہمارے کیمپ میں درجن بھر افسر ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے پوری نظر بندی ذہنی تفکرات میں یا سو کر گزارا جیسے نظر بندی نے ان کو ہر قسم کی ذہنی اور جسمانی مشق سے روک دیا ہو جو کچھ قید میں ہو سکتا تھا وہ بھی انہوں نے پاکستان واپس جا کر کرنے پر ملتوی رکھا۔ پڑھائی اور عبادت کا یہ نادر موقع تھا اور کافی افسروں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا ہم نے کوشش کی کہ فوجی مضامین کی کلاسیں چلائی جائیں کچھ تو اپنے طلبا ہی اس کے شوقین نہیں تھے اور پھر حکام نے کلاسیں منعقد کرنے سے منع کر دیا پھر بھی کرنل ستار نے سگنل افسروں کے لئے روزانہ ایک عدد پیریڈ رکھا اور سات افسروں کو جرمن زبان سکھانا شروع کی۔ اسی طرح پشتو کی کلاسیں بھی چلیں: بچیس افسروں نے پشتو سیکھنا شروع کی چند ہفتوں تک بیحد شوق رہا ہر طرف استڑا موشا اور ڈوڈا خورے کی آوازیں آیا کرتیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شوق کم ہوتا گیا۔ زیادہ تر نے چند روزمرہ فقرات سیکھنے پر ہی اکتفا کیا چھ سات افسروں نے پشتو میں کافی مہارت حاصل کر لی۔

پھر ہندی سیکھنے اور دیونگری رسم الخط سیکھنے کی لہر چلی جس کو دیکھا کا۔ کھا گا گھا کی دھن لگائے بیٹھا ہے سنسکرات کے الفاظ اب ہندی میں کافی سرایت کر آئے ہیں ان کا مطلب تو شاید ہندیوں کو خود بھی نہ آتا ہو بہر صورت سلیس ہندی جس میں عام اردو الفاظ ہوں دیونگری رسم الخط میں لکھ پڑھ لینے کے قابل ہو گئے اپنی پشتو تو ذرا ڈھیلی رہی مگر ہندی میں کافی مہارت ہو گئی پھر کرنل جعفری نے فارسی کی کلاسیں شروع کیں، ۳۱ افسروں نے فارسی پڑھنا شروع کی اور گھٹتے گھٹتے صرف تیرہ رہ گئے۔ ان میں سے چھ نے کافی مہارت حاصل کر لی۔ زبان سیکھنا بالکل مشکل نہیں بعض تو بیحد جلدی سیکھ

سیکھ لیتے ہیں بعض کو ذرا محنت کرنی پڑتی ہے زبان کے سیکھنے کے لئے بغیر ہچکچاہٹ اور شرم کے غلطیوں کی پرواہ کئے بغیر بولنے کی عادت نہایت ضروری ہے آخر اگر دو سال کا بچہ بولنا سیکھ سکتا ہے تو بڑے کے لئے آسان ہونا چاہیئے۔

جولائی سے نومبر تک کا پروگرام کچھ یوں ہوتا صبح پانچ بجے کی رول کال سے فارغ ہو کر نماز پڑھی جاتی۔ پھر سویا جاتا ساڑھے سات بجے ناشتہ آٹھ بجے رول کال پھر فارسی کلاس پھر کتاب کا مطالعہ بارہ بجے دوپہر کا کھانا آدھ گھنٹہ آرام نہا دھو کر ظہر کی نماز تحریر جس میں میری یہ ڈائری اور بچوں کی کہانیاں شامل تھیں۔ مطالعہ نماز عصر۔ والی بال اور جسمانی مشق اور صحن میں دوڑ۔ نہانا تلاوت قرآن۔ نماز شام۔ طعام صحن میں چہل قدمی نماز عشاء رول کال۔ ایک شطرنج کی بازی دس سے بارہ بجے تک مطالعہ اور پھر نیند۔ بڑا مشغول وقت گزرتا۔ ہر ہفتے میں کم از کم ایک عدد پانچ چھ سو صفحوں کی کتاب پڑھ لی جاتی۔ ربعہ سیپارہ با تفسیر پڑھ لیا جاتا۔

مجھے لکھائی کا شوق تھا جس کو میں التوا میں ڈالتا چلا آیا تھا چنانچہ ایک مجموعہ بچوں کے لئے کہانیوں کا لکھا روزمرہ کی کہانی اس ڈائری کی شکل میں لکھا کرتا انگریزی میں حالاتِ حاضرہ اور دیگر عنوانوں پر مضامین لکھا کرتا۔ جہاں پر پڑھنے لکھنے کا کام جاری رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر لمحہ فرار کی کوئی نئی ترکیب اور راہ ڈھونڈنے کی خواہش دل میں مچلتی رہی اگر سوچیں گے تب ہی کوئی ترکیب سوجھے گی اور سوچنے کے لئے خواہش کا ہونا ضروری امر ہے ورنہ دماغ کام ہی نہیں کرتا چنانچہ ہم وہی درجن بھر کے قریب افسر اکٹھے ہو کر سوچ بچار کیا کرتے۔ کچھ حفاظتی تدابیر اتنی کڑی کر دی گئی تھیں کہ کام زیادہ مشکل ہو گیا تھا اس کے علاوہ باقی ماندہ افسروں کا رویہ کچھ ایسا تھا کہ وہ کسی مزید فرار کی کوشش کے حق میں نہ تھے یہ رویہ ہمارے لئے کافی حوصلہ شکن تھا جب ہم ذرا اکٹھے بیٹھتے تو ایکدم باقیوں میں چہ مہ گوئیاں شروع ہو جاتیں کہ یہ پھر کچھ حرکت کرنے والے ہیں

جس کا سدباب کیا جانا چاہیے کسی فرار کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کا نہ صرف بھارتیوں سے پوشیدہ رکھنا ضروری تھا بلکہ اپنے ان ساتھیوں سے بھی چھپانا ضروری تھا اور یہ بے حد مشکل کام تھا۔

ہم چند افسروں نے ایک پروگرام بنایا اس میں صرف ایک افسر فرار ہو سکتا تھا ان دنوں ہمارا خاکروب کیمپ کا کوڑا کرکٹ بوری میں ڈال کر ایک گڑھے میں پھینک کر لوٹ آیا کرتا اور اس بوری میں گھس کر باہر نکلا جا سکتا تھا میں نے خاکروب لال مسیح کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ مجھے بوری میں ڈال کر باہر پھینک آئے وہ ایک تو بوڑھا سا تھا دوسرا ذرا بیمار وہ اس بات کے لئے تیار نہیں ہوا۔ لانس نائیک عنصر کو میں نے آمادہ کیا وہ اس کے لئے بخوشی تیار ہو گیا مجھے ندیم اور منیر میں سے ایک نے بوری میں گھسنا تھا اس کے لئے ہم نے لاٹری ڈالی تو میرا نام نکلا۔ لانس نائیک عنصر کو دو تین مرتبہ باہر بوری اٹھوا کر بھیجا گیا۔ میں نے ٹٹی خانے کے اندر شام کے وقت بوری میں گھسنے کی مشق کی۔ اس روز کے لئے ارد گرد گھاس پھوس ڈالنے کے لئے اکٹھا کیا۔ تا کہ بازو یا ٹانگیں باہر نکلی ہوئی نہ لگیں۔ غیر نشان دہ کپڑے میں نے تیار کر لئے۔ بھارتی کرنسی کے چند نوٹ جو میں نے صابن کے اندر چھپا رکھے تھے وہ صابن جیب میں ڈالی۔ بس صرف موقع کا انتظار تھا ایسے دن جس دن اس باہر کے گڑھے کے قریب گائے چرانے والے چھوٹے چھوٹے لڑکے اکٹھے نہ ہوں ماہ رمضان تھا اس لئے رول کال صبح آٹھ بجے کے بعد شام پانچ بجے ہوا کرتی تھی اور بوری پھینکنے کے لئے اکثر آدمی صبح نو بجے باہر جایا کرتا تھا اس فرار کی تیاری کے دوران بے حد SUSPENSE رہا۔ عنصر کے لئے یہ بہت بڑا امتحان تھا کیونکہ میں تو بھاگ کر غائب ہو جاتا اور میرے بعد اس کی بری طرح گت بنتی اگر میں پکڑا جاتا تو پھر بھی شاید مجھ سے زیادہ سزا اس کو ملتی۔ مجھے تو صرف شوق اور تجسس اس بات کا تھا کہ ہمارے کیمپ سے کوئی فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے

شاید عنصر بھی اس امر کے خمیازہ بھگتنے سے بے بہرہ نہ تھا اس نے مناسب سمجھا کہ ایک آدھ اور بھروسہ رکھنے والے افسر کی رائے اس بارے میں لے لیکن اس نے اغلباً میری ہی خیر خواہی کا خیال رکھتے ہوئے اس کو میری مدد کرنے سے باز رہنے کی تلقین کی۔ ایک روز نادر موقع ملا۔ میں بمعہ اپنی چیزوں کے باورچی خانہ کی طرف گیا بوری تیار کی گئی ہر طرح سے کام تیار ہو چکا تھا صرف باڑ کا دروازہ کھلنے اور بوری کے باہر لے جانے کے وقت کا انتظار تھا آخری وقت پر عنصر نے ہچکچاہٹ ظاہر کی اوروں سے مشورہ لینے کا مشورہ دیا بنا بنایا منصوبہ رہ گیا اس کے چند روز بعد کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لئے دونوں باڑوں کے درمیان ایک گڑھا تیار کروایا گیا اور کوڑا وہاں پھینکا جانے لگا یعنی ایک نادر موقع ہاتھ سے نکل گیا اس میں بھی شاید اللہ میاں کی کوئی مصلحت پنہاں تھی یہی کہہ کر دل کو تسلی دی ورنہ اس معاملے کا بیحد صدمہ پہنچا۔

پھر سے سرنگ کھودنے کا منصوبہ ٹھیک نہ معلوم ہوتا اگر سب کے سب ساتھی ذرا ADVENTURE کے قائل ہوتے تو ایک نہیں درجن مرتبہ فرار کی کوشش کی جا سکتی تھی سزا کے طور پر چند ہفتوں کے لئے بند ہی کئے جاتے نا ADVENTURE اور جدوجہد جس میں SUSPENSE بھی ہو اس میں اتنا مزہ آتا کہ سزا زیادہ مہنگی نہ محسوس ہوتی۔

## ۱۷

ہفتے میں دو مرتبہ ہمیں پھل ملتا۔ کیلا یا مالٹا یا خربوزے کی ایک عدد پھانک۔ ہم نے ہری چھال کے مشہور کیلے کا نام سنا تھا مگر جس قسم کے کیلے اور مالٹے ہمیں وہاں کھانے کو ملتے وہ کھانے کے نہیں ایک عجوبے کے طور پر عجائب گھر میں رکھنے کے قابل ہوتے اگر مجھے کوئی کہے کہ اس شکل کے پھلوں کا نمونہ پیش کروں تو سارا پاکستان چھاننے کے باوجود شاید کامیاب نہ ہو سکوں۔ مالٹے کا سائز اور حجم چھوٹے لیموں کے برابر ہوتا

ایک دن اردلی پرات میں مالٹے ڈالے دور صحن میں تقسیم کر رہا تھا ہم برآمدے میں بیٹھے حیران ہو رہے تھے کہ یہ بوندی کے لڈو کہاں سے آ گئے خیر اگر صرف چھوٹے ہی ہوتے تو بھی اتنے ہرج کی بات نہ تھی۔ لیکن اس کا چھلکا جو بے حد مشکل سے اترتا اتارنے کے بعد سارے مالٹے سے زیادہ سے زیادہ آٹھ دس قطرے جوس نکلتا اگر ہم بچے ہوتے تو کھانے کی بجائے گولیاں کھیلنے کے لئے ان مالٹوں کو استعمال کرتے اور کیلا بڑے سے بڑا ڈیڑھ انچ لمبا ہوتا ہم تو حیران تھے کہ اتنے چھوٹے سائز کے پھل مہیا کرتے کیسے ہیں جاپانیوں نے چھوٹے سائز کے درخت اور پودے ایجاد کئے ہیں شاید ہندوستانیوں نے پھلوں کی ایسی تجربہ گاہ کھول رکھی تھی یہ ہمیں یقین ہے کہ اس سائز کے پھل ہمیں مہیا کرنے کی حکومتِ ہند کی پالیسی نہ تھی یہ تو نچلے درجہ پر کیا جا رہا تھا آخر ان کو تو ایک کیلا فی کس مہیا کرنے کا حکم تھا بڑے کیلے کی قیمت بھارت میں چار آنے سے کیا کم ہو گی اور شاید یہ دو پیسے کا ملتا ہو ٹھیکے داروں اور ٹھیکہ دینے والوں کے وارے نیارے ہوں گے حکومت نے پوری رقم ادا کی ہو گی۔

پورے ایک سال تک ہمیں راشن تولے بغیر دیا جاتا تھا کیونکہ تولنے کا پیمانہ ہی موجود نہ تھا۔ ہمارے نمائندے سے رجسٹر پر سرکاری سکیل کے حساب سے مقدار درج کر کے دستخط کروا لیا کرتے تھے۔ پھر کہنے سننے کے بعد پیمانہ مہیا کیا گیا تو معلوم ہوا کہ گزشتہ ایک سال سے زائد عرصے تک ہر ہفتے میں چالیس پونڈ گھی اور دس کلوگرام کھانڈ کم دی جاتی تھی ہمارے کیمپ میں کل ۸۸ قیدی تھے اگر خورد برد کا یہ پیمانہ تھا تو پھر چھ ہزار گوالیار کے قیدیوں کے راشن سے منتظم صاحبان کس قدر کٹوتی کر کے اپنا پیٹ بھر رہے تھے یہی وجہ تھی کہ کیمپ کے سٹاف پر جو بھی بھارتی افسر ہو یا این سی او یا جے سی او آتا چند روز میں ہی موٹا ہو کر پہلوان بن جاتا۔ مثال کے طور پر جب کیپٹن وید آیا تو اس کا وزن ۱۱۸ پونڈ کے لگ بھگ تھا تین ماہ کے بعد وہ

۷۰ پونڈ کا موٹا سور ہو چلتا پھرتا دکھائی دینے لگا کیپٹن پاوار میجر وکرم چوہان اور آنند سنگھ کے وزن کم از کم تیس تیس پونڈ بڑھے ہوں گے۔ صوبیدار میجر اس قدر موٹا ہو گیا تھا کہ وہ اپنے پاؤں نہ دیکھ سکتا تھا کیونکہ توند راستے میں حائل ہونے لگی تھی کیپٹن وید اور پاوار جب دو دو ماہ کی چھٹی پر گئے تو لوٹنے پر پھر سے دبلے پتلے ہو گئے کیمپ میں نوکری کے لئے نہیں شاید نانی اماں کے گھر آتے ہوئے تھے گھی اور کھانڈ جیسے اماں کے گاؤں اور باپ کی ملوں سے آرہا ہو قیدیوں کا راشن کھا کھا کر موٹے ہو رہے تھے ان میں سے ایک ایماندار بھارتی این سی او کو جب کم راشن دینے کی شکایت کی تو وہ کہنے لگا کہ جہاں ہر افسر کے گھر اس کا حصہ بھیجنا ہو وہاں آپ کو پورا راشن کیسے دیا جا سکتا ہے؟

ہر مہینے لکھنے کے لئے ہمیں چار کارڈ اور دو ائیر میل لیٹر ملا کرتے یہ ہمیشہ باقاعدگی سے ملتے شروع شروع میں تو خطوط کے آنے جانے میں دو اڑھائی مہینے لگا کرتے ایک سال کے بعد خطوط پچیس تیس دنوں میں ملنے شروع ہو گئے خط لکھنا بھی ایک مہم ہوا کرتی پہلے چند خطوں میں تو اپنی خیریت کی اطلاع اور ماحول کے متعلق لکھنے کیلئے کچھ مواد تھا کیونکہ حالات میں تو کوئی تبدیلی نہ ہوتی اس لئے سوائے اس کے ہر ایک کی خیریت پوچھی جائے یہاں کے موسم کا حال لکھا جائے اور ہر دفعہ یہ لکھدیا جائے کہ بالکل خیریت سے فکر کی ضرورت نہیں اور کوئی لکھنے کی بات نہ ہوتی پورے قیام کے دوران میں ۵۰ کے قریب خط لکھے ہوں گے ہر ایک کا مضمون شاید بالکل ایک ہی ہو پڑھنے والوں کو ان سے کیا تسلی ہوتی ہوگی اسی طرح پاکستان سے آئے ہوئے خطوط بھی سوائے خیر عافیت کی خبروں کے اور کسی طرح کی خبروں سے مبرا ہوتے جن خبروں کے متعلق معلوم کرنے کی خواہش ہوتی ہے مثلاً دوستوں کی تبدیلیاں فوج اور ملک کے حالات وغیرہ وہ آنے والے خطوط میں نہ ہوتیں دلچسپ خط لکھنا بھی ایک آرٹ ہے کئی لوگوں کے تین تین صفحات پر مشتمل خطوط پڑھنے کے بعد نہ مزہ

آتا ہے اور نہ ہی خبر ملتی ہے اور بعض اپنی مختصر تحریر میں بہت کچھ لکھ کر بڑی تسکین کا موجب بنتے ہیں اس اعتبار سے مجھے اپنی والدہ کے خطوط سے بڑی تسلی ہوا کرتی اور پورے خاندان کے بارے میں وہ سب کچھ معلوم ہو جاتا جس کے معلوم کرنے کی خواہش ہو سکتی ہے اپنے بچوں کو میں نے چند طویل خط لکھے ایسے ماحول میں انسان اپنے بچوں کے نصب العین انداز فکر ان کے مستقبل اور ان کے لئے زندگی کے اصولوں پر گامزن ہونے کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے عام حالات میں تو شاید روزمرہ کے کاموں سے فرصت ہی نہ ملتی کہ ان اہم باتوں پر توجہ دینے کا خیال بھی پیدا ہو مشکلات میں رہنے سے پاکیزہ اور سچے جذبات پرورش پاتے ہیں چنانچہ ایسے ماحول کی تحریر بھی زیادہ پر اثر ثابت ہوتی ہو گی جو قدریں میرے نزدیک زندگی کا سرمایہ بنائی جانی چاہییں ان کا ذکر میں نے اپنے بچوں کے نام خطوط میں کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میری کوشش کارآمد ثابت ہو گی۔

پاکستان سے آتے ہوئے تمام خطوط ہمیں نہ دیئے جاتے اندازاً صرف پچاس فیصد خط ہم تک پہنچے۔ باقی کہاں جاتے ان کا ہمیں پورا علم نہیں ہمارے تمام خطوط سنسر کرنے کے بعد پاکستان بھیجے جاتے اسی طرح وہاں سے آنے والے سنسر کے بعد ہمیں ملتے بھارتی افسروں کی جن سے ذرا ناراضگی ہوتی ان کے خط اکثر پھاڑ کر پھینک دیئے جاتے۔

گوالیار موسم کے لحاظ سے کافی صحت افزا مقام ہے پہلے پہل تو ہمیں یہ خیال تھا کہ یہاں بیحد گرمی ہو گی کیونکہ علاقہ کچھ ریگستانی ہے ۱۹۷۲ء میں اپریل کا مہینہ سرنگ کھودنے میں گزر گیا مئی کمرے میں بند رہ کر گزاری گئی جون کچھ گرمی محسوس ہوئی پھر ۲۵ جون کو بارشیں شروع ہوئیں جو ۱۵ اکتوبر کو ختم ہوئیں ۱۹۷۳ء میں مئی جون میں کچھ گرمی لگی آٹھ جولائی سے بارشیں شروع ہو گئیں۔ کیونکہ ہر وقت ہوا چلتی رہتی اس لئے گرمیوں کا موسم ایک تو مختصر ہوتا دوسرے غیر تکلیف دہ اکتوبر سے جون کے

مہینوں میں بالکل بارش نہ ہوتی سردیوں میں خوب دھوپ ہوتی اور صحن میں سارا دن دھوپ سینکنے کا خوب لطف رہتا۔

اگست میں جب انٹرنیشنل ریڈ کراس کے نمائندے آئے تو ان میں سے ایک نے محض اشارتاً کہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں چند ڈاکٹر جو کیمپوں کی ضرورت سے زیادہ ہوں ان کو پاکستان بھیج دیا جائے ان کے جانے کے بعد ہم کچھ ساتھی بیٹھے گپیں لگا رہے تھے میں نے اپنے ایک رفیق لیفٹننٹ کرنل ڈاکٹر کو کہا کہ ڈاکٹر صاحب اگر کہیں ایسی صورت نکل آتی کہ ہمارے ہاں سے چھ ڈاکٹروں میں سے صرف چند کو واپس جانا ہو تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گا کہ کون جائے اور کون رہے اس پر کرنل صاحب گویا ہوئے کہ اگر ایسی صورتِ حال پیش آئی تو کم از کم میں خود سب سے آخر میں جانیوالوں میں ہوں گا اور دوسروں کو پہلے جانے کا موقع دوں گا" اس پر میں نے کہا کہ قبلہ آپ کے خیالات مخلصانہ ہیں اور قابل فخر اور میں ان کی بیحد قدر کرتا ہوں لیکن یہ آپکی جذباتی رائے ہے اور حقیقت سے بہت دور خدانخواستہ اگر کہیں ایسا موقع آگیا اور آپ نے اس وقت پہلے جانے والوں میں اپنے آپ کو نامزد کر لیا تو مجھے بیحد افسوس ہو گا ایثار کا تقاضہ تو آپ کے خیالات کی مطابقت میں ہے لیکن وقت آنے پر ان خیالات کو عملی جامہ پہنانا مشکل ہو گا" لیکن انہوں نے بیحد وثوق سے اپنے ارادے کو دو تین مرتبہ دہرایا، کون جانتا تھا کہ ایک دن اس طرح کا مسئلہ پیش ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے وعدے کو اچھی طرح یاد رکھئے گا ایکدن آپ کا امتحان لیا جائے گا" اس دن سے میں نے ڈاکٹر صاحب کا امتحان لینے کا منصوبہ بنانا شروع کیا۔

دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے ایسا امتحان چند روز کے وقفہ کے بعد نہیں لیا جا سکتا کیونکہ اس صورت میں خود ساختہ صورتِ حال کو کوئی بھی ماننے کے لئے تیار نہ ہوتا خیر! نومبر کی یکم تاریخ کو میں نے اپنے دماغ میں بنائے ہوئے

ڈرامہ کا پہلا سین پیش کرنے کی ٹھانی میں نے کیپٹن پاور کی طرف سے ایک رقعہ اپنے کیمپ کے نمائندے کی طرف لکھا جس کا مضمون کچھ یوں تھا "ہمیں آرمی ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی کہ کچھ محدود تعداد میں ڈاکٹروں اور اے ایم سی کے عملے کی واپسی عمل میں لائی جانی قرار پائی ہے چنانچہ ڈاکٹر افسروں کے گھریلو اور دیگر مسائل کی بنا پر آپ یہاں پر موجود ڈاکٹروں کے نام اس رقعہ کی پشت پر اس ترتیب سے لکھیں کہ سب سے پہلے کس کو جانا چاہیے اور بعد میں کن کو۔ یہ رقعہ فوراً مجھے واپس بھجوا دیں اور اس خبر کو غیر ضروری طور پر مشتہر نہ کریں۔

پہلا مسئلہ یہ تھا کہ یہ رقعہ کس کے ہاتھ اور کس وقت کرنل غفور کو جو کہ ہمارے کیمپ کے سنیئر اور نمائندہ افسر تھے بھجوایا جائے وقت کے تعین کے لئے یہ نہایت ضروری تھا کہ وقت ایسا ہو جس وقت انسانی ہوش و حواس اور قوت ذہن سست ہو تا کہ اس رقعہ سے بیدار ہونے والے شکوک کو ذہن بھانپ نہ سکے۔ صبح کے وقت تو دماغ تر و تازہ ہوتا ہے اور قوت ذہن خوب کام کرتی ہے اس بات کو مدنظر رکھ کر دو بجے بعد از دوپہر کا وقت منتخب کیا۔ کرنل غفور دوپہر کا کھانا کھا کر نہا دھو کر اور نماز ظہر سے فارغ ہو کر سستانے کے لئے اپنے بستر پر لیٹنے ہی والے تھے کہ رقعہ انہیں پہنچا یا گیا پہلے بھی کیپٹن پاور کیمپ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے اور ہدایات دینے کے لئے کرنل غفور کو رقعے بھیجتا رہتا تھا۔ سارے ڈرامے کو کامیابی سے چلانے کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہ راز اگر ہو سکے تو مجھ تک ہی محدود رہے ورنہ اس کے فاش ہو جانے کا اندیشہ تھا یا اگر بیحد ضروری ہو تو ایک آدھ اور ساتھی کو مدد کے لئے ساتھ ملایا جا سکتا تھا رقعہ پہنچانے کے لئے میں نے کرنل ستار کی مدد لی اور ان سے میں نے پورے منصوبے کا ذکر کیا چنانچہ انہوں نے میرا رقعہ باورچی کو دیا اور وہ اسے یہ کہہ کر غفور صاحب کو دے آیا کہ باہر سے سنتری نے دیا ہے۔

میں ساتھ کے کمرے میں لیٹا چور آنکھ سے غفور صاحب کے رد عمل کا جائزہ لے رہا تھا ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی خبر نہ تھی چند ہی سہی لیکن افسروں کے واپس جانے کی خبر تھی غفور صاحب نے پہلی مرتبہ لیٹے میرے رقعہ کو لاپرواہی سے پڑھا ابھی آدھا ہی پڑھا ہوگا کہ بجلی کی طرح کوند کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بغور مطالعہ کیا پھر کھڑے ہوئے پھر بیٹھ گئے عینک لگائی رقعہ کو دو مرتبہ اور پڑھا پھر خاموشی سے اپنے ساتھ والے دوسرے کمرے میں گئے اور کرنل جعفری کو ساتھ لے کر واپس پلٹے اسے بڑے رازدارانہ انداز سے رقعہ پڑھوایا ان سے کچھ مشورہ کیا پھر گئے اور میرے رفیق ڈاکٹر کرنل صاحب کو لے کر باہر صحن میں درخت کے نیچے جا بیٹھے ناموں کی ترتیب تو ہمارے کرنل صاحب ہی بتا سکتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنا نام سب سے اُوپر لکھوایا پھر ایک میجر صاحب کا اور ایک کیپٹن کا اور پھر دوسرے تین ڈاکٹروں کا۔ رقعہ کی پشت پر یہ نام درج کرنے کے بعد غفور صاحب نے یہ رقعہ کیپٹن پاوار کو بھجوانے کا بندوبست کیا مگر وہ اس تک پہنچنے سے پہلے ہی اڑا لیا گیا ڈرامے کا پہلا سین بیحد کامیابی کے ساتھ سٹیج ہوا اور آئندہ سین کے لئے راستہ بالکل ہموار ہو گیا

ایک تو رقعہ کی عبارت میں یہ درج تھا کہ اس خبر کو صیغۂ راز میں رکھا جائے اور دوسرے یہ ڈاکٹر صاحب کے بھی حق میں تھا کہ اس کی خبر کسی کو نہ ہو ورنہ شاید جن ڈاکٹروں کے نام فہرست میں نیچے درج کئے گئے تھے وہ ناخوش ہوں اور ڈاکٹر صاحب کو انہیں مطمئن کرنا پڑے۔

ڈاکٹر کرنل صاحب اس دن سے بیحد خوش و خرم نظر آنے لگے یہ تو قدرتی بات تھی۔ واپس پاکستان پہنچ جانے کی امید کی راہ سامنے دکھائی دینے لگی تھی سارا دن قہقہے لگاتے ان دنوں ماہ رمضان تھا وہ ہر روز افطاری پر اپنے دوستوں کی افطار پارٹی کرتے کینٹین سے خرید کردہ کھانے کی چیزوں کا ان کے پاس سٹاک ہوا کرتا تھا

اسے بڑی فراخدلی سے ہر کسی کو پیش کرتے آخر کرتے بھی کیوں نہ۔ پاکستان واپس جانے والے تھے اور اتنی بڑی خوش خبری کے پیش نظر ان چیزوں کی کیا وقعت تھی اگر صیغۂ راز میں رکھنے کی ہدایت نہ آئی ہوتی تو شاید اپنی خوشی کی داستان ہر کسی کو سناتے دل میں چہ مہ گوئیوں کا ابال تھا اسے باہر بکھیر کر اور خوشی محسوس کرتے کرنل جعفری کی چارپائی ان کی چارپائی کے ساتھ تھی صرف اسی سے دل کا حال کہہ پاتے کبھی گزرتے ہوئے ان کے چہرے پر نظر پڑتی تو صاف معلوم ہوتا کہ صرف ان کا جسم یہاں کمرے میں ہے ورنہ وہ خود لاہور یا کھاریاں میں اپنے عزیزوں سے ملنے میں مشغول ہیں اپنے بچوں کو پیار کر رہے ہیں دوستوں کے ساتھ دعوتیں اڑا رہے ہیں کوئی بھی ان کی جگہ ہوتا تو ایسے ہی خوابوں کی دنیا میں کھویا رہتا۔

۳ نومبر کو میجر جنرل جو ایریا کمانڈر تھا ہمارے کیمپ میں آیا وہ سب افسروں کو ملا پھر تمام ڈاکٹروں کو اس نے علیحدہ اکٹھا کیا اور ان سے مختصر طور پر بات چیت کی اور سوال پوچھے ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا کرنل صاحب سے خاص طور پر بڑی حلیم طبعی سے ملا جنرل صاحب کی اس آمد نے اور ان کے ڈاکٹروں سے علیحدگی میں ملنے نے میرے ڈرامے کو بے حد تقویت پہنچائی اس سے ڈاکٹر صاحب کو اور یقین ہو گیا کہ اسکا علیحدگی میں ملنا اور سوال جواب کرنا اس بات کی نشانی ہے کہ وہ اس کے بعد اپنی طرف سے ناموں کی سفارش کرے گا۔

تین چار روز اور گزر گئے پھر عید الفطر سے دو روز پہلے رات کے دس بجے کے قریب ڈرامے کا دوسرا اور آخری سین شروع ہوا ساڑھے نو بجے سب کی رول کال ہوئی ہم سب کو بیرک کے اندر معمول کے مطابق بند کر دیا گیا۔ باورچی. باورچی خانے کی چیزیں بند کرنے کے بعد آتے تھے اس لئے وہ تین منٹ بعد کمرے میں پہنچے تھے ان کو اندر بھیج کر بھارتی جے سی او اور این سی او چلے گئے اور باورچی نے طے کردہ

منصوبے کے مطابق حکم نامہ ڈاکٹر کرنل صاحب کو دیا کہ یہ دفتر سے ابھی سنتری نے دیا ہے وہ تفصیلی حکم نامہ میں نے پہلے سے تیار کیا تھا جس میں ان کے آئندہ صبح کو واپس جانے کے متعلق پوری ہدایات تھیں بیرک کے اندر بند ہونے کے بعد باہر سے رابطہ قائم نہ ہو سکتا تھا اور علی الصباح سحری کے وقت ان کو تیار رہنے کی ہدایات دی گئی تھیں اس کے علاوہ یہ ہدایت بھی دی گئی تھی کہ کم سے کم سامان ساتھ رکھیں کیونکہ شاید ان کو بذریعہ ہوائی جہاز جانا پڑے جسکا بندوبست کیا جا رہا تھا اگر کوئی فالتو سامان ہو تو یہاں ساتھیوں کو دے جائیں اسی طرح کوپن اگر کوئی بچے ہوں تو اپنے ساتھیوں کو دے جائیں وغیرہ وغیرہ ساری بیرک میں تہلکہ مچ گیا مبارک مبارک کی صدائیں آنے لگیں۔ کافی ایسے بھی تھے جن کو اس رقعہ کی صداقت پر شک تھا اور خیال ظاہر کر رہے تھے کہ ہو سکتا ہے کسی نے مذاق کیا ہو کرنل صاحب موصوف کے علاوہ دو اور ڈاکٹروں کے نام تھے جنہوں نے ان کے ساتھ جانا تھا وہ بھی بیحد خوش تھے مگر پیچھے رہنے والوں میں تھے ان کے دل کے حال کا اندازہ آپ خود ہی لگا لیجئے بعض نے ذرا زیادہ پر وثوق ہو کر کہا کہ ڈاکٹر صاحب یہ کچھ مذاق معلوم ہوتا ہے تو اس پر کرنل صاحب خاموش نہ رہ سکے اور بول اٹھے کہ مجھے تو واپس جانے کے متعلق چھ سات روز پہلے ہی علم تھا۔ بھارتی ڈاکٹر آیا تھا اس نے بھی ذکر کیا تھا یہ مذاق نہیں بالکل ٹھیک ہے سونے پر سہاگہ یوں ہوا کہ رات دس بجے کی خبروں میں آل انڈیا ریڈیو نے خبر دی کہ کچھ قیدیوں کو عید سے پہلے ہی پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا اس خبر سے رہا سہا شک بھی دور ہو گیا چنانچہ کرنل صاحب اپنے کھانے پینے کی اشیاء اپنے دوستوں میں تقسیم کرنے لگے۔ بارن ویٹا کا ڈبہ ایک کو مینگو سکواش کی بوتل دوسرے کو کوپن تیسرے کو بسکٹ چوتھے کو وغیرہ وغیرہ کہا جو وہ ساتھ لے جانا چاہتے تھے دو تین گھنٹے یوں ہی شور شرابا رہا ہم سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ چنانچہ میں اور کرنل ستار بستر میں گھس کر لحاف میں منہ لپیٹ کر مچل لگا کر لیٹ

رہے اس سے بعضوں کو شک ہوا کرنل فضل حق صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ یہ سب مذاق ہے ظاہراً تو وہ مان گئے مگر دل کسی طرح ماننے کو تیار نہ ہوا سحری سے پیشتر ہی چارپائی میں اٹھ کر بیٹھ گئے اور جعفری سے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ کیپٹن پاوار آئے ایسا نہ ہو کہ میں تیار نہ ہوں دن کی سفیدی کے ساتھ ساتھ صداقت عیاں ہونے لگی اور اُمید کی کرنیں ڈوبنے لگیں یہاں تک تو معاملہ دلچسپ رہا پھر ڈرامے کے تیسرے سین کا آغاز ہوا جس کی مجھے توقع نہ تھی۔ صبح آٹھ بجے تک تو کرنل موصوف نے سارے معاملے کو فراخدلی اور درست انداز میں لیا اگرچہ دل ہی دل میں خشمگیں ہوں گے مگر انہوں نے ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا یہ حضوران کی ذرہ نوازی تھی لیکن ساتھیوں میں کچھ فتنہ پرداز بھی تھے انہوں نے کچھ گرما گرم لگائیں ہو سکتا ہے کہ آپ کو دل کا دورہ پڑ جاتا یہ مذاق نہیں یہ تو بے عزتی کرنے کے مترادف ہے یہ سارا کھیل ناپسندیدہ تھا وغیرہ وغیرہ اکسانے والوں نے محترم ڈاکٹر صاحب کو اتنا غصہ دلایا کہ وہ آپنے سے باہر ہو گئے ہر کسی کو غیر پارلیمانی جملے سنانے لگے ان کو علم نہ تھا کہ یہ کاروائی کس نے کی ہے۔ ڈرامے کا یہ بھیانک اور تلخ سین تھا شام تک ڈاکٹر صاحب نے بڑا جلال دکھایا ہم دبکے کمرے کے اندر بیٹھے رہے شام کو سب نے مل کر روزہ افطار کرنا تھا ڈاکٹر صاحب نے بائیکاٹ کرنے کا اعلان کر دیا میں ان کے پاس گیا معافی کا خواستگار ہوا مگر انہوں نے کہا کہ سب کے سامنے معافی مانگی جائے ڈاکٹر صاحب کی مجھے قدر تھی اور ان کی ناراضگی کا احساس سب کو اکٹھا کیا گیا میں نے سارے معاملہ کی تمہید اور اگست کا قصہ بیان کیا اور بصد عجز وانکساری معافی کا خواستگار ہوا اس پر ڈاکٹر صاحب بولے کہ وہ تو میں نے محض مذاقاً کہا تھا میں نے جواب دیا کہ میں نے بھی تو مذاق کیا تھا کہیں سچ مچ تو ان کو پاکستان نہ بھجوا رہا تھا۔ مصافحہ کرنے اور بغل گیر ہونے کے بعد ہم نے ملکر افطاری کی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

مزاح یعنی لطیف قسم کا مذاق شگفتہ مزاجی اور جودت طبع کی دلیل ہے لیکن ہر کسی مذاق کا صحت مند پہلو ہونا چاہیے کہ مذاق کرنے والا اور جس کے ساتھ مذاق کیا جائے دونوں اس سے برابر کے محظوظ ہوں اگر جس کے ساتھ مذاق کیا جائے اس کو اس سے دکھ اور درد ہو تو ایسا مذاق مذاق نہیں رہتا ایک ناپسندیدہ حرکت بن جاتا ہے اس لحاظ سے مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے دل کو ٹھیس پہنچائی اگرچہ میں نے بغیر کسی کینہ کے یہ کھیل کھیلا تھا مگر اس کی ایسی صورت اختیار کر جانے کا جس سے ذرا بدمزگی پیدا ہو گی مجھے پہلے سے اندازہ نہ تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب اسے ویسے ہی صحیح انداز میں لیں گے جیسے کہ انہوں نے مجھے اپنا امتحان لینے کا چیلنج کیا تھا۔

یوم پاکستان ۱۴ اگست۔ یوم اقبال۔ عید میلاد النبی۔ برسی قائد اعظم۔ محرم یوم پیدائش قائد اعظم اور عیدین کو ہماری قومی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے خواہ ہم نظر بند تھے لیکن ہمارے لئے ان کی اہمیت عام حالات سے زیادہ تھی اور اس کا ہم میں سے بیشتر ساتھیوں کو احساس تھا چنانچہ ان تمام موقعوں پر ہم نے خاص محفلوں کا انتظام کیا جن میں ہر دن کی مطابقت سے اس پر مختصر مقالے پڑھے جاتے یا تقریریں ہو جاتیں اس اہم کام میں کیپٹن ذاکر نے بڑا اہم کردار انجام دیا کیپٹن ذاکر جو بلتستان کے رہنے والے تھے ان کو شاعری کا بیحد شوق تھا چنانچہ ایسے موقعوں پر انہوں نے نہ صرف محفل کا بندوبست کیا بلکہ ہر موقع کے لئے بڑے پائے کی نظمیں لکھیں اور پھر زینت محفل بنے رہے۔ محفل کا اختتام قومی ترانے سے کیا جاتا جو ہم سب ملکر گاتے اور پھر پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے ایک ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہمارے بعض ساتھی ہماری ان محفلوں کو غیر ضروری اور بے موقع و بے محل سمجھتے کہ ان حالات میں ان کا سامنا موزوں نہیں ہمیں ان کے اس نظریے سے اتفاق نہ تھا ہماری جدوجہد کی تاریخ اور ماضی کی روح پرور داستانیں حال اور مستقبل کی امیدوں کو جنم دے سکتی

ہیں اہم تاریخی واقعات اور ان کی درخشاں اور جلیل القدر شخصیتوں کے کردار اور عملی کارناموں کو حال کے تقاضوں کی بنا پر موثر انداز میں ان محفلوں جلسوں اور مجلسوں میں پیش کرنا ضروری امر ہے اور اگر ہمارے لئے قوم کی آزادی اور بقا کے تقاضے کوئی اہمیت رکھتے ہیں، تو ہمارا یہ فرض اولین ہے کہ اس اجتماعی احساس کی ترجمانی اور ان نظریات اور روایات کی حفاظت کریں جو ہمارے ملی حصار کے لئے حقیقی بنیادیں فراہم کرتی ہیں ان تمام عوامی تہواروں کو ہم نے بیحد سنجیدگی سے منایا۔ نوجوان افسروں کو خاص کر ان قومی دنوں کی اہمیت سے واقفیت ہوئی۔ اپنی تاریخ پیغمبر اسلامؐ۔ امام حسینؑ قائداعظم اور علامہ اقبال کے نصب العین کردار اور روایات کے ذکر سے ذہن متاثر ہوتا جذبات ابھرتے اور قلب کو گرمائش پہنچتی۔ قومی تعمیر کے لئے ان دنوں کا منانا ضروری ہے۔

پاکستان میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو ان دنوں کے منانے کی اہمیت نہیں سمجھتے شاید انہوں نے پاکستان میں بھی کبھی ان دنوں کو نہ منایا ہو۔ بلکہ ان کو منانے کی بجائے سونے کو ترجیح دی ہو اکٹھے ملکر قومی جوش کے مظاہرے سے حب الوطنی اتحاد یقین محکم اور تنظیم کی چنگاریوں کو ہوا ملتی ہے ان سے سلگتی چنگاریاں آگ بن کر ملک کو جگمگاتی اور گرماتی ہیں۔ ان موقعوں پر ہونے والی فوجی اور دوسری پریڈوں مجلسوں اور محفلوں میں ہمارے بچوں کی شمولیت نہایت ضروری ہے کیونکہ یہی مستقبل کے علمبردار ہیں وقتاً فوقتاً ایسے جوشیلے مظاہروں سے ان کے دل و دماغ پر اثر پڑتا ہے البتہ یہ دن جاتے پارٹیوں۔ رقص و سرود کی محفلوں اور طاؤس و رباب کی مجلس منعقد کر کے منانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

ہمارے دو ساتھی کیپٹن جاوید جلال الدین اور سپاہی خوشی مسیح عیسائی تھے اس لئے کرسمس اور نیو ایئر ڈے منانے کے لئے ہمارا ان کا ساتھ دینا ضروری تھا خاص کر اس لئے جبکہ کیپٹن جاوید نے ہمارے ہر تہوار خواہ وہ عید تھی یا محرم کی

دسویں یا عید میلاد النبی پوری طرح شمولیت کی۔ یہ ان کی جذبۂ دوستی اور کامریڈشپ کی اعلیٰ مثال تھی کیپٹن جاوید نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ فوجی اور جرأت مندی کے نقطۂ نظر سے بھی قابل ستائش ہیں سرنگ کھودنے میں وہ پیش پیش رہے اور جب بھی ہم ملکر فرار کا کوئی منصوبہ بناتے تو ہر طرح سے اپنا کردار ادا کرنے کے لئے راضی ہوتے کرسمس کے موقع پر کیمپ کے حکام نے انہیں گرجا لے جانے کا بندوبست کیا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اپنے ساتھیوں کے بغیر کسی تقریب میں حصہ لینے کے لئے تیار نہیں اور نہ ہی میں آپ کا احسان مند ہونے کا خواہش مند ہوں ہم نے انہیں اور خوشی مسیح کو اپنی دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے جو کچھ بن پڑا اپنی طرف سے چھوٹے چھوٹے تحفے دیئے۔ سگریٹ۔ بسکٹ کا ڈبہ۔ ٹوتھ پیسٹ وغیرہ جو ہمارے ساتھی ان موقعوں پر شریک نہ ہوتے ان کی ہچکچاہٹ کی ایک وجہ شائد یہ تھی کہ پاکستان زندہ باد کے نعروں سے کیمپ اتھارٹی کی طرف سے گرفت ہو سکتی تھی اور وہ خواہ مخواہ کسی ایسے عتاب تلے آنے کے لئے تیار نہ تھے ہو سکتا ہے کہ وہ درست ہوں کہ غیر ضروری طور پر مشکل میں پڑنا کوئی عقل کی بات نہ تھی لیکن ہمارے لئے اپنے ملک کا نعرہ لگانے کی خاطر اگرچہ چند روز کی قید تنہائی بھی برداشت کرنا پڑتی تو ہمیں بڑی خوشی ہوتی۔ کیمپ کے اندر پروجیکٹر لگا کر مہینے دو مہینے میں ایک فلم دکھاتے۔ شروع کی تین چار فلمیں دھرم پتر۔ آنند اس طرز کی تھیں جن سے ظاہر ہو کہ ہندو مسلم کا مذہبی اختلاف اس نوعیت کا نہیں کہ جن سے علیحدگی اختیار کی جائے بلکہ مذہب کے اختلاف کے باوجود سب ایک ہی تہذیب و تمدن کے حامل ہیں خوش طبعی کا سامان مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ان فلموں کا مقصد ہمارے دو قومی نظریے کے خلاف پرچار تھا پہلی چار پانچ فلمیں میں نے بھی دیکھیں لیکن مئی کے بعد نارواسلوک اور پھر بعض کیمپوں میں ہمارے سپاہیوں کے بے جا قتل کی خبروں کے بعد ان کے مزید فلمیں دکھانے کو میں

موزوں نہ گردانتا تھا یہ میرا خیال تھا لیکن ماسوائے چھ سات افسروں کے باقی تمام سینما دیکھنے کے شریک تھے ان کی طرف سے دکھائی جانے والی فلموں کے علاوہ انہوں نے قیمت ادا کر کے فلمیں منگوانے کی خواہش ظاہر کی۔ باقی ماندہ قیام کے دوران میں نے ستار شریف۔ میجر صلاح الدین۔ نعیم بھٹی۔ کیپٹن ظفر سعید ملک۔ لیفٹننٹ اسد۔ لیفٹننٹ طلعت اور ایس پی منظور شاہ نے فلموں کا بائیکاٹ رکھا۔

میری رائے میں ان بھارتی افسروں سے کسی قسم کی مانگ چہ جائے کہ فلموں جیسی غیر ضروری چیز کی مانگ کرنا نامناسب تھا لیکن ایسا کرنے کے لئے خواہشات کو دبانے کا جذبہ ضروری ہے زندگی بھر فلمیں دیکھیں واپس جا کر انشاء اللہ پھر دیکھی جائیں گی یہاں نہ دیکھ کر اتنی تسکین ہوئی جو دیکھنے سے کبھی حاصل نہ ہوتی۔

مہتی کے بعد جب کیپٹن پادار، کیپٹن وید میجر وکرم چوہان اور کرنل آنند جب بھی آتے تو ان سے بات کرنے کو جی نہ چاہتا وہ دانستہ طور پر ہماری بے عزتی کرنیکے مواقع ڈھونڈتے تھے پھر کیونکر ہو سکتا تھا کہ ان سے گپ شپ لگائی جا سکے حیرت کا مقام ہے کہ اپنی کارکردگی کو جانتے بوجھتے ہوئے یہ حضرات اور دوسرے بھارتی افسر کیمپ میں خوش گپی کرنے کے لئے آتے میں ان کے ساتھ بدتمیزی یا بدتہذیبی سے پیش آنے کا قائل نہ تھا لیکن یہ مجھے ہرگز گوارا نہ تھا کہ ان سے مرغی خانے۔ فلموں۔ گانوں۔ بین الاقوامی مسائل۔ تجارتی کاروبار وغیرہ کے متعلق گفت و شنید کروں میری خودی یہ گوارا نہ کرتی تھی۔ سرکاری بات چیت جو ہاں نہ تک محدود ہو وہ مناسب تھی۔ اس سے زیادہ ناجائز پھر بھی ہم سے چند اپنی عادت سے مجبور ہو کر ان سے خوش گپیوں میں مصروف نظر آتے تو دل کو بڑا دکھ ہوتا۔

۵ اگست کا ذکر ہے کہ کیپٹن ندیم غسل خانے میں نہا رہا تھا اس نے وہاں کوئی ایسی بات کہی جو سامنے گزرنے والی سڑک سے گزرتے ہوئے بھارتی عہدادار نے سن لی اس کی رپورٹ ہو گئی۔ ندیم کو چارج شیٹ پر سے جایا گیا اسے پانچ روز کی قید تنہائی کی

سزا ملی جس کے دوران اسے روز کی صرف ایک سوکھی روٹی ملا کرتی پانچوں دن اسے ایک چھوٹے سے سٹور میں بند رکھا گیا اس نے سزا جرأت مندی سے کاٹی جب وُہ واپس لوٹا تو بیحد کمزور نظر آتا تھا لیکن اس کا حوصلہ بلند اور عزم پہلے سے مضبوط نظر آتا تھا جو لوگ ان حالات میں بلند حوصلگی ۔ جوانمردی ۔ فرض شناسی اور جرأت مندی کا رویہ اختیار کر سکتے ہیں وہ میدان کارزار میں بھی ان خوبیوں سے مسلح پائے جائیں گے ندیم میں ان خصوصیات کی کمی نہ تھی اگرچہ کبھی کبھی ذرا تیز مزاجی کی جھلک دیا کرتا جو شاید جواں خوں کی وجہ سے تھی ۔

نظر بندی باقی چیزوں کے علاوہ اس لحاظ سے بھی بڑی سود مند ثابت ہوئی کہ انسان کو زیادہ صحیح انداز سے پرکھنے کی اہلیت بڑھی ہر کسی کی اہلیت کو معلوم کرنا ظاہر آ بڑا سہل معلوم ہوتا ہے لیکن انسان اتنی پیچیدہ خصوصیات کا مالک ہوتا ہے کہ یہ کہنا کہ کون کیسا آدمی ہے اتنا آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے عام حالات میں کسی کی دیانت جرأت جذبۂ حب الوطنی ۔ ایثار اور دوسری عادات کا اندازہ لگانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے شخصیتیں اکثر دھوکا دیتی ہیں شخص شناسی مشکل ہنر ہے قید شاید میدان جنگ کے بعد دوسری جگہ ہے جہاں اس ہنر کے سیکھنے میں مدد مل سکتی ہے ان دونوں ماحولوں میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نکھر آتا ہے کئی بٹے کٹے جسمانی لحاظ سے تنومند گفتار میں پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرنے والے بکریاں بنے دکھائی دیتے ہیں کتنی لاغر اور عاجز سی شخصیتیں سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح ابھر آتی ہیں یونٹوں میں باوجود ایک دوسرے کو اس قدر قریب سے جاننے کے ہم ایک دوسرے کے متعلق محض قیاس آرائی سے زیادہ نہیں جان پاتے حقیقی مشکلات میں کون کیسا کردار ادا کرے گا یہ تو شاید حقیقی مشکلات پڑنے پر ہی دیکھا جا سکتا ہے فوجی مشقوں میں جنگ کا سا خطرہ اور ماحول پیدا کرنا بالکل ناممکن ہے اس لئے سچی آزمائش بھی ناممکن ۔ ہمارے عزم و جرأت

کے وعدے وعید اکثر مستقبل کے لئے ہوتے ہیں حال کے لئے نہیں نظر بندی کے دوران ہر ایک کو ہر ایک نے خوردبین کے ساتھ دیکھا اس کی عادات کو جانا اس کے خیالات سنے اس کے اندازِ فکر کو ٹٹولا اور پھر اپنے اندازِ فکر کی روشنی میں اس کے متعلق رائے قائم کی۔

ہم سب یہاں اپنی قوم کا ایک کراس سیکشن تھے چنانچہ ہماری اجتماعی خصوصیات قومی خصوصیات کی عکاسی کرتی ہیں اس لئے یہاں اپنی کمزوریوں اور اہلیتوں کو جاننے کا موقع میسر آیا اور سب سے بڑھ کر اپنے آپ کو جاننے کا موقع ملا خواہ دوسروں کے آگے ہم کتنے ہی کیوں نہ بنتے ہوں عام حالات میں یہ بناوٹ خود کو بھی دھوکہ میں رکھتی ہے لیکن اس آزمائش سے ہر ایک پر کم از کم اپنے بارے میں ہر طرح سے واقفیت ہو گئی ہونی چاہیئے۔

میں نے خاص طور دو چیزیں محسوس کیں ایک یہ کہ ہمارے نظم وضبط کی بنیاد اتنی استوار نہیں جتنی کہ ہونی چاہیے موجودہ بنیادوں میں اختیار اور سزا و انعام کی زیادہ آمیزش ہے ان کی جگہ بلند قدروں ذاتی مثال اور باہمی عزت کے عناصر کی زیادہ ضرورت ہے اوپر سے ٹھونسے ہوئے نظم وضبط کی جگہ احساس نظم وضبط کو لینی چاہیے تاکہ وہ نہ صرف امن کے زمانہ میں بلکہ جنگ اور برے حالات کے دوران قائم رہے یہ کہنا کہ نظر بندی کے دوران ہمارا ڈسپلن بڑے اعلیٰ معیار کا تھا غلط ہوگا اس میں بہتری کی کافی گنجائش تھی لیکن حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا کہ ڈسپلن کا معیار گرا ہوا تھا یہ بھی غلط ہوگا چند معمولی قسم کی تو تو میں میں کبھی کبھار افسروں یا جوانوں میں ہو جایا کرتی بعض کے مزاج میں ترشی اور تلخی پیدا ہو جایا کرتی عام حالات میں ایسی معمولی باتوں پر شاید جھگڑا کبھی نہ ہو پاتا جن پر آپس میں وہ جھگڑ پڑتے شاید یہاں کی ذہنی کوفت کا اثر تھا غسل خانے میں نہانے کی باری بالٹی میں پانی بھرنے کی پہل والی بال میں نمبر گننے پر تکرار کی وجہ سے جھڑپ ہو جایا کرتی مگر اکثر جلد ہی سنبھل بھی جایا کرتے

اور صلح صفائی سے معاملہ طے پا جایا کرتا۔ یہ قابل تعریف تھی کہ آپس کے اختلافات علیحدہ نقطۂ نظر اور اندازِ فکر رکھنے کے باوجود جہاں تک ہمارا اور بھارتی حکام کا معاملہ تھا اس میں سب کے سب متفق تھے ان کے سامنے کبھی آپس کے اختلافات کو ظاہر نہ ہونے دیا جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے ہوں سوائے ایک واقعہ کے جب ایک نے دوسرے کے خلاف کسی بات پر بھارتی حکام کو رپورٹ کی کبھی کوئی ایسی صورت پیش نہ آئی جبکہ اس معاملے میں یک جہتی نہ پائی جاتی ہو جیسے ایک گھر میں رہنے والے چند بھائی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ناراض ہونے کے باوجود ایکدوسرے کے خیر خواہ رہتے ہیں اور گھر کی بات گھر کے اندر ہی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ہمارا بھی ایسا ہی حال تھا البتہ اگر اندازِ فکر و عمل کے میدان میں بھی پوری طرح ہم خیالی ہوتی تو سونے پر سہاگہ ہوتا قید کے دن زیادہ ہم آہنگی لطف اور ترنگ میں گزرتے۔

جرأت مند بے دھڑک۔ بے خوف اور صاف گو انسان اکثر کڑے ڈسپلن کی بندشوں کے دائرے میں رہ نہیں پاتا گیا ڈسپلن اور جرأت مندی دو متضاد چیزیں ہیں میں کہوں گا نہیں جرأت اگر ڈسپلن کے دائرہ کے اندر ہی رہ کر دکھائی جائے تو کار آمد ثابت ہو سکتی ہے ورنہ وہ غنڈہ گردی۔ آوارگی اور لاپرواہی کہلائی جائے گی کیمپ میں چند کا خیال تھا کہ جو یہاں جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے تھے ان کے ڈسپلن میں خامی پائی جاتی ہے ایک اعتبار سے یہ خیال بالکل بے بنیاد نہ تھا اور شاید ہمارے ایک آدھ ساتھی کے لئے ٹھیک بھی تھا لیکن ان کے نزدیک ڈسپلن کا ایک غلط مفہوم تھا صاف گوئی اور کھری بات سننے والوں کو بری لگتی ہے اس لئے ضروری نہیں کہ ہر صاف گو ڈسپلن کی حدود سے باہر نکل آتا ہے۔ جرأت مند لوگ دوسروں کی نسبت ذرا جذباتی ہوتے ہیں اپنی جذبات کی رو میں بہہ کر وہ بعض اوقات اپنی زبان اور اعمال پر کنٹرول کھو بیٹھتے ہوں لیکن وہ فوراً اپنی غلطی کا احساس اور اس کا ازالہ کرنے کی بھی جرأت رکھتے

ہیں میرے نزدیک جرأت زیادہ اہم خصوصیات میں سے ہے کیونکہ کسی کو ڈسپلن آسانی سے سکھایا جا سکتا ہے مگر کسی میں جرأت پیدا کرنا ناممکن ویسے سچی دلیری شجاعت اور جرأت وہی ہے جو نظم وضبط کے دائرے کے اندر رہ کر دکھائی جائے بعض صورتوں میں ڈسپلن کا توڑنا قابل برداشت اور قابل معافی ہو سکتا ہے مگر بزدلی اور غیر جرأت مندانہ اقدام ناقابل معافی ہیں۔

حضرت خالد بن ولید عراق کے محاذ سے بغیر اجازت مکہ معظمہ حج کے لئے چلے گئے جس کا حضرت ابوبکر صدیق کو علم ہو گیا اگر خالد بن ولید کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اسے سپہ سالاری سے ہٹا دیا جاتا لیکن ان کی شجاعت و بہادری اور قابلیت کے پیش نظر ان کو محض تنبیہ کی گئی کہ پھر بغیر اجازت اپنی جگہ سے نہ جائیں ان کا بغیر اجازت کے چلا جانا شاید بجائے خود ایک جرأت مندانہ اقدام تھا اگرچہ قابل ستائش ہرگز نہ تھا کیونکہ ان کی جگہ اور کوئی ہوتا تو وہ شاید بیماری یا کام کے بہانے مکہ معظمہ جاتا۔

کچھ عرصہ نظر بند رہنے کے بعد قیدی اور خاص کر وہ جو مشکلات کو زندگی کا حصہ نہ سمجھتے ہوں ایک خاص انداز کی ذہنیت کے مالک بن جاتے ہیں یہ کہہ نہیں سکتا کہ یہ انداز عارضی طور کا ہوتا ہے یا مستقل کیونکہ اس کا اندازہ تو واپس پاکستان پہنچ کر ہی ہو سکتا ہے قیدی اپنے دل کی تسلی اور سکون کے لئے حقیقت سے گریز کرتا ہے اور خوش فہمی میں مبتلا رہنے کی کوشش کرتا ہے ان خوش فہمیوں سے وہ محض اپنے دل کو جھوٹی تسلیاں نہیں دیتا بلکہ اس کا دماغ امید و یاس کی دنیا میں کھویا رہنا چاہتا ہے ایک مبہم سی کرن اسے سورج نظر آتی ہے اور صبح کاذب، صبح صادق مثال کے طور پر جب کھلنا سے گاڑی چلی تو کہنے لگے کہ اب واہگہ ہی جا کر کھڑی ہو گی پھر ان کا اندازہ مارچ ۷۲ء میں واپس چلے جانے کا تھا ابھی اندرا بھٹو ملاقات کی پہلی بار افواہ ہی اڑی تو زیادہ تر جون میں واپسی کی سوچنے لگے اس کے بعد ہر مہینہ پیچھے ڈالتے رہے کوئی یہ باور کرنے کو

تیار نہیں تھا کہ یہاں کی نظر بندی لمبی ہے چند سال بھی رکھ سکتے ہیں۔ قنوطیت بھی کوئی اچھی بات نہیں لیکن انسان حقیقت سے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو تسکین دینے کی بجائے دل پر زیادہ بوجھ ڈالتا ہے۔

حقیقت شناسی سے کوفت کم ہوتی ہے اور انسان ذہنی طور پر مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتا ہے چھوٹی موٹی خبروں سے قیدی کیا اخذ کرتا ہے سنیئے

بھارت میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط کا خطرہ۔ بس اب بھارتی حکومت ہمیں زیادہ دیر نہ رکھ سکے گی۔ امریکہ نے بھارت کی مالی امداد کا پروگرام ملتوی کر دیا کیونکہ اس نے کہا ہے کہ پہلے پاکستانی قیدی واپس بھیجو تو پھر امداد دوں گا ورنہ نہیں بنگلہ دیش میں مولانا بھاشانی نے سول نافرمانی کا اعلان کر دیا اب شیخ مجیب کو سمجھ آجائے گی اب وہ فوراً پاکستان سے سمجھوتہ کرے گا۔ بنگلہ دیش میں مولانا بھاشانی کے دو درجن کارکنوں کو ہلاک کر دیا گیا بس اب بنگلہ دیش جاتا ہے ٹوٹنے والا ہے۔ اترپردیش میں پولیس نے بغاوت کر دی آندھرا پردیش میں بلوے۔ بس ہندوستان کے برے دن آگئے اندرا کی حکومت چند دن کی مہمان ہے جنگی قیدیوں پر ہر ماہ بھارت کا ایک کروڑ روپیہ خرچ ہوتا ہے جگجیون رام کا لوک سبھا میں اعلان سالا بنیا ہے دھیلہ جیب سے خرچ کرنے کا قائل نہیں یہ بیان اس لئے دیا ہے کہ اپنے عوام کو تیار کیا جائے کہ قیدی رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں بڑے مہنگے پڑ رہے ہیں اگلے ماہ واپسی ہو جائے گی۔

قیدی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بلوے ہمیشہ ہوتے چلے آئے ہیں قحط بھی پڑتے رہے ہیں لیکن ان وجوہات سے بھارتی حکومت کبھی نہیں ٹوٹی۔ نہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے ہیں بھارت وہاں کا وہاں ہی ہے تب یہ خبریں پڑھ کر اس نے کبھی ایسا نتیجہ اخذ نہ کیا تھا قیدی یہ نہ جانتا تھا کہ ہندوستان کا دفاعی بجٹ دو ہزار کروڑ روپیہ سالانہ ہے اور دفاع قومی پالیسی کی ایک کڑی ہوا

کرتی ہے اگر بھارت کو اپنی قومی پالیسی کے حصول کی خاطر قیدیوں پر بارہ کروڑ سالانہ کی رقم خرچ کرنا بھی پڑے تو یہ کوئی بوجھ نہیں ان معمولی اخراجات واقعات اور حادثات سے ملک اپنی قومی پالیسیاں تبدیل نہیں کیا کرتے چند ساتھیوں کا خیال تھا کہ میں شاید قنوطی ہوں وہ شاید درست ہوں میں یقیناً خوش فہمی کو نقصان دہ سمجھتا ہوں جسے وہ قنوطیت کہتے تھے وہ میرے نزدیک حقیقت شناسی تھی شروع شروع میں جب بحث ہوتی تو ساتھی مجھ سے پوچھتے کہ بھارت جنگی قیدیوں کو رکھ کر کیا کریگا۔ سوائے اسکے کہ خواہ مخواہ کا خرچ کرتا رہے میں انہیں بے سود سمجھانے کی کوشش کرتا کہ آجکل کے زمانے میں کوئی خواہ مخواہ خرچ نہیں کرتا بھارتی حکومت اس وقت تک قیدیوں کو رکھے گی جب تک ان کے رکھنے سے وہ کوئی فائدہ حاصل کرتی ہو یہ اتنی سیدھی بات نہیں جتنی کہ نظر آتی ہے ہم محض جنگی قیدی نہیں سیاسی قیدی بھی ہیں اور سیاست کا دائرہ بڑا وسیع ہوتا ہے پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ جب تک جنگی قیدیوں کا معاملہ طے نہیں پاتا۔ ظاہر ہے کہ بنگلہ دیش اور پاکستان کے تعلقات معمول پر نہیں آسکتے بھارت کی ہمیشہ یہ کوشش ہوگی کہ بنگلہ دیش اور پاکستان ایک دوسرے کے قریب نہ ہوں اور قیدی اس کام کے لئے بہترین حربہ ہیں ورنہ اس مسئلہ کے حل ہونے کے بعد ان کے آپس کے تعلقات بہتر ہونے کی راہیں کھل سکتی ہیں بنگلہ دیش اور پاکستان کی اقتصادیات ایک دوسرے کیساتھ منسلک ہیں دونوں ایک دوسرے کی پیداوار اور صنعت پر انحصار رکھتے ہیں چنانچہ بھارت کے لئے ان دونوں کی دشمنی اس وقت تک رکھنی ضروری امر ہے جب تک وہ دونوں اپنی تجارت کا رُخ بدل کر دوسری طرف نہ کریں تاکہ بھارت اپنے ملک کا کپڑا اور دوسری صنعتی چیزیں بنگلہ دیش کو برآمد کر کرسکے اور وہاں کی پٹ سن سستے داموں درآمد کرسکے۔ اس عمل کے ساتھ ساتھ اپنا اقتصادی اور سیاسی شکنجہ بھی بنگلہ دیش پر مضبوط کرے دوسرا فائدہ پاکستان

کی اتنی بڑی تجربہ کار فوج کے عملے کو ناکارہ بنانے میں ہے اگرچہ قیدی سب ہزیمت خوردہ لوگ ہیں پھر بھی اس درجہ کی مہارت اور تربیت یافتہ اندازاً تین ڈویژن فوج کو نئی بھرتی سے روئے عمل میں لانے کے لئے کم از کم پندرہ سال چاہئیں۔ سولہ سترہ سو تو افسر تھے جن میں ۲۸۰ کے قریب ڈاکٹر تھے ایک افسر کی ٹریننگ پر بے شمار خرچ ہوتا ہے ایک اچھا ڈاکٹر دس سال کی تربیت اور تجربہ کے بعد بنتا ہے چند سال کی نظر بندی کے بعد وہ قیدی جو بغیر جسمانی اور ذہنی مشق کے کیمپوں میں پڑے رہیں کافی حد تک ناکارہ بن جائیں گے اس لئے کہ قیدی نہ صرف عام شہری ہیں بلکہ تربیت یافتہ فوج کا تجربہ کار حصہ ہیں یہ کہنا درست ہے کہ پاکستان کے پاس فوجی بھرتی کے لئے اور بڑی تعداد موجود ہے لیکن نئے ریکروٹ اور کیڈٹ کو تربیت دے کر تجربہ کار بنانے میں بھاری رقم اور لمبا عرصہ خرچ ہوتا ہے اس لئے جہاں تک بھارت سے ممکن ہو سکے گا وہ قیدیوں کو روکے رکھنے کی کوشش کرے گا کسی خاطر خواہ بین الاقوامی دباؤ کے بغیر۔ اور جب وہ سمجھے گا کہ ان قیدیوں کا مزید نظر بند رکھنا بے سود ہے اور یا وہ ان کے عوض اپنی مرضی کی مراعات وصول کرے گا یا سودے بازی کے بعد تھک ہار کر مایوس ہو جائے گا تو بھیجنے پر مجبور ہو جائے گا ورنہ انسانی ہمدردیاں قومی مسائل میں حائل نہیں ہوا کرتیں اگر ایسا ہوتا تو فلسطین کے لاکھوں پناہ گزین پچھلے پچیس برس سے کیمپوں میں دھکے نہ کھاتے پھرتے نہ ہی جرمنی میں یہودیوں کی نسل کشی کی جاتی اور نہ ہی شیخ مجیب۔ بہاریوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دینے کے درپے ہوتے۔

کیمپ میں اگرچہ مختلف یونٹوں۔ مختلف جگہوں اور مختلف آرمز اور سروس کے افسر تھے لیکن بلا امتیاز یونٹ نئے سرے سے آپس کے میل جول نے جو صورت اختیار کی وہ بھی ایک دلچسپ مضمون ہے تین تین یا چار چار یا اس سے زیادہ افسر مل کر بیٹھتے گپیں مارتے اور کھیلتے۔ اس جوڑ کی بنیاد آپس کی ہم خیالی اور اندازِ فکر کی ہم آہنگی۔ یعنی

؎ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز - کبوتر با کبوتر باز بہ باز

کا مقولہ درست اترتا تھا کسی شخص کی خصوصیات کا اندازہ اس کے دوستوں اور ملنے والوں سے لگایا جا سکتا ہے ایک سمگلر ایک سمگلر ہی سے رابطہ قائم کرتا ہے ادبی ذوق رکھنے والے اکٹھے بیٹھیں گے جن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ زندگی کو پرسکون طریق سے گزار دیا جائے وہ ایک دوسرے کو پسند کریں گے جن کو ہر کسی کی پیٹھ پر چغل خوریوں کا مزہ آتا ہو وہ بیٹھکر دوسرے کو گالیاں دے کر مسرت حاصل کرتے ہیں ہر قوم میں ہر طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں ان میں سے ہم خیال لوگ ایک دوسرے کو بہت جلدی پہچان لیتے ہیں ایک برے آدمی کی ایک اچھے آدمی کے ساتھ کبھی دوستی نہ ہو سکے گی۔

کیا ہمیں اہل وعیال یاد آتے تھے اس بارے میں ہر کسی کا مختلف جواب ہوگا۔ بیوی بچوں کا۔ ماں باپ بھائی بہنوں اقربا اور دوستوں کا یاد آنا کچھ حد تک قدرتی عمل ہے مگر ان کی جدائی کی شدت کا احساس اپنے اپنے دماغی رجحان پر منحصر ہے بعض تھے جو اکثر اپنی بیوی بچوں کے قصے سناتے رہتے ظاہر ہے کہ وہ اس جدائی کو شدت سے محسوس کرتے شاید یہ میری عمر کا تقاضا تھا کہ سوائے شروع شروع کے جب مجھے خیال آتا کہ ہمارے بارے میں گھر والوں کو لاعلمی کی وجہ سے کتنی گھبراہٹ ہوگی پھر کوئی خیال نہ آیا جب معلوم ہوا کہ حکومت نے ان کی دیکھ بھال کی پوری ذمہ داری سنبھالی ہوئی ہے تو اس طرف سے بھی جو معمولی تشویش تھی وہ جاتی رہی اس کے علاوہ اس بات کا مجھے اعتماد تھا کہ میری بیوی میری غیر موجودگی میں اپنی اور بچوں کی دیکھ بھال خاطر خواہ طریق سے کرنے کی اہلیت رکھتی ہے اس لئے کسی قسم کا فکر لاحق نہ ہوا یہ بھی میرے لئے بڑے حوصلے کی بات تھی کہ بیوی بچوں اور دوسرے عزیزوں نے میری غیر حاضری اور نظر بندی کو ایک حقیقی رنگ میں لیا۔ کہ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے غیر ضروری فکر سے مسئلے حل نہیں ہوا کرتے نہ ہی زیادہ فکر سے میری واپسی جلدی ہو سکتی تھی۔ ان کے خطوط

سے مجھے تسلی تھی کہ جس طرح میں ان کے بارے میں بے فکر ہوں وہ بھی میرے بارے میں بے فکر تھے، معاملہ خدا کے سپرد کر کے اپنی اپنی جگہ خوش تھے کہ یہ اللہ کی رضا تھی میں روزمرہ کی پڑھائی لکھائی میں اتنا مشغول رہتا ہے کہ کبھی ان کی یاد ہی نہ آتی۔ البتہ نماز کے بعد تمام عزیز و اقارب کے لئے ضرور دعا کیا کرتا کہ وہ نیک بنیں اسلام اور قوم و ملک کی خدمت کریں ان کی عزت ہو اور وہ خوش رہیں جرأت مند ہوں وغیرہ وغیرہ۔

ماں کی دعاؤں پر کس کو بھروسہ نہیں ہوتا مجھے نہ صرف امید تھی بلکہ یقین تھا کہ میری والدہ کی دعائیں کبھی رائیگاں نہیں جا سکتیں کیونکہ انکساری۔ حلیم طبع پانچ وقت کی باقاعدہ نمازوں فریضہ حج کی ادائیگی اور نیکیوں سے بھرپور زندگی کے صلے میں خدا ان کی دعاؤں کو نامنظور کرنیوالا نہ تھا گھر میں ایسے نیک بزرگوں کی موجودگی جن کی دعائیں ساتھ ہوں بڑے سکون اور تسکین کا باعث ہوا کرتی ہے اس کے علاوہ انسان کی خود اپنی ماضی کی زندگی کردار اور عمل مشکل وقت میں دماغی اور دلی حالات پر اثر انداز ہوتی ہے اگر اعمال اچھے ہوں تو یہ حوصلہ بھی پہنچاتے ہیں اور قناعت و صبر بھی ایسی صورت میں ہر مشکل اللہ کیطرف سے امتحان معلوم ہوتی ہے لیکن اگر انسان برے اعمال کا مرتکب ہوتا رہا ہو تو پھر مشکل اللہ کا عذاب اور سزا بن کر پیش آتی ہے چنانچہ ایک بے گناہ سزا یافتہ وہ اذیت محسوس محسوس نہیں کرتا جو ایک گناہ گار کرتا ہے۔ باوجودیکہ دونوں کی قید کا ماحول ایک جیسا کیوں نہ ہو انسان غلطیوں کا پتلا ہے زندگی میں میں نے بھی غلطیاں کی ہوں گی۔ مگر دل کو یہ بڑی تسلی تھی کہ ارادی طور پر ہوس طمع۔ لالچ اور خود غرضی کی خاطر ایسا کوئی فعل نہیں کیا جو مجھے یاد ہو اور جس کی وجہ سے شرمساری یا پچھتاوا ہو۔ مشرقی پاکستان کے ابتر حالات کے دوران بھی جہاں انسانی کمزوریوں کے تنور کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے لامتناہی مواقع موجود تھے جن پر شاید کسی گرفت کا امکان بھی نہ تھا سرکاری حیثیت سے بھی کافی اختیار تھا نہ صرف کوئی لغزش نہ ہوئی بلکہ حتی الامکان تمام تر دلی اور دماغی قوتوں کو انسانی اصولوں

اور مذہبی روایات کی روشنی میں بروئے کار لانے کی کوشش کرتا رہا انہی وجوہات کی بنا، پر پوری نظر بندی کے دوران حوصلہ بلند رہا اور کسی قسم کے فکر و فاقہ سے ذک نہ پہنچی مکمل تسکین تھی اگر کبھی ذرا طبیعت بوجھل ہوتی تو اس وجہ سے کہ ہم سب ملکر کیوں فرار کی کوشش نہیں کر پاتے۔

نماز باقاعدگی اور کبھی بے قاعدگی سے پڑھا کرتا تھا نماز کے بعد میں نے کبھی یہ دعا نہ مانگی کہ ہم جلدی واپس چلے جائیں ویسے نماز باجماعت کے بعد امام اکثر یہ دعا مانگا کرتے قبولیٔ دعا کے لئے یہ ضروری ہے کہ خلوص اور یقین کے عنصر دعا کرنے والے میں موجود ہوں بجائے اس کے کہ دعا ایک خاص حقیقت کے وقوع کے لئے مانگی جائے یہ بہتر ہے کہ وسیع دائرہ کے اندر بہتری کی خواستگاری کی جائے مثال کے طور جنہوں نے نظر بندی کے آغاز سے یہ دعا مانگنی شروع کی تھی کہ اے اللہ ہمیں جلد از جلد پاکستان بھجوا دے وہ ڈیڑھ سال کے عرصہ میں یہ دعا کرتے کرتے تھک گئے ہونگے اور دعا کی قبولیت سے ان کے یقین کچھ حد تک متزلزل ہوئے ہوں گے اور اپنی دعا کے اثر میں ان کو خود بے یقینی محسوس ہونی شروع ہو گئی ہو گی اس کے برعکس اگر یہ دعا مانگی گئی ہو کہ اللہ تعالےٰ تو ہمارے حق میں جو بھی کر بہتر کر جس سے ہمارے ملک و قوم کو فائدہ پہنچے تو ہی مصلحتوں کا جاننے والا ہے تو پھر اس وسیع دائرہ دعا کے اندر دل کو ہر وقت تسلی رہتی واپسی کی صورت نہ نکلنے سے یہی اخذ ہو سکتا تھا کہ ہمارے یہاں رہنے ہی میں اللہ کے نزدیک کوئی مصلحت ہے دعا مانگنے کے اس انداز میں سکون اور تسکین کسی دم نہیں کھوتا۔

## ۱۹

دسمبر میں ڈاکٹر کامل قریشی صاحب ہمارے کیمپ میں آئے جو دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے وہ شاعر بھی ہیں چنانچہ انہوں نے ہمیں اپنے دیوان ماہ کامل کی تین کاپیاں تحفتہً پیش

کیں۔ اشعار سنانے سے پہلے انہوں نے مختصر تقریر بھی کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ ہر طرح کی رواداری بجا رکھی جا رہی ہے یہ غلط پروپیگنڈہ ہے کہ ان کے ساتھ بدسلوکی اور زیادتی ہو رہی ہے پاکستان بننے سے پہلے ہندو مسلمانوں میں بڑی محبت تھی اتفاق تھا دونوں ایک دوسرے کے تہواروں پر ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے تھے مسلمان ہولی میں حصہ لیتے تھے اور ہندو عید کے دن مسلمانوں کو ودھائی دیا کرتے تھے وغیرہ وغیرہ البتہ پاکستان بننے سے رنجشیں پیدا ہو گئیں۔ کچھ غلط فہمیاں عود کر آئیں ہمارے دونوں ملکوں کو مذہبی رواداری کی روایات کو قائم کرنا چاہیے۔

مجھے یقین تھا کہ کامل صاحب دل کی آواز زبان پر نہیں لا رہے شاید حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو کچھ بتایا گیا ہے دہرا رہے ہیں میں نے ان سے سوال کیا جب مسلمانوں کے ہاتھوں حکومت کی باگ ڈور رہی تو مذہبی رواداری کو بڑی خوش اسلوبی سے قائم رکھا گیا۔ لیکن جہاں کہیں بھی مسلمان دوسروں کے تحت رعایا بن کر رہے تو ان کیساتھ رواداری کا سلوک نہ کیا گیا خواہ وہ سپین تھا کہ موجودہ بھارت۔ اسرائیل یا فلپائن ایسا کیوں ہوا اور کیوں ہے انہوں نے کچھ ناکام سی کوشش کی کہ کچھ دلیل پیش کریں میں نے اپنا سوال ایک وسیع شکل میں کیا تھا کرنل جعفری نے زیادہ سیدھے طرز سے سوال کیا کہ ہم نے اخبار میں خبر پڑھی ہے کہ یوپی کے ایک قصبے رائے پور کی جامع مسجد میں گنیش کا بت امام مسجد کی اجازت سے رکھ دیا گیا ہے اور لکھنے والے نے لکھا تھا کہ یہ مذہبی رواداری کی نادر مثال ہے اور ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کو اس سے سبق سیکھنا چاہیے کیا ان کی نظر میں بھی اس طرح کی مذہبی رواداری ہے انہوں نے کیا جواب دینا تھا وہ تو خود اس انوکھی رواداری کے شکار تھے لیکن کھلے بندوں تو یہ نہ کہہ سکتے تھے خاص کر ان کے ساتھ سیکورٹی برانچ کا ایک آدمی بھی تھا کم از کم ان کو اس بات سے احساس ہوا ہو گا کہ پاکستان کے عوام کو ان کے دکھ درد کا کتنا خیال ہے وہ ان کے حالات سے بے فکر نہیں۔

السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا کے ایک شمارہ میں سردار خشونت سنگھ نے سیکولر ڈیموکریسی کے عنوان کے تحت ایک مضمون شایع کیا جس میں بھارت کے مسلمانوں کی حالت زار پر روشنی ڈالی خشونت سنگھ اس ویکلی کے چیف ایڈیٹر ہیں وہ ایک غیر متعصب انسان معلوم ہوتے ہیں جس جرأت مندی سے انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کا ذکر کیا ہے اس کی ہر انصاف پسند شخص کو کرنی پڑے گی وہ پاکستان بھی گئے اور بھارت واپس آکر انہوں نے صدر بھٹو اور پاکستانی نقطہ نظر کی کھل کر وضاحت کی یہ پہلی مرتبہ انہوں نے اپنے میگزین میں لکھ کر اپنے ملک کے لوگوں کو بتایا کہ جہاں مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کے ردعمل کو اتنا بڑھا چڑھا کر بتایا جا رہا ہے وہاں یہاں کے لوگ بنگالیوں کے ہاتھوں بہاریوں پر کئے گئے مظالم کی داستانوں سے ناواقف ہیں ذکر بھارت میں مسلمانوں کا ہو رہا تھا اس مضمون میں سردار صاحب نے بتایا کہ بھارت میں ہر مسلمان کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور انہیں پاکستانی ایجنٹ سمجھا جاتا ہے ۱۹۷۱ء کے چند اعداد و شمار کے مطابق بھارت کی کل آبادی ۵۵ کروڑ تھی جس میں سے چھ کروڑ مسلمان تھے یعنی کل آبادی کا ۱۱.۲ فیصد حکومت کے بعض محکموں میں مسلمانوں کی تعداد مندرجہ ذیل ہے:۔

سنٹرل سیکرٹریٹ سروس

| | کل تعداد | مسلمان |
|---|---|---|
| سلیکشن گریڈ | ۱۴۰۰ | ۲ |
| گریڈ I | ۳۹۵ | ۵ |
| سلیکشن افسر | ۱۶۶۶ | ۱۲ |
| اسسٹنٹ | ۴۵۰۷ | ۱۹ |
| سٹینو گرافر سلیکشن گریڈ | ۱۳۰ | . |

| | کل تعداد | مسلمان |
|---|---|---|
| سٹینو گرافر سلیکشن گریڈ I | ۱۹۵ | - |
| 〃 〃 II | ۱۹۵۴ | - |
| 〃 〃 III | ۱۳۲۶ | - |
| اپر ڈویژن کلرک | ۲۵۱۱ | ۹ |
| لوئر ڈویژن کلرک | ۶۵۸۵ | ۳۰ |
| انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس | ۲۱۱۰۰ | ۱۱۱ |
| محکمہ خارجہ | ۲۷۰ | ۱۲ |
| پولیس افسر | ۱۲۰۰ | ۴۳ |

نوٹ :۔ تین سالوں میں آل انڈیا سروس کے لئے صرف ایک مسلمان منتخب ہوا۔

انہوں نے مزید لکھا تھا کہ ہر سال سینکڑوں ہندو مسلم فسادات بھارت میں ہوتے ہیں پولیس اور حکومت کے افسر بلوائیوں کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیتے ایک سال میں تین ہزار کے قریب فسادات ہوئے جن میں ظاہر ہے کہ مالی اور جانی نقصان مسلمانوں کا ہوا۔

ایک مسٹر شاد صاحب جو اردو ترقی بورڈ کے ممبر تھے لیکچر دینے کے لئے آئے کہ بھارت میں اردو کے لئے بہت کچھ کیا جا رہا ہے ان سے پوچھا گیا کہ یوپی جو اردو کا گھر ہے اس ریاست کی سرکاری زبان بھی اردو نہیں پھر اردو کا کون رکھوالا ہوگا اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھا جاتا ہے اور جیسے کہ مسلمانوں سے دشمنی ہے بعینہٖ اردو کے ساتھ بھی ویسا ہی تعصبانہ رویہ اختیار کیا گیا کرنل ستار نے اعداد و شمار سے اردو کی حالت زار اور مسلمانوں کی مشکلات پر اس مدلل طور پر روشنی ڈالی کہ شاد صاحب انگشت بدنداں رہ گئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مسلمانی حیثیت کو ختم کرنے کا جو بل پاس ہوا وہ بھی کھلی ناانصافی ہے غرض بھارت میں سیکولرزم کا یہ حال ہے۔

مسلمانوں کے اعداد و شمار اور حالت کا پڑھ کر بے حد رنج ہوتا کہ ان لوگوں نے

یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بھارت کے رحم وکرم پر رہ جائیں گے پاکستان کی جدوجہد میں مثالی کردار ادا کیا اس سے بڑھ کر ایثار کا مظاہرہ کوئی کیا کرے گا کہ ہماری خاطر انہوں نے اپنا مستقبل۔ اپنی آزادی اور اپنی زندگی اجیرن کر ڈالی ان تنہائی کے ایام میں میں سوچتا کہ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں چند سو یا چند ہزار انسانوں کے مستقبل کا سوال نہیں بلکہ سات کروڑ مسلمانوں کی بقا کا معاملہ ہے یہ کسی صورت میں طے شدہ مسئلہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا اس مسئلے کا منصفانہ حل ڈھونڈنے کی ضرورت ہے ورنہ اللہ کا نام لینے والوں کی اتنی بڑی تعداد گھٹ اور پس کر مر جائے گی اگر مرے گی نہیں تو مُردوں سے بدتر زندگی گزارتی رہے گی یہ بھی کوئی زندہ رہنے کا طریقہ ہے کہ اپنے ہی ملک کی بیشتر آبادی انہیں بیگانہ تصور کرے اپنے ہی ملک کی حکومت نہ ان پر بھروسہ کرے اور نہ ہی ان کو ان کا حق دینے کے لیئے تیار ہو۔ ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا کوئی ذمہ دار نہ ہو سننے میں آیا ہے کہ کئی مسلمان لڑکیاں ہندوؤں کے ساتھ شادیاں کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں دوسرے اچھے گھرانے کی لڑکیوں کو خاطر خواہ رشتے کے لیئے پاکستان میں شادی کرنی پڑتی ہے ان مظلوموں کو ان کا حق کون دلائے گا تاکہ وہ بھی ایک آزاد فضا میں عزت کے ساتھ رہ سکیں اس کام کی ذمہ داری تمام اسلامی ممالک پر بالعموم اور پاکستان پر بالخصوص عائد ہوتی ہے اس کا صرف ایک منصفانہ اور قابلِ عمل حل ہے اور وہ یہ ہے کہ ان تمام سات کروڑ مسلمانوں کو پورے بھارت سے منتقل کر کے موجودہ بھارت کے شمال مغربی صوبوں یعنی مغربی پنجاب ہماچل پردیش۔ اتر پردیش۔ ہریانہ میں آباد کیا جائے جہاں کی غیر مسلم آبادی کو ان علاقوں سے دوسری جگہ لے جایا جائے پھر اس حصہ کا پاکستان سے الحاق ہو جائے اتنی بڑی آبادی کے تبادلہ کا مسئلہ تو اگرچہ بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن اس پر عمل کرتے وقت دیر نہیں لگے گی ایسے الحاق کے بعد ہی پاکستان کا اصلی نظریہ پایۂ تکمیل تک پہنچ سکے گا ایسے منصوبے کے حصول کے لیئے ضروری ہے کہ پاکستان فوجی اور اقتصادی لحاظ سے

اسقدر مضبوط ریاست بنے کہ اس منصوبے پر عملدر آمد کروا سکے۔ آئندہ پچاس سال کیلئے اس منصوبے کا حصول ہماری قومی منزل ہونا چاہیے اس منزل پر پہنچنے کے لئے قوم کے ہر فرد کو ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہونا چاہیے۔ محنت۔ ایمانداری اور حب الوطنی سے ہی ہم آئندہ نسلوں کا مستقبل درخشندہ کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

۱۹۷۲ء کے آخر میں کیمپ نمبر ۵۹ سے جو گوالیار میں ہی تھا۔ نائیک تاج محمد فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا روزوں کے دن تھے وہ سحری کے وقت اٹھا اور غسلخانے کے عقب میں باڑوں کے نیچے سے رینگتا ہوا باہر نکل گیا اس کی جرأت اور ہمت قابلِ داد ہے لیکن عقل نہیں اس کی بیوقوفی کہہ لیجئے یا بدقسمتی کہ وہ گوالیار شہر میں چلا گیا اور ایک مولوی صاحب کے پاس اس نے پناہ لی۔ صبح کی رول کال کے بعد جب کیمپ اتھارٹی کو پتہ چلا تو انہوں نے تلاش شروع کی اور مسلمانوں کی بستی تو پہلی جگہ تھی جہاں انہوں نے ڈھونڈا تین چار گھنٹوں کی تلاش کے بعد بے چارہ پکڑا گیا اسے بری طرح مارا پیٹا گیا بے چارے امام مسجد کو بھی پیٹا گیا اور پکڑ کر لے گئے۔

روزوں کے اختتام پر ہم نے عید منائی ہم سب نے ملکر صحن میں عید کی نماز پڑھی شام کو برآمدے میں کمبل بچھا کر سب نے ملکر کھانا کھایا اور عید کا دن گزر گیا۔

ان ہی دنوں ہمیں خاکی رنگ کی رضائیاں ملیں کمبلوں کے عوض وہ خاصی کھلی کھلی نگندی ہوئی تھی اس خیال سے کہ روئی اکٹھی نہ ہو جائے میں نے رضائی کے ملتے ہی ان سے مزید نگند لیا باقی کو ذرا دیر سے خیال آیا چنانچہ ہر روز دو تین رضائیاں مل کر کھولا کرتے اس کی روئی ہاتھوں سے دھنتے اور پھر غلاف میں ڈال کر انہیں اچھی طرح نگند دیا جائے۔

زیادہ تر افسر خود اپنے کپڑے دھوتے بعض کے اردلی دھویا کرتے چپلی ٹوٹ گئی تو اس کو موٹی سوئی سے خود مرمت کر لیا میں خود تو سرکاری دی گئی وردی کو اسی طرح پہن لیتا لیکن بعض افسر پتلونوں کو ادھیڑ کر بالکل نئے سرے سے اپنے سائز کے مطابق اس کارکردگی

سے فٹ کرتے کہ یوں معلوم ہوتا جیسے رینکن یا اسماعیل ٹیلر نے سی ہوں۔ میجر صلاح الدین۔ کیپٹن ظفر قریشی۔ لیفٹننٹ اسد اس کام میں خاص مہارت رکھتے تھے اسی طرح بعض کسے لئے چادر کو کاٹ کر اس میں سے دو عدد پاجامے تیار کرنا بائیں ہاتھ کا کام تھا افسر خود اپنی تھالیاں بھی صاف کرتے دکھائی دیتے غرض اپنا کام آپ کرنے میں جو جھجک سی محسوس ہوا کرتی تھیں وہ جاتی رہی نہ جانے کیوں ہمیں روزمرہ زندگی میں ایسے کام کرنے میں عار محسوس ہوتی ہے افسر ریلوے سٹیشن پر اپنچی کیس تک اپنے ہاتھ میں اٹھا کر لے جانے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے بازار میں اپنے بچوں کو خود گود میں اٹھانے میں کیا برائی ہے میں کہہ نہیں سکتا مگر برا سمجھا جاتا ہے اس لئے برا لگتا ہے ٹانگے میں سفر کرتے ہمیں شرم آتی ہے یا یوں کہیے کہ ٹانگے میں سفر کرنیوالے افسر کو لوگ گھور گھور کر دیکھتے ہیں اس لئے وہ ٹانگے میں بیٹھنا برا سمجھتا ہے اور اب حال یہ ہے جو پہلے شاید نہیں تھا کہ سائیکل پر جانا غیر موزوں سا دکھائی دینے لگا ہے یوں کرنے سے خود ہم نے اپنے لئے اپنی زندگی وبال جان بنالی ہے میرے رائے میں ان سب باتوں میں کسی طرح کی ناموزونیت نہیں صرف دماغ کی کج فہمی ہے۔

ہماری سوسائٹی نے یہ عزت کے مصنوعی نشانات مغرب سے مستعار لئے ہیں۔ یہ عزت وناموس کی غلط قدریں ہیں صحیح قدروں کا رائج کرنا ہم سب کا فرض ہے غیرت اور عزت ظاہری کرو فر میں نہیں بلکہ کردار کی بلندی میں مضمر ہے حضرت ابوبکرؓ خلیفہ وقت ہونے کے باوجود ایک اندھی عورت کے گھر کے برتن مانجھا کرتے اور کمرے کی صفائی کیا کرتے تھے۔ محلے کی غریب عورتوں کی بکریاں دوہا کرتے تھے ہماری ان موجودہ قدروں کی رو سے تو ایسا کرنے سے عزت وناموس کے پرخچے اڑ جائیں لباس اور رہن سہن کے طریقوں میں وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آسکتی ہیں۔ لیکن انسانی قدروں اور اصولوں کو زمانے کے اعتبار سے بدلا نہیں جاسکتا یہ دائمی طور پر ایک رہی ہیں اور رہیں گی۔ انصاف۔ سچائی حق گوئی ہر وقت اچھی کہلائے جاتے گی اور غیبت۔ چوری حسد ہمیشہ برا سمجھا جائیگا۔ اپنا کام خود

کرنے میں عجز وانکساری ہے جو بیسوی صدی میں بھی اتنی ہی قابل تعریف خصوصیت ہے جتنی کہ پندرہ صدیاں پہلے تھی۔ ظاہری نام ونمود میں تکبّر اور غرور کی جھلک ملتی ہے جو ہر وقت میں برا کہلایا گیا ہے۔

قریباً پچاس فیصد افسروں نے کتابوں کا دلچسپی اور شوق سے مطالعہ کیا زیادہ تر کو اس قید میں کتابیں پڑھنے کی اہمیت سے واقفیت ہوئی ایک اچھی کتاب ایک اچھا دوست ہے کی کہاوت سنتے آئے تھے مگر اس کہاوت کی سچائی کا احساس قید میں کتابیں پڑھنے کے بعد ہی ہوا تاریخ خواہ وہ جنگوں کی ہو یا سیاسی کشمکش کی عظیم شخصیتوں کی یا قوموں کی یہ زندگی کے لئے قیمتی اسباق کی آئینہ دار ہوتی ہے اگرچہ ماضی کے حالات اور واقعات بعینہٖ دوبارہ وقوع پذیر نہیں ہوتے لیکن ان کی وجوہات انداز اور نتائج میں بے حد یگانگت ہوتی ہے مختلف قوموں کے عروج وزوال کے اسباب ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں۔ تاریخ کا کھلے دماغ سے مطالعہ ہمیں سیدھے راستے پر چلنے میں مدد دے سکتا ہے اور غلطیوں کی سرزدگی سے بچا سکتا ہے ہماری فوجی لائبریریوں اور کتب خانوں میں بیش قیمت خزانے دفن ہیں دفن اس لئے کہ ان سے قلیل تعداد مستفیض ہے یہ ہماری قومی کمزوری ہے ہماری اسلامی تاریخ بے شمار ایسے واقعات سے بھرپور ہے جن میں مسلمانوں نے اپنے عزم صبر استقلال شجاعت۔ جذبہ ایمان اور کردار کی بدولت اپنے سے چھ سات گنا زیادہ دشمن کو شکستیں دیں۔ ہمارے لئے یہ کہنا کہ مشرقی پاکستان میں دشمن کی تعداد ہم سے تین گنا تھی اس لئے ہمیں پندرہ دن کی لڑائی کے اندر ہتھیار ڈالنے پڑے بالکل بجا نہیں جاپانیوں نے ۱۹۴۱ء میں جب ملایا پر حملہ کیا تو ان کی صرف تین ڈویژن فوج نے اتحادیوں کی ۴½ ڈویژن فوج کو چھتر دن کی قلیل مدت میں ۶۵۰ میل دھکیل کر شکست فاش دی اور پورے ملایا اور سنگاپور پر قبضہ کر لیا، رومیل نے افریقہ کے تپتے صحراؤں میں دشمن کے مقابلہ میں ½ فوج سے تبروک کے مقام پر انگریزوں کو شکست دے کر مصر کے دروازہ کو کھٹکھٹانا شروع کر دیا جبکہ اس کے پاس صرف بارہ

ٹینک رہ گئے تھے اور دشمن کے پاس ۱۰۶ ٹینک تھے۔ شمشیر و سناں کو چاہنے والی قومیں عروج کی طرف لپکتی ہیں اور طاؤس و رباب کی دلدادہ زوال اور پستی کی طرف دھکیل دی جاتی ہیں جن افسروں نے یہاں خوب مطالعہ کیا ہے وہ پاکستان میں مقیم اپنے ساتھیوں پر واپسی پر سبقت لے جائیں گے کیونکہ پڑھائی کے لئے اسقدر وافر وقت تو پھر کبھی نہ مل سکے گا اس پڑھائی سے نوجوان افسروں کو مستقبل میں بڑی مدد ملے گی۔

ہمارے ہر روز کی آپس کی گفتگو سے ہمارے فوجی اندازِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے کیا جب ہم آپس میں ملکر بیٹھتے ہیں تو سونے کے بھاؤ۔ کار کی قیمتوں۔ سٹاک ایکسیچنج کے نرخ۔ روپیہ اکٹھا کرنے کے آسان طریقوں۔ زمین کی الاٹمنٹوں اور کوٹھیوں کی تعمیر کی باتوں پر زیادہ وقت صرف کرتے ہیں یا اپنے قومی مسائل۔ فوجی تاریخ۔ فوجی تربیت۔ نئے آلات اور ہتھیاروں کی خصوصیات یا فنونِ جنگ جیسے مضامین زیرِ بحث لاتے ہیں اگر ہماری بات چیت کا رجحان اول الذکر اور اپنی شخصی ترقی و مفاد کے بارے میں ہوتا ہے تو پھر ہم اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو پائیں گے اس کے برعکس اگر مواخر الذبا توں اور اپنے اجتماعی اور قومی مفاد کے مسائل زیرِ غور لاتے ہیں تو پھر ہمارا اندازِ فکر درست ہے اور ہمارا مستقبل درخشندہ۔

# ۱۹۷۳ء

## ۲۰

۱۹۷۲ء کا سال ۳۱ دسمبر کی رات گذرنے کے ساتھ ہی گزر گیا۔ اُس رات میں دیر تک اپنے بستر پر رضائی کے اندر لیٹا پورے سال کے واقعات کا جائزہ لیتا رہا۔ زندگی کا ایک مکمل سال قید میں کٹ گیا۔ ظاہراً بے سود اور رائیگاں گیا معلوم ہوتا لیکن جب یکے بعد دیگرے واقعات آنکھوں کے سامنے یوں گزرنے لگے جیسے فلم دیکھی جا رہی ہو تو محسوس ہُوا کہ یہ واقعات سے پُر سال زندگی کے قیمتی اصولوں اور تجربوں کا حامل ہے۔ مشکلات کے باوجود ایک مسلسل جد و جہد جس میں اونچ بھی آئی اور نیچ بھی، عزم و صبر کا امتحان بھی ہُوا اور لطف و مزاح کی محفلیں بھی جمیں اور سب سے بڑھ کر دل میں حب الوطنی کا جذبہ اس قدر بیدار ہُوا کہ شاید پہلے اتنا کبھی نہ تھا۔

اپنی زندگی کے بیالیس سالوں میں مَیں نے کسی ایک سال میں اتنا کچھ نہیں سیکھا جو ۱۹۷۲ء کے سال میں سیکھا، اندازاً ایک سو کے لگ بھگ معیاری کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ہر روز زندگی کی نئی شکل دکھائی دیتی کوئی نہ کوئی مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوتا جس سے نبرد آزما ہونا پڑتا۔ اس سال نے مشکلات میں انسانی کردار اور اُس کی اہلیتوں کی مختلف تصاویر دکھائیں، اچھی بھی اور بُری بھی۔ جب میں سویا تو دل کو پوری تسلی اور مکمل سکون تھا کہ یہ سال باوجود ہر طرح کے حالات کے مفید طور پر گزر گیا اس کے علاوہ زیادہ سکون اس وجہ سے تھا کہ پاکستان ایک بہت بڑے حادثے سے دوچار ہونے کے بعد اس سال میں پھر سے ایک نئے عزم اور نئی قیادت تلے ترقی کی راہوں پر منزل کی جانب گامزن ہو چکا تھا۔ برباد اقتصادی حالت نہ صرف رو بہ صحت تھی بلکہ اس نے حیرت انگیز ترقی کی تھی، پست حوصلگی بلند حوصلگی میں بدل چکی تھی۔ ہمارے مفتوحہ علاقے دشمن نے خالی کر دیئے تھے۔ ملک جمہوریت کی طرف قدم اُٹھا رہا تھا اور معاشرے میں ناانصافیوں کے انسداد کا آغاز ہو چکا تھا

اپنے گھر میں ہر طرح کی خیریت رہی تھی ایک کامیاب سال کے لئے اس سے زیادہ کوئی کیا خواہش کرسکتا تھا اللہ میاں کا شکر ادا کیا اور پھر یوں سویا جیسے گھوڑے بیچ کر سویا جاتا ہے۔

نیا سال چڑھا تو نئے ولولے بھی ساتھ لایا نئے سال کیلئے نئے واقعات نئی جدوجہد نئی خوش ذائقہ حرکتوں کے آغاز کی صورت تھی تاکہ خون میں حرارت رہے بھارت کے افسروں اور کیمپ حکام کے ناروا اور بدسلوکانہ رویہ سے مجھے خوشی بھی تھی کہ وہ یوں کر کے اپنی اصلی ذہنیت پیش کر رہے ہیں۔ خواہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ ایسی صورت حال کا پیدا کیا جانا ضروری تھا۔ جس میں ہماری ان سے عداوت قائم رہے اور کیمپ کے مقیم سب ان سے بدظن ہوں ظاہر تھا کہ ہماری معمولی شرارت سے کھینچا تانی ہوتی اور ایسی کھینچا تانی میری نظر میں اس لئے ضروری تھی کہ معمولی مشکلات کے اضافے سے سرکشی بھی بڑھے اور دشمن کے لئے ضروری نفرت و حقارت کے جذبات بھی بڑھیں۔ مجھے رات کو دیر تک پڑھنے کی عادت تھی رات کو بارہ ایک بجے کے قریب سویا کرتا۔ رات کو ہمیں کمروں کے اندر بند کر دیا جاتا۔ بیرک کے ساتھ جو پیشاب خانہ تھا اس کی دیوار میں چھ انچ مربع جھروکے تھے ان میں سے باہر دیکھنے سے باڑوں کے پار سنتری کھڑا دکھائی دیتا سردی میں ٹھٹھر رہا ہوتا باڑ کے اندر کوئی سنتری نہیں ہوتا تھا اگر پیشاب خانہ میں کوئی ضروری کھٹ کھٹاہٹ ہو تو ظاہر ہے کہ سنتری کے کان کھڑے ہوں گے اور اگر سنتری کے کان کھڑے ہوں گے تو ظاہر ہے وہ محض کان کھڑے کئے سردی میں ٹھٹھرتا کھڑا نہیں رہے گا بلکہ ایسی کھٹ کھٹاہٹ کے بارے میں اپنے سے اوپر والے کو آگاہ کرے گا یعنی گارڈ کمانڈر کو اور گارڈ کمانڈر اپنے انسپکٹر کو بتائے گا اور انسپکٹر ڈیوٹی افسر کے گوش گزار کرے گا اور پھر وہ دھانواں دھوڑ بھاگتا ہوا چیکنگ کے لئے آئے گا اس کھٹ کھٹاہٹ کرنے میں مزہ تھا دو تین مرتبہ رات کو میں نے پیشاب خانہ میں پڑے کموڈ کو کھٹکھٹایا فرش پر گڈ گڈ کیا اور خود بستر میں آکر سو گیا چند ہی لمحوں بعد چیکنگ والے آدھمکے سب کو جگایا سردی میں باہر فال ان کر لیا غسلخانے اور دیگر کمروں کے فرش کو دیکھا اور مایوس واپس لوٹ گئے میرا مقصد حاصل ہو گیا۔ پھر ایک شرارت اور سوجھی۔

ہفتے میں دو مرتبہ ہمیں گوشت ملتا تھا اس کو صاف کرتے وقت کافی چھیچھڑے نکلتے تھے جن کو جب صحن میں پھینکتے تو چیلیں اٹھا کر لے جایا کرتیں میں نے ہندی زبان میں بھارت کے عوام کے نام اشتہار بنائے جس میں جنگی قیدیوں کے ساتھ کئے جانے والے سلوک کو مبالغہ آمیز طور پر بیان کیا ان چھوٹے چھوٹے اشتہاروں کو تہہ کر کے ماچس کی ڈبیوں کے اندر رکھا اور ڈبیا کے اُوپر سگریٹ کا چاندی والا کاغذ لپیٹ کر اوپر رنگ برنگ فیتا باندھ کر خوبصورت پیکٹ سا بنا دیا پھر ان پیکٹوں کو چھیچھڑوں کے اندر لپیٹ کر باہر صحن میں جو پھینکا تو چیلیں جھپٹیں اور اٹھا کر لے گئیں دور کہیں شہر کی جانب مجھے یقین تھا کہ یہ خوبصورت پیکٹ جب کسی کو سڑک یا گلی کے قریب گرے پڑے ملیں گے تو وہ ضرور انہیں اٹھا کر پڑھے گا اور ایسا کرنے کا مقصد یہی تھا لیکن اگر ان کے پڑھنے کے بعد ادھر ادھر کچھ رپورٹ ہوئی تو کیمپ میں کچھ شامت آئے گی اور اس کی ضرورت بھی تھی ایسے کئی پیکٹ میں نے چیلوں کے ذریعے کیمپ سے باہر بھیجے کوئی دو ماہ یہ عمل جاری رہا ایک روز ایک چیل ایک پیکٹ والا چھیچھڑہ اٹھا کر لے گئی ابھی کیمپ اُوپر ہی تھی کہ اس نے چھیچھڑا کھا کر ڈبیا کو اونچی فضا میں ناکارہ چیز سمجھ کر چھوڑ دیا ڈبیا لہلہاتی ہوئی زمین کی طرف آ رہی تھی۔ عین کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر کے اوپر مجھے گھبراہٹ ہوئی کہ یہ تو سیدھے ہی پول کھل جائے گا ڈبیہ کے ساتھ ساتھ دل بھی نیچے آ رہا تھا ڈبیا جب دفتر کی بیرک کی چھت کے قریب پہنچی تو ایک اور چیل نے جھپٹا مار کر اسے پنجوں میں دبا لیا اور سیدھی اُوپر بلندی کی طرف لے اڑی۔ میری جان میں جان آئی مگر لمحے کے بعد ہی کیا دیکھتا ہوں کہ چیل نے اسے ناکارہ چیز سمجھ کر چھوڑ دیا اور ڈبیا پہلے کی طرح لہلہاتی، بل کھاتی ہوئی نیچے آنے لگی اور اس مرتبہ ہمارے دروازے کے سامنے کھڑے سنتری کے بالکل سر کے اوپر کی طرف۔ ایک دفعہ پھر دل کی حرکت بند ہوتی محسوس ہوئی ڈبیا عین سنتری کے سر کے اوپر پہنچی ہی تھی کہ ایک تیسری چیل نے اسے جھپٹ کر پکڑا اور کہیں دور درختوں کے پار لے جا کر بیٹھ گئی میں نے شکر ادا کیا۔ تمام ڈبیاں تو لوگوں نے نہ اٹھائی ہوں گی لیکن اندازاً ایک حد کے قریب میں

سے اگر انہوں نے دس پندرہ بھی اٹھالی ہوں تو مقصد پورا ہو گیا تھا ان کا کیا بنا؟ آگے ملاحظہ کیجئے۔ السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا کے ایک شمارہ میں ایڈیٹر کے نام چند خطوط شائع ہوئے جن میں جنگی قیدیوں کی واپسی کی حمایت کی گئی تھی ایک صاحب نے قیدیوں کے ساتھ برے سلوک کی وارداتوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ بھارت سرکار کو صحت مند روایات قائم کرنی چاہئیں جیسا کہ نپولین نے ایک برطانوی قیدی کو جو فرار کے بعد پکڑا گیا تھا کشتی دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم نے جرات مندی کا مظاہرہ کیا ہے جاؤ اب کشتی میں بیٹھ کر برطانیہ واپس پہنچ جاؤ چنانچہ السٹریٹیڈ ویکلی کے نام میں نے ایک مراسلہ لکھا جس میں اپنے کیمپ میں کئے جانے والی جنیوا کنونشن کی خلاف ورزیوں کا ذکر کیا اور ساتھ یہ بھی لکھا کہ ہم بھارتی نپولینوں سے نہ کسی فراخدلی کے خواہاں ہیں اور نہ ہی شجاعت کے امیدوار ہیں انہیں صرف قیدیوں کیساتھ ایک سپاہی کا سا سلوک کرنا چاہیے بھارتی حکومت کا تمام تر پراپیگنڈہ کہ جنگی قیدیوں کیساتھ بڑا عمدہ سلوک کیا جارہا ہے بے بنیاد ہے اسی طرح ٹائم آف انڈیا کے ایڈیٹر فرینک موریس نے بھی ایک اداریہ میں قیدیوں کی مسلسل نظر بندی پر تنقید کی تھی ہندوستان ٹائمز کے ایک شمارہ میں ایک شخص بھگوا نامی نے ایک بے تکا سے خط شائع کیا جس کا مضمون مختصراً یہ تھا کہ بھارت ایک واحد ملک ہے جس نے جنیوا کنونشن کے تحفظ کے لئے اپنی اسمبلی میں بل پاس کر کے اسے قانونی شکل دے رکھی ہے پاکستان اور پاکستان کے صدر بھارت کے خلاف جھوٹے الزام لگا رہے ہیں کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جارہا ہے ان کو ہر طرح کی کینٹین۔ سٹورز فلمیں اور دوسری چیزیں فراہم کی جارہی ہیں حکومت ہند کو چاہیے کہ وہ ان قیدیوں کو کوئلے کی کانوں میں کام کرنے پر لگائے جیسا کہ فرانس نے جرمنی کے جنگی قیدیوں کو دوسری جنگ عظیم کے بعد ملک کے تعمیری کاموں پر لگایا تھا اس خط کا جواب دینا مناسب بھی تھا اور ضروری بھی میں نے مندرجہ ذیل خط ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر کے نام لکھا جو مجھے کسی نے بتایا کہ وہ اس اخبار میں شائع ہوا۔ جنگی قیدیوں کی حالت زار پر مسٹر بھاگوا کا اظہار

خیال جو کہ آپ کے ۴ فروری ۷۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا نہ صرف مضحکہ خیز ہے بلکہ بالکل بے حقیقت بھی ہے ملک کی اسمبلی میں بل پاس کرنا ایک بات ہے اور اس پر عمل درآمد کرنا دوسری نہ حکومتِ پاکستان اور نہ ہی صدر بھٹو حکومت ہند کے خلاف بے بنیاد الزام لگا رہے ہیں کہ بھارت جنیوا کنونشن کی خلاف ورزیاں کر رہا ہے ان کے تمام الزامات حقیقت پر مبنی ہیں انٹرنیشنل ریڈکراس کے نمائندوں کی رپورٹ کے بعد شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ قیدیوں کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے یہ نمائندے نہ تو ہمارے بچا لگتے ہیں اور نہ ہی پاکستان کے تنخواہ یافتہ ہیں کہ وہ غیر جانبدارانہ رپورٹ نہ دیں گے ان کے چیف کو نکال کر اور ان کے نمائندوں کی کیمپوں میں آمد کو روک کر بھارتی حکومت کا مدعا یقیناً قیدیوں سے کئے جانے والے شاندار سلوک کو چھپانے کا ہے کسی کیمپ میں بھارگاوا صاحب خود جا کر دیکھیں تو ان کو سچی حقیقت کا علم ہو جائے گا فرانسیسیوں نے جرمنی کے جنگی قیدیوں کو اس لئے کام پر لگایا تھا کیونکہ ان کے پاس لوگوں کی کمی تھی مسٹر بھارگاوا کو شاید علم نہیں کہ جنیوا کنونشن کے تحت قیدیوں کو ملکی کاموں پر لگائے جانے کی صورت میں لوکل ریٹ پر مبنی مزدوری دینی پڑتی ہے اور قیدیوں کو مزدوری پر لگا کر ان کا اپنے لاکھوں بھوکوں کا پیٹ کیسے پالنے کا منصوبہ ہے کیا اس صورت میں وہ انہیں یوگنڈا بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں. بہر صورت ہم ان کی فرضی مراعات کو خیرباد کہہ کر کوئلے کی کانوں کے مزدوروں سے اپنی جگہ تبدیل کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن وہ مزدور ہمارے کیمپوں میں رہنے کے چند روز کے اندر ہی باوجود بھارگاوا صاحب کی بتائی ہوئی مراعات کے واپس کانوں میں جانے کیلئے احتجاج اور مظاہرے کرینگے۔

ایک اور خط بھارت کی لوک سبھا کے ایک حزب اختلاف کے لیڈر کے نام لکھا اور اسے کیمپوں میں کی جانی والی زیادتیوں سے آگاہ کیا۔

یہ تمام خط میں نے ایک ایسے پوشیدہ طریقہ سے پوسٹ کروائے جسکو میں صیغۂ راز میں رکھنا پسند کرونگا لیکن ان خطوط کو پوسٹ کرنا ایک بھاری مہم تھی جسکے لئے میں کئی ہفتوں سے کام کر رہا تھا۔

سات آٹھ ماہ گزر چکے تھے جب سے مئی میں ہماری سرنگ پکڑی گئی تھی دل میں ہر وقت بے چینی تھی کہ کوئی اور کوشش کرنی چاہیئے خاص کر چند نوجوان افسر بار بار مجھ سے کہتے کہ کچھ کرنا چاہیئے مجھے ان کی رائے سے پورا اتفاق تھا کہ ایک دفعہ کی ناکامی کے بعد دل چھوڑ بیٹھنا کوئی جوانمردی نہیں لیکن میں اس بات سے واقف تھا کہ کیمپ میں افسروں کی بھاری تعداد فرار کے کسی منصوبے کے حق میں نہیں اگر میرے دل میں کچھ ہچکچاہٹ تھی تو صرف اسی وجہ سے تھی۔ فرار کی کوئی کوشش بھی کرتا تھوڑا بہت خمیازہ تو سب کو بھگتنا پڑتا تھا۔ اور کسی قسم کے خمیازے بھگتنے کے لئے بیشتر تعداد بالکل تیار نہ تھی، یہ بھی ناممکن تھا کہ منصوبہ ایسا تشکیل دیا جائے کہ سوائے فرار میں چند حصہ لینے والوں کے باقی کو خبر تک نہ ہو۔

آخر ایک دن ہم وہی درجن بھر افسر اکٹھے ہوئے پورے حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ اردلیوں کے کمرے سے جو باڑ کے بالکل قریب واقع تھا سرنگ کھود کر باہر نکلا جائے اور کوشش کی جائے کہ مزید افسروں کو ہم خیال بنایا جائے اس میں شک نہیں کہ حفاظتی تدابیر کافی کڑی تھیں اور کامیابی کے مواقع بہت کم تھے ہمارا نقطہ نظر یہ تھا کہ مانا کامیابی کے مشکل سے ۲۰ یا ۲۵ فی صد مواقع ہیں کم از کم کوشش تو کرنی چاہیئے کہ ان سے فائدہ تو اٹھائیں۔ فرار کے کسی منصوبے میں اس سے زیادہ فیصد امکان کی ضمانت دی جانی مشکل ہے اگر سو فی صدی امکان کی ضمانت ہو تو پھر کسی کیمپ میں قیدی باقی نہ رہے جنگی قیدیوں کے فرار کی تاریخ اور کہانیاں پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ مشکل سے پانچ فی صد کوششیں کامیاب ہوا کرتی ہیں باقی ۹۵ فی صد کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے فرار کی کوشش کی کامیابی میں حساب کے سوال کی طرح جواب نکالنا درست نہیں۔ اس کا جواب دو جمع دو چار کی طرح نہیں نکالا جا سکتا ہے اس میں قسمت کا کافی دوش ہوتا ہے اوروں کی رائے تھی کہ نوے اور صد فی صد چانس ہو تو کوشش کرنا عقلمندی ہے اتنی بھاری کامیابی کی ضمانت تو بھارتی خود دروازے کھول کر اپنی آنکھیں بند کر کے

بھاگنے کے لئے کہنے پر بھی نہ دے سکتے تھے ہماری رائے تھی کہ ہمت مرداں مدد خدا کے مقولے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اللہ کا نام لیکر بسم اللہ کر دینی چاہیئے پکڑے جانے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کی قید ور قید ہی مل سکتی تھی اگر سب اکٹھے ہوں گے تو اسی بیرک میں بند کر دیئے جائیں گے اور اس کے لئے ہم تیار تھے، ہمارے منصوبے میں گولی لگنے کا کوئی خاص خطرہ نہ تھا لیکن اگر پانچ فیصد تھا بھی تو ایسی مہموں میں اتنا خطرہ لینے کے لئے تیار ہونا چاہیئے۔

ہم نے چند روز دوسروں کو کافی سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ بالکل ماننے کے لئے تیار نہ تھے، نہ صرف یہ کہ وہ حصہ لینے کے لئے تیار نہ تھے بلکہ وہ ہمیں بھی ہر جائز اور ناجائز طریق سے باز رکھنے کی کوشش پر تلے ہوئے تھے، ہماری پہلی مہم کے دو تین ساتھیوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کا مجھے خاص طور پر صدمہ ہوا چند روز تک یہ کشمکش جاری رہی۔ نئی سرنگ کے کھودنے کے لئے مناسب جگہ صرف اردلیوں کا کمرہ تھا چنانچہ اختلافات کرنے والے چند افسروں نے اس کمرہ کے مکینوں سے ہمارے ساتھ تعاون نہ کرنے کے لئے کہا انکے پاس صرف یہی حربہ رہ گیا تھا جس کے استعمال سے وہ ہمیں ہمارے منصوبے سے باز رکھ سکتے تھے اس کمرہ سے باڑوں کے باہر نکلنے کے لئے تیس فٹ لمبی سرنگ درکار تھی کام کیونکہ قریباً ساری رات جاری رکھا جا سکتا تھا اس لئے اندازہ تھا کہ دس روز کے اندر کام پایہ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے گزشتہ چھ سات ماہ کی مسلسل تلاشیوں کے بعد چیکنگ بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی مسئلہ صرف مٹی غائب کرنے کا تھا اگر تمام ساتھی اس میں شریک ہوتے تو قریباً چار سو بالٹیوں کی مٹی بستروں کے اندر چھپائی جا سکتی تھی لیکن خوئے بدرا بہانہ بسیار مخالفت کرنے والے کامیابی کے فی صد مواقع کا حساب کر کے کچھ نہ کرنے کی دلیلیں دیتے رہے تکرار کی نوبت کچھ یہاں تک آئی کہ مخالفت کرنے والوں نے بھارتی حکام کو رپورٹ کرنے کی دھمکی دینا مناسب سمجھی آخر اس مصلحت کی بنا پر کہ آپس کی ناچاقی زیادہ بڑھ

نہ جائے اس منصوبے کو خیر باد کہنا پڑا نا چاکی کی صورت میں معاملہ اپنے ہاتھوں سے نکل کر دشمن کے ہاتھوں میں چلا جاتا۔

مشکل کام میں اوروں کو ہم خیال بنانا کتنا مشکل ہوتا ہے اس بات کا مجھے شدت سے احساس ان دنوں ہوا جب مشکل حالات میں دو تدبیریں پیش ہوں تو تقریباً فطری طور پر بیشتر لوگ ایسی تدبیر کو اختیار کرنے کے حق میں ہوتے ہیں جو آسان ہو اور جس میں کوئی خطرہ نہ مول لینا پڑتا ہو پر خطر اور خار دار راہ پر اکثر گامزن ہونا پسند نہیں کرتے ایسے حالات میں ان لوگوں کا کام سہل ہوتا ہے جو ساتھیوں کو آسان راہ پر چلنے کی تلقین کرتے ہوں خواہ ایسی راہ انہیں منزلِ مقصود کی طرف لے جاتی بھی نہ ہو اس کے برعکس ہمت. جوانمردی استقلال اور مدد خدا پر بھروسہ کی امید دلا کر کٹھن راہ پر گامزن ہونے کی تلقین کرنے والے لیڈر کا کام بے حد مشکل ہوتا ہے اور اس کی پیروی کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ محدود ہوتی ہے۔

اضطراب اور تذبذب کے بغیر زندگی پھیکی پڑ جاتی ہے ہر شخص کی زندگی بھی ایک فلمی کہانی ہے ایک جیتا جاگتا ڈرامہ ہے آپ نے ایسی فلمیں دیکھی ہوں گی جن میں یہ دونوں عناصر موجود ہوں مثلاً الفرڈ ہچکاک کی فلمیں جن کے دیکھنے میں کتنا لطف آتا ہے ان کے بغیر زندگی جوہڑ کے پانی کی طرح خاموش بے حس اور بدمزہ بن کر رہ جاتی ہے سمندر کے پانی کو ٹھاٹھیں مارتے دیکھ کر کتنا مزہ آتا ہے زندگی کی اونچ نیچ میں بھی سمندر کی لہروں کا سا لطف ہے۔

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

گزشتہ تین چار ماہ سے کچھ لکھنے کا سلسلہ جاری رہا مفید طور پر وقت گزارنے کا یہ ایک اچھا طریقہ ہے ہر روز اندازاً دو اڑھائی گھنٹے لکھنے میں گزر جاتے اس ضمن میں تین مختلف

عنوانوں کے تحت کچھ نہ کچھ لکھ رہا تھا ایک تو اپنے ملک کے گزشتہ پچیس برس کے حالات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا اس دوران میں قوم نے کتنے وار سہے اور داغ کھائے قوم کے ہر فرد کا اس دوران کیا کردار رہا ہماری اجتماعی کمزوریاں کیا تھیں اور اپنے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ دوسرے بچوں کے لئے سبق آموز کہانیوں کا سلسلہ شروع کیا اور تیسرے اپنی قید کی آپ بیتی جو کہ اس کتاب کی صورت میں پیش کر رہا ہوں روزانہ کے لکھے ہوئے کاغذات کو پاؤڈر کے ڈبوں میں چھپاتا۔ دیسی صابن کی ٹکیوں میں سوراخ کر کے بے شمار تحریر شدہ کاغذات اُن میں چھپائے اور اس طرح یہ کاغذات پوشیدہ طور پر ساتھ لانے میں کامیاب ہوا۔

زندگی میں کامیابی کے لئے تقریر اور تحریر کی صلاحیتیں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں صلاحیتیں خداداد ہوتی ہیں لیکن مشق اور تربیت سے ان کو اجاگر کیا جا سکتا ہے اپنے خیالات کو ایسے انداز سے زبانی یا کاغذ پر پیش کرنے کی مہارت کہ ان کے سننے اور پڑھنے والے اس کے قائل ہو جائیں بے حد ضروری ہے۔ ہمارے بچوں کی تعلیم کے دوران تربیت کے اس اہم پہلو کو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے ایک فوجی افسر کے لئے ان دونوں باتوں میں مہارت حاصل کرنا اہم ہے۔ چنانچہ نوجوان افسروں کو لکھنے کی مشق کرنے کی ترغیب دی اور ملٹری ہسٹری کے کچھ لکچر بھی کروائے۔ باوجود محدود انتظام کے یہ لیکچر بڑے مفید اور کامیاب ثابت ہوئے۔

تھاٹو چک کا معاملہ شملہ کانفرنس کے بعد کافی ٹیڑھا مسئلہ بنا رہا۔ اور لائن آف کنٹرول کا تعین کھٹائی میں پڑا رہا۔ ذاتی طور پر مجھے خوشی تھی کہ پاکستان تھاٹو چک کے معاملہ میں اصولوں کی بنا پر ڈٹا رہا۔ تھاٹو چک چونکہ باقی لائن آف کنٹرول سے منسلک علاقہ نہ تھا اس لئے بھارت کا اصرار تھا کہ یہ علاقہ پاکستان بغیر کسی دوسری جگہ رعائت لینے کے خالی کر دے۔ لیکن شملہ معاہدہ میں یہ طے پا چکا تھا کہ سوائے کشمیر کے باقی تمام علاقوں سے دونوں

ممالک اپنی اپنی فوجیں نکال لیں گے تھا تو چک چونکہ کشمیر میں تھا اس لئے پاکستان کا
اصرار کہ یہ اس کے پاس رہے گا بالکل درست تھا یا اس کے عوض اسے دوسرے علاقہ
میں رعائیت دی جانی چاہیئے تھی یہ صرف ایک مربع میل علاقے کے لئے جھگڑا نہ تھا بلکہ
اصول کا معاملہ تھا۔ پاکستان حق بجانب تھا اس لئے اس کا اصرار جائز تھا۔ اس اصرار
میں بڑی دُور اندیشی بھی تھی۔ آخر بھارت کو پاکستان کی بات ماننی پڑی۔ پرانی جنگ بندی
لائن کو بدل کر نئی لائن آف کنٹرول بنانے میں میری رائے ہے کہ ہندوستان نے کوتاہ بینی
کا ثبوت دیا ہے، اس میں شک نہیں کہ عارضی طور پر کارگل اور ٹیٹوال میں بھارت کو کچھ
پوسٹیں مل جانے سے فائدہ پہنچا ہے مگر مستقبل میں اسی قانون کو عائد کرنے سے بھارت
کو خسارہ اٹھانا پڑے گا کیونکہ آئندہ کسی جنگ میں اگر پاکستان کشمیر میں کسی علاقے پر
قابض ہو گیا تو وہ اسی کا ہو جائے گا خواہ وہ سانبہ کا علاقہ ہو یا جموں کا بعض باتیں وقتی
طور پر سود مند نظر آتی ہیں۔ بھارت نے پاکستان کی مشکلات سے فائدہ اٹھا کر اپنے لئے
رعایت تو حاصل کر لی ہے مگر غیر منصفانہ معاہدے خاطر خواہ ثابت نہیں ہوا کرتے صرف
تاریخ اور وقت ہی بھارت کے اس اقدام پر درست تبصرہ کر سکیں گے۔ ہمارے علاقوں
سے بھارتی فوج کی واپسی سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے کہ جنگ سے متاثرہ لوگ اب
جلد ہی اپنے گھروں کو واپس جا سکیں گے۔ جنگ کی تباہ کاریوں میں باقی چیزوں کے علاوہ
جنگ کے علاقوں میں رہنے والے لوگ بڑی مشکلات برداشت کرتے ہیں۔ جنگ بند ہونے
کے لمبی مدت تک وُہ بے گھر رہتے ہیں، جب وہ لوٹتے ہیں تو سب کچھ تباہ و برباد پاتے
ہیں۔ یہ ملک کے باقی عوام کا فرض ہے نہ کہ صرف حکومت کا کہ وہ ایسے لوگوں کی دل کھول
کر مدد کریں۔ اسی طرح مشرقی پاکستان کے کیمپوں میں بہاریوں کی حالت کے تصور سے رونگٹے
کھڑے ہو جایا کرتے ہیں۔ کس قدر مجبوری اور مایوسی کی حالت میں یہ لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں۔
فراغت کے وقت اپنی ہزیمت کا خیال آتا۔ یہ ہماری تاریخ کا سیاہ ترین باب تھا۔

یہ خیال اکثر تنگ کرتا کہ میں اپنے بچوں کو خاص کر دوسرے جاننے والوں کو بالعموم اپنی اور اپنے ڈویژن کی کارکردگی کی کیا داستان سناؤں گا۔ یہ اگرچہ درست تھا کہ مجھ اکیلے کا اس میں کوئی دوش نہ تھا لیکن میں بھی تو اس شکست خوردہ فوج کا ایک حصہ تھا جس نے دشمن کے آگے ہتھیار ڈالے تھے۔ جب تاریخ لکھی جائے گی تو ہماری آئندہ نسلیں کیا کہیں گی کہ فلاں سال ہمارے بڑوں نے بچہتر ہزار کی تعداد اور بیش بہا ساز و سامان کیساتھ ہتھیار ڈال دیئے۔ مشرقی پاکستان کی خاطر خواہ طور پر حفاظت نہ کر سکے۔ نعرے تو یہ لگایا کرتے تھے کہ ہم اپنی زمین کے ہر انچ کے لئے لڑیں گے۔ کٹ مریں گے مگر دشمن کے ناپاک قدموں سے اسے خراب نہ ہونے دیں گے مگر پہلے تو وہ خود خانہ جنگی میں مشغول رہے اس کے بعد کُل دو ہفتوں کی قلیل مزاحمت کے بعد سقوط ڈھاکہ ہو گیا۔ ہمارے بڑوں نے تو ہمیں ایسا سبق نہ پڑھایا تھا وہ تو کٹ مرنا جانتے تھے ہارنا نہیں جانتے تھے۔ پھر یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ اس کا شائد کوئی جواب نہ بن پڑیگا۔ مانا کہ ہم تعداد میں کم تھے، ہمارے پاس ہوائی جہاز اور بحری جہاز نہ تھے۔ دشمن ہم سے تین گنا زیادہ تھا۔ خود اپنی قوم کی بھاری تعداد خلاف تھی، ان تمام باتوں کے باوجود قوم ہم سے بڑی اُمیدیں وابستہ کئے بیٹھی تھی ہماری تو کل ۵ فیصد تعداد نے بھی جنگ کے دوران جام شہادت نوش نہ کیا۔ تو پھر وہ کیسا سینہ سپر ہونا تھا جس میں بھاری قربانی کے بغیر شکست ہو گئی اگر آدھے بھی مارے گئے ہوتے تو باقی بچنے والے یہ کہنے کے قابل تو ہوتے کہ انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی مگر پھر بھی خدا کو ان کی کامیابی منظور نہ تھی شکست بجائے خود اتنی بڑی چیز نہیں اگر وہ ایسی شکست ہو جس پر فخر کیا جا سکے۔ ایسی شکست جس پر دشمن اور دوست سب آفرین کہیں۔ کلاز وچ نے اپنی کتاب تھری آرٹیکل آف فیتھ میں لکھا ہے۔

"بزدلانہ طور پر ہتھیار ڈال دینے کا لگا ہوا ماتا کا داغ کبھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ اس طرح کا زہر کا قطرہ جو قوم کے خون کے اندر سرایت کر جاتا ہے وہ قوم کی آنے والی نسلوں

ہیں چلا جاتا ہے اور وہ ان کی قوت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے اس کے برعکس ایک شجاعت اور شہادت سے بھرپور جدوجہد کے بعد اگرچہ قوم اپنی آزادی بھی کھو بیٹھے تو بھی وہ اپنی شجاعت بھری روایات سے نئی امنگوں اور ولولوں سے پھر اُبھر آتی ہے اور انہی روایات کی جڑوں سے نئے درخت پھوٹ پڑتے ہیں" شکست کے داغ کو مٹانے کیلئے دشمن پر ایک بھرپور فتح کا حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ ہزیمت کا یہ زہر آئندہ نسلوں کے خون میں سرایت کرنے سے پہلے ایک نئے تازہ سرخ خون سے قوم کے ایک سنہری باب کی تاریخ لکھی جا سکے تاکہ پڑھنے والے یہ کہیں کہ آفرین ہے ان لوگوں پر جنہوں نے باوجود ایک بھاری شکست کے اپنے ڈگمگاتے پاؤں سے اپنے کئے ہوئے گناہوں کی تلافی کر لی۔ یہ داغ نہ ہی اقتصادی ترقی اور نہ ہی سیاسی استحکام اور نہ ہی کسی اور عمل سے مٹایا جا سکتا ہے اسکے مٹانے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ ہے میدان کارزار میں دشمن پر فتح ایک فیصلہ کن فتح۔ ایک شاندار کامیابی۔

لیکن جب پاکستان میں لوگوں میں نااتفاقی کی خبریں سننے اور پڑھنے میں آئیں تو بے حد دکھ ہوتا۔ کراچی میں سندھی اور اردو بولنے والوں میں تصادم۔ راولپنڈی میں نیشنل عوامی پارٹی اور پیپلز پارٹی میں فساد۔ بلوچستان میں قبیلوں کی بغاوت اور ہر خبر میں جانوں کے تلف ہونے کی اطلاع۔ کیا ہم نے اتنے بڑے سانحہ کے بعد قومی اتحاد کی اہمیت کو نہیں سمجھا اوّل تو ہم نے تاریخ سے سبق حاصل کرنا نہ سیکھا تھا اور اب ان غلطیوں سے بھی سبق نہیں سیکھ رہے کیا یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے یا اپنا احمق پن شاید اس کشمکش میں بھی کوئی مصلحت ہو اس خیال سے کچھ مصنوعی تسلی ہوا کرتی اور اس یقین سے بھی کہ ہم انشاءاللہ ایک تابندہ قوم اور ایک خوشحال پاکستان ضرور بنانے میں کامیاب ہوں گے۔ یوں ضرور ہو کر رہے گا ورنہ تاریخ اپنا مقصد کھو بیٹھے گی یہ میرا ایمان ہے پاکستان کے حصول کے لئے برصغیر کے مسلمانوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں چھ کروڑ مسلمانوں نے بھارتی ہندوؤں کی ناانصافیوں

کو سہنا منظور کیا لاکھوں نے جانیں دیں لاکھوں بے گھر ہوئے صرف اس لئے کہ پاکستان ایک تابندہ ستارہ بن کر چمکے گا تو ان کا تمام غم اور دکھ سکھوں میں بدل جائے گا۔

فرصت کے لمحات میں جب انسان ظاہراً معمولی چیزوں پر غور کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب نہایت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں قدرت کا مشاہدہ کرنا بھی ایک نہایت دلچسپ مشغلہ ہے ایک دن میں نے چیونٹیوں کے بل کے پاس زمین پر بیٹھ کر انکی کشمکش حیات کا مطالعہ کیا۔ کوئی چار یا پانچ گھنٹے میں نے اس کام پر صرف کئے ہوں گے چیونٹی کتنا چھوٹا جانور ہے مگر وہ سب ملکر بڑی منظم زندگی گزارتی ہیں ایک بل میں تمام رہنے والی چیونٹیوں کی ایک رانی ہوتی ہے جو سب کو حکم دیتی ہے اور سب مل کر کام کرتی ہیں ان میں سے ہر ایک کتنی جفاکش ہوتی ہے ایک چیونٹی کے ساتھ میں مسلسل تین گھنٹے صحن میں پھرتا رہا وہ اپنے بل سے ایک سو فٹ دور کھانے کی تلاش میں نکلی ایک مری ہوئی موٹی ٹڈی کے قریب پہنچی جو جسم میں چیونٹی سے سو گنا بڑی تھی اب اتنے لمبے راستے پر جس جفاکشی اور ہمت سے اس نے اس بھاری بوجھ کو کھینچ کھینچ کر بل تک پہنچایا وہ استقلال اور عزم کی ایک سنہری مثال تھی راستے میں گھاس۔ تنکے۔ مٹی کے تودے۔ کیچڑ غرض کیا کیا نہ آیا جہاں وہ پھنسی مگر اس نے ہمت نہ ہاری آخر مسلسل تین گھنٹے کی جدوجہد کے بعد جب وہ اپنے بل کے قریب پہنچی تو ایک درجن مزید چیونٹیوں نے اس کی مدد کی۔

ہوا میں چہچہاتی چیلوں۔ کبوتروں اور دوسرے پرندوں کو دیکھ کر کبھی کبھی اپنی قید کا شدت سے احساس ہوتا دن میں دو دفعہ صبح اور شام جھانسی سے اور جھانسی کی طرف آتے جاتے ہوائی جہاز کو دیکھ کر اپنی بندشوں کی چبھن ہوا کرتی۔ فوکر جہاز ہمارے کیمپ کے عین اوپر سے گزرتا گوالیار کا ہوائی اڈہ ہمارے کیمپ کے شمال میں چھ میل کے فاصلہ پر تھا۔

ہماری بیرک کی چھت میں چند گلہریاں رہا کرتی تھیں گلہری کے ایک بچے کو پالنے کا منصوبہ بنایا گیا کیپٹن نیر نے ایک ٹوکری کے نیچے روٹی کے ٹکڑے رکھ کر ایک بچے کو پکڑا۔ اس

کے گلے میں رسی باندھ کر چند روز اسے سدھارنے پر لگائے مگر چونکہ بچہ ذرا بڑا تھا اسلئے سدھر نہ پایا اس نے تین مرتبہ اپنے تیز دانتوں سے کاٹا بھی۔ آخر اسے چھوڑ دیا گیا۔

پھر ایک روز چھت سے گلہری کے تین ننھے منے بچے گر پڑے جبکہ ان کی ماں کہیں باہر گئی ہوئی تھی تو ایک موٹا چوہا بچوں کو کھانے کی غرض سے گلہری کے بل میں جا گھسا تینوں بچے ڈر کر بھاگے چوہا ان کا تعاقب کر رہا تھا بچے اپنا توازن قائم نہ رکھ سکے اور دہشت سے یکے بعد دیگرے نیچے آن رہے تینوں کو پکڑ لیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد گلہری واپس آئی تو ترا تر سے ساری بیرک کو سر پر اٹھا لیا میں نے اس کے ایک بچے کو برآمدے میں چھوڑا وہ جھٹ نیچے اتری بچے کو منہ میں ایسے پکڑا جیسے بلی اپنے بچوں کو پکڑتی ہے اور پھاندتی ہوئی یہ جا وہ جا وہاں سے غائب ہو گئی، دوسرے دونوں بچوں کے لئے میں نے نیر کی مدد سے گھی کے خالی ٹین میں چھید کر کے اوپر جالی دار دروازہ لگا کر اور اس کے اندر رضائی سے روئی نکالکر ڈالی اور ان کے لئے گھر تیار کیا۔ دن کے وقت اپنی چارپائی پر مچھر دانی لگا کر اس کے اندر دونوں کو چھوڑ دیا جاتا، روئی کی بتی بنا کر اسے دودھ میں ڈبو کر دن میں کئی مرتبہ انہیں دودھ پلاتا ایک ہفتہ کے بعد وہ بسکٹ کے ٹکڑے اور پکے ہوئے چاول کھانے لگے۔ ایک کا نام چھمک اور دوسری کا چھلو رکھا گیا، پندرہ دن کے بعد وہ بالکل سدھا لی گئیں پھر ان کو باہر درخت پر چھوڑ دیا جاتا سارا دن کھیلنے کے بعد وہ خود بخود اپنے ڈبے میں واپس آجایا کرتیں سب کے سر اور کندھوں پر چھلانگیں مارتیں۔ ہاتھ پر بیٹھ کر کھانا کھاتیں۔ پورے کیمپ کی دلچسپی کا مرکز بن گئیں۔ دو ماہ کے بعد ان کے بچے دینے کا وقت آگیا۔ تو دونوں نے اپنے لئے علیحدہ علیحدہ گھر بنائے۔ میجر صابر نے ان کے ساتھ بڑی دوستی بڑھائی۔ ان کا ڈر بالکل جاتا رہا۔ چنانچہ ان کے اس بے خوف رویہ سے فائدہ اٹھا کر مانو بلی انہیں یکے بعد دیگرے ہڑپ کر گئی اس کے بعد میجر صابر اور کیپٹن ظفر سعید ملک نے ایک اور بچہ پالا جو بڑی دیر تک کیمپ کا پالتو جانور بنا رہا۔

لوک سبھا میں جنگی قیدیوں کا کبھی کبھار ذکر ہوا کرتا مثلاً بھارت کو جنگی قیدیوں پر ہر ماہ اندازاً ایک کروڑ روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے اس کے علاوہ ماہانہ پندرہ لاکھ روپے جیب خرچ قیدیوں کو دیا جاتا جو حکومت پاکستان سے واپس وصول کیا جانا تھا۔ یعنی بھارت کے لئے ہر ماہ کا پندرہ لاکھ کا زرِ مبادلہ اکٹھا ہو رہا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں وزیر دفاع شری جگ جیون رام نے کہا کہ ظاہر ہے کہ جب انسان کو کوئی فکر نہ ہو کھانے کو اچھا ملتا ہو اور رہنے کا خاص انتظام ہو تو وہ موٹا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی جنگی قیدی خوب موٹے ہو رہے ہیں معلوم نہیں وہ کن قیدیوں کے موٹا ہونے پر تبصرہ کر رہا تھا کیونکہ ہمارے کیمپ میں تو تقریباً ہر ایک قیدی کا دس سے تیس پونڈ تک وزن کم ہو گیا تھا۔ جب کبھی ہمارے سپاہیوں کو سامنے کی سڑک سے لے جاتے تو وہ بے حد کمزور دکھائی دیتے اور ایسی بھی بے فکری کیا ہو گی کہ آدمی موٹا ہونے لگے۔ نظر بندی نہ ہوئی سوئٹزرلینڈ کی سیر ہو گئی۔

مارچ ۱۹۷۳ء تک کل ۱۵۹ جنگی قیدیوں نے فرار کی کوشش کی تھی جس میں سے ۱۱۱ افسر تھے چار جے سی او ۴۴ جوان۔ فرار کی کوشش میں گولی کا نشانہ بنائے جانے والوں کی تعداد ۴۲ تھی اور زخمی ہونے والوں کی ۱۶۵ اس کے علاوہ ۶۵ جنگی قیدی دوسری وجوہات یعنی بیماری وغیرہ سے جاں بحق ہو گئے تھے۔

ان ہی دنوں بنگلہ دیش میں پاکستان کے وفاداروں پر مقدمہ کے اجراء کی خبر سن کر بے حد صدمہ ہوا جنہوں نے حب الوطنی کا ثبوت دیا تھا۔ اب غدار کہلائے جا رہے ہیں اور جو پہلے غدار قرار دیئے گئے تھے اب عنانِ حکومت سنبھالے بیٹھے تھے۔ حکومت کے خلاف کوشش کرنیوالے اگر کامیاب ہو جائیں تو محبِ وطن بن بیٹھتے ہیں اور اگر ناکام ہوں تو شر پسند اور سازشی کہلائے جاتے ہیں۔ سیاست اور حکومت بڑے انوکھے پہلو رکھتی ہے اور ہر پہلو ایک جدید اور نرالی تصویر پیش کرتا ہے مشرقی پاکستان کے سابق گورنر عبدالمالک اور ان کے ساتھی وزراء کو عمر بھر کی قید کی سزا دی گئی۔ فضل القادر چوہدری

کو جو پاکستان کی نیشنل اسمبلی کے سابق سپیکر تھے اور عبدالصبور خاں کو جو وزیر مواصلات رہ چکے تھے حکومت بنگلہ دیش نے اس شرط پر رہا کرنے کی پیشکش کی کہ وہ بنگلہ دیش کا حلف وفاداری اٹھائیں مگر آفرین ہے ان لوگوں پر جنہوں نے یہ کہکر پیش کش ٹھکرا دی کہ وہ ہمیشہ نظریہ پاکستان کے وفادار اور قائل رہیں گے۔ وہ جیل کی صعوبتوں کو برداشت کریں گے مگر اپنے عقیدہ اور نظریہ کو ہرگز نہیں بدلیں گے۔ جون ۱۹۷۳ء میں فضل القادر چوہدری قیدخانہ کے اندر رحلت فرما گئے اللہ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

۲۰ فروری کو لندن میں بھارتی ہائی کمیشن کے اندر تین نوجوان پاکستانیوں کی جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے بے حد جرأت مندانہ قدم کی خبر سنی یہ تینوں مجاہد ہائی کمیشن کی عمارت میں کھلونوں والی پستولوں سے مسلح ہو کر گھس گئے اور اس ڈرامائی انداز سے وہ دنیا کی توجہ اس انسانی مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہائی کمیشن کے سٹاف کی مشکیں کس لیں اور قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا لیکن برطانیہ کی پولیس نے ان کے اس غیر تشددانہ اقدام کو تشدد سے کچل دیا اور انیس سالہ دو نوجوانوں بشارت اور حنیف کو گولی کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا۔ اور ایک پندرہ سالہ مجاہد کو حراست میں لے لیا۔ برطانوی پولیس نے ایسا بے رحم اور غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کر کے اپنی تاریخ میں ایک سیاہ باب کا آغاز کیا ہے ورنہ برطانوی پولیس کا شیوہ ہمیشہ غیر تشدد کا رہا ہے۔ ہمارے تینوں پاکستانی نوجوانوں کا یہ قدم جائز اور دانشمندانہ تھا یا نہیں یہ قابلِ بحث ہو سکتا ہے لیکن ان کی دلیری مخلصی اور جذبۂ حب الوطنی کا ہر کسی کو قائل ہونا پڑے گا۔

ایک ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بشارت اور حنیف نے اپنا خون دے کر ہمارے خون میں حرارت پیدا کی ہے ان کے ایثار اور خلوص کو ہم سب جنگی قیدی بلکہ پوری قوم خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔ یہاں کیمپ میں ہم نے محفل قرآن خوانی منعقد کی اور دونوں شہیدوں کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعائے مغفرت کی اور اپنے پندرہ سالہ مجاہد کے حق میں

دعا کی کہ اللہ ایسے نوجوانوں کو زندہ و تابندہ رکھے اور اس کو اس قربانی کا صلہ دے۔

کسی کمزور کے ساتھ جب کوئی طاقتور زیادتی اور ناانصافی کرتا ہے تو کمزور کے لئے دو ہی راستے کھلے ہوتے ہیں، یا تو اس ناانصافی کو سہے یا اس کے خلاف جائز اور ناجائز طریق سے جدوجہد کرے۔ ناجائز ناانصافی کے خلاف صرف جائز طریقے استعمال کرنے کوئی ضروری نہیں، لوہے کو کاٹنے کے لئے لوہے کی ضرورت ہے اس لئے یہ خیال کہ ہمارے ان تین پاکستانیوں کا یہ قدم جائز یا دانشمندانہ نہ تھا بالکل غیر دانشمندانہ ہے فلسطینوں سے کی گئی ناانصافی کا بدلہ لینے کے لئے فلسطینی اور عرب گوریلا اگر قوت نہیں رکھتے تو ان کا اسرائیلی سفارتخانوں پر حملہ کیا، جہازوں کا تباہ کرنا اور میونخ جیسی وارداتوں کا ارتکاب قابل فہم بھی ہے اور جائز بھی ان واقعات سے سلگتی ہوئی چنگاریاں مستقبل میں ضرور شعلوں کی شکل اختیار کریں گی۔ ان کے بغیر دھواں سر در اکھ بنکر پورے عرب کو ہمیشہ کے لئے ایک کمزور اور پست ہمت قوم بنا کر رکھ دے گا، لیلیٰ خالد اور فلسطین عرب کے ان اِکا دُکا کارناموں میں آئندہ عرب نسلوں کی زندگی اور آزادی کے راز مضمر ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بظاہر ان واقعات کے خمیازے میں عربوں کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے کیونکہ اسرائیل ان کا بڑی بے رحمی سے بدلہ لیتا ہے لیکن قوموں کی بقاء کے لئے ایسی قربانیاں اور قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں دی گئی قربانیاں پورے نوے سال کے بعد اپنا رنگ لائیں اور اس جنگ کے عوض جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا۔ آزادی کے علمبرداروں نے جس میں مسلمان پیش پیش تھے کیا کیا خمیازے نہ بھگتے۔ کون کون سی اذیتیں نہ جھیلیں۔ ناانصافی کے خلاف ہر حربہ جائز ہے اور لندن میں ہمارے ان شہیدوں کا عمل جہاد سے کسی صورت کم نہ تھا جون ۷۲ء سے فروری ۷۳ء کے درمیانی عرصہ میں کیپٹن وید نے مجھے متعدد بار علیحدگی میں متنبہ کیا کہ اس کو اس بات کا علم ہوا ہے کہ میں ساتھیوں کو بھارتی حکام کے خلاف اور فرار کی کوشش

کے لئے اکسا تا رہتا ہوں اور یہ کہ ایسا کرنے کا نتیجہ میرے لئے خاطر خواہ نہ ہوگا۔

فروری میں میجر رائے جو کہ انٹیلی جینس کے محکمہ سے تعلق رکھتے تھے ہمارے کیمپ میں آئے۔ مجھے ایک طرف علیحدہ بلایا گیا اور مجھ سے یہ پتہ کرنے کی کوشش کی کہ ہمیں کیمپ میں کیا کیا تکالیف تھیں کس قسم کی زیادتی کی جا رہی تھی کون اس زیادتی کا ذمہ دار تھا اسکے سوالوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس بات کی تفتیش کرنے کے لئے اسے اوپر سے حکم ملا تھا اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے سوال کیا کہ کیا میں السٹرٹیڈ ویکلی کے کسی ایڈیٹر کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ میں نے جواب تو نفی میں دیا مگر یہ بھانپ گیا کہ یہ میرے بھیجے گئے خط کے سلسلے میں تفتیش ہو رہی ہے میں نے اپنے خط پر نام درج نہ کیا تھا بلکہ خط گمنام تھا اور گوالیار کے بجائے کہیں باہر سے پوسٹ کروایا تھا پھر اس نے سوال کیا کہ کیا تم ہندی لکھنا جانتے ہو میں نے مثبت میں جواب دیا اور اس نے ایک کاغذ پر مجھے ہندی میں کچھ لکھنے کے لئے کہا۔ میں نے بدلا کر اور مختلف انداز میں کچھ دیا ظاہر تھا کہ وہ چیلوں کے ذریعے بھیجے گئے۔ پیغاموں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے مجھے متنبہ کیا کہ آئندہ میں کیمپ میں محتاط ہو کر رہوں اور غیر ضروری طور پر بھارتی فوج کے رویہ کے خلاف شکایتیں کرنا بند کر دوں، چند روز اور یوں ہی گزر گئے UNEVENTFUL زندگی میں اداسی محسوس ہونے لگتی ہے ایکدن غسلخانہ میں گیا تو خیال آیا کہ کافی دنوں سے کوئی خاص کھینچا تانی نہیں واپس آتے ہی ایک عدد رقعہ بنایا جس میں یوں ہی دوسرے کیمپ والوں کی طرف ہدایت تھی کہ اس رات کو بارہ بجے کے قریب فرار کے لئے تیار رہیں سرنگ تیار ہو چکی ہے اور وہ رقعہ میں نے غسلخانے سے باہر سڑک پر پھینک دیا۔ رات بارہ بجے کے قریب گروپ کمانڈر سے لیکر نیچے تک سب افسر بمعہ کافی فوجیوں کے بیرک میں آدھمکے ہمیں اٹھا کر باہر فال ان کر لیا گیا۔ پوری بیرک کی تفصیل سے تلاشی لی گئی لوہے کے موٹے ڈنڈوں سے پوری بیرک کے ہر ایک سیل کو بجایا کھٹکایا کہ سرنگ کا سراغ لگائیں کوئی ہوتی تو ملتی رات کا بیشتر حصہ اسی رونق میں گزر گیا۔ گروپ کمانڈر بمعہ اپنی پارٹی کے مایوس واپس

لوٹا، ہماری تو خیر تھی ان کو بھی بیزاری کی رات گزارنی پڑی. کسی کیمپ میں قیدی نقب لگا کر فرار ہو گیا ہو گا اسی لئے اتنی تفصیل سے تلاشی ہوئی ہے نہیں یہ محض احتیاطی تدابیر ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی قیاس آرائیاں اصل وجہ کا کسی کو پتہ نہ چل سکا اگر لگ جاتا تو میری گت بنتی۔

۱۲ مارچ کو ہمارے کیمپ نمبر ۶۱ کے جوانوں کے کیمپ میں ایک سپاہی نے خودکشی کر لی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں اس کے بھائی کو قتل کے الزام میں پھانسی دیدی گئی تھی چنانچہ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا اور بیرک کے ساتھ غسلخانے میں رسی کا پھندہ چھت کے ساتھ باندھ کر اپنے گلے میں ڈال لیا نیچے سے کرسی کو پاؤں سے ٹھوکر لگا کر گرا دیا اور جاں بحق ہو گیا۔

مارچ ۷۳ء کے وسط سے ریڈیو پاکستان سے ہمارے ادیبوں، صحافیوں، آرٹسٹوں موسیقاروں اور اداکاروں کے پیغامات بھارت کے انہی پیشہ وروں اور دانشمندوں کے نام نشر ہونے شروع ہوئے۔ ان میں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، روشن آرا بیگم اور دیگر کافی خواتین و حضرات شامل تھے اگرچہ ایسی نشریات کا بنیادی تصور اچھا تھا اور بیشتر بولنے والوں نے بڑے موثر انداز میں جنگی قیدیوں کی مسلسل نظربندی کے خلاف بھارت کے قلم کاروں اور اداکاروں کو آواز بلند کرنے کی ترغیب اور اپیل کی، لیکن بعض کے طرز تکلم میں اس قدر ملتجانہ رویہ تھا جو بھیک مانگنے کے مترادف تھا قیدیوں کے اہل و عیال کی زبوں حالی۔ ان کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کے شکستہ دلوں اور بھیگی آنکھوں کے واسطے دلا کر اپیل کرنے کے انداز کو سن کر مجھے افسوس ہوا اسی طرح اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کرٹ والڈ ہائم کے پنڈی کے دورہ پر ہوائی اڈے پر قیدیوں کی بیویوں اور بچوں کی احتجاجی گریہ زاری یا صدر بھٹو کے پاس جا کر قیدیوں کی بیگمات کی اشک بہاتی اور نیشنل اسمبلی کے باہر قیدیوں کے اہل و عیال کے احتجاجی جلوس میری نظر میں ہماری قومی روایات کے شایان شان باتیں نہ تھیں ایسی خبروں سے افسوس ہوتا۔ ویسے تو ہم قومی مفاد کی خاطر جان دینے کی ڈھینگیں مارتے ہیں لیکن قوم کے کچھ افراد کو ایسی بے صبری اور بے حوصلگی کا مظاہرہ کرنے

سے روکنا بھی تو ہماری قوم کا فرض ہے تاکہ صحت مند روایات کی بنیادیں رکھیں اس میں شک نہیں کہ ہماری مسلسل نظر بندی سے ناانصافی اور انسانی قدروں کی پامالی ہو رہی تھی لیکن خود دار قوموں کے عوام کٹھن وقتوں میں صبر کا دامن نہیں چھوڑا کرتے وہ انصاف کی بھیک مانگنا نہیں جانتے بلکہ انصاف چھیننا سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ زیادہ تر قیدیوں کے اہل و عیال نے صبر و ہمت کا مظاہرہ کیا، ان کا دل اور زبان یہ کہہ رہے تھے کہ ان قیدیوں کی خاطر قومی مفاد کی سودا بازی نہیں کی جانی چاہیے، وہ اپنے عزیزوں کی فرقت کو سہیں گے مگر ملک کی عزت و وقار پر آنچ نہ آنے دیں گے، یہی درست راہِ عمل تھی صدر بھٹو کو قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ پیش کرنا نامناسب عمل تھا کیونکہ ان سے زیادہ شاید ملک میں کسی کو ہماری رہائی کی فکر نہ ہو سکتی تھی۔

مارچ ۷۳ء کے تیسرے ہفتہ کی بات ہو گی کیپٹن وید نے حکم دیا کہ آئندہ جو کوئی بھی کیمپ کے دفتر کی طرف لے جایا جائے گا وہ دفتر کے باہر لٹکے ہوئے بھارتی ترنگے جھنڈے کو سیلوٹ کرے گا۔ یہ نامناسب حکم تھا اور جنیوا کنونشن کی دفعات کے خلاف۔ خود بھارتی افسر اور جوان وہاں سے گزرتے ہوئے کبھی سیلوٹ کرتے نہ دیکھے گئے تھے ان کو بتایا گیا کہ یہ نامناسب اور ناروا حکم ہے مگر وہ ایک نہ مانے۔ میں نے آئندہ روز انٹرنیشنل ریڈ کراس کے نام اس ناروا حکم کی منسوخی کے لئے کمانڈنٹ کو درخواست دی، درخواست آگے کیا جانی تھی، گروپ کمانڈر کو پتہ چلا تو وہ خود کیمپ میں آیا اور وید کے حکم کو منسوخ کر گیا۔ اگرچہ ہمیں ہر کسی کے ملک کے جھنڈے کی تعظیم ملحوظ رکھنی چاہیئے خواہ وہ دشمن کا جھنڈا ہی کیوں نہ ہو لیکن ایسے حکم سے محض تعظیم کرانی منظور نہ تھی بلکہ ہماری خودداری اور عزت کو ٹھیس پہنچانے کا جذبہ کار فرما تھا۔

مارچ ۷۳ء کے وسط میں فرار پارٹی کی ایک خفیہ میٹنگ میں فرار کی ایک نئی سکیم پر غور کیا گیا تدبیر کی کامیابی کے مواقع زیادہ نہ تھے لیکن اس کڑی نگرانی میں شاید صرف یہی ایک تدبیر کارگر ثابت ہو سکتی تھی، ہر تین چار ماہ بعد ہمیں سٹور میں لے جایا جاتا جہاں ہمارا فالتو سامان

اور بکس رکھے گئے تھے اس سٹور میں جانے کے لئے ہماری بیرک کے ارد گرد لگی ہوئی کانٹے دار تار کی باڑوں سے باہر جانا پڑتا کیونکہ سٹور نواحی بیرک جس میں بھارتی گارڈ رہتی تھی اس کا آخری کمرہ تھا۔ سٹور کے اندر پچاس ساٹھ سوٹ کیس ٹرنک اور تیس چالیس بستر بند میں لپٹی ہوئی چیزوں کے ڈھیر تھے چنانچہ وہاں سے ہم اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں لے کر آیا کرتے اب چونکہ سردیاں ختم ہوگئیں تھیں ہمیں اپنے سویٹر اور کمبل سٹور میں رکھنے تھے اور وہاں سے ایک آدھ تولیہ وغیرہ لانا تھا۔

ہمیں جب سٹور میں لے جایا جاتا تو باہر مزید گارڈ متعین کر دی جاتی۔ ماضی میں لے جاتے وقت کچھ لاپرواہی سے گن کر لے جانے اور واپس لانے کی ڈرل بھی ہوا کرتی عموماً ہر روز پندرہ بیس افسروں کو ٹولیوں میں لے جایا جاتا۔ طے یہ پایا کہ جب اب لے جایا جاوے تو دو عدد افسروں کو سٹور میں بستروں اور صندوقوں کے پیچھے چھپا دیا جائے، واپسی پر گنتی اگر معمول کے مطابق لاپرواہی سے ہوتی تو کام بننے کی توقع تھی۔ ان دونوں افسروں کو شام تک سٹور کے اندر ہی چھپا رہنا تھا دھندلکا ہونے پر غیر نشان دہ کپڑے پہننے کے بعد انہوں نے سٹور کے عقب والی کھڑکی سے نکل کر بڑی خود اعتمادی سے چل کر فرار کی راہ اختیار کرنی تھی۔

صبح نو بجے سے شام تک دو عدد رول کالیں ہوتی تھیں اور ان رول کالوں میں دونوں کی فالتو گنتی کرانے کا بندوبست کرنا تھا ماضی میں اگر ہم میں سے کوئی بیمار ہوتا تو وہ رول کال کے وقت فال ان نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ چندر بہادر یا حوالدار ستندر سنگھ انہیں کمرے میں آن کر دیکھ جایا کرتا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اگر کوئی بیمار چارپائی پر مچھر دانی کے اندر چادر تان کر لیٹا ہو تو بھارتی گننے والا اس کی چادر ہٹا کر دیکھتا ہے یا یونہی دور سے دیکھنے سے اس کی تسلی ہو جاتی ہے ہم نے چند روز اپنے ساتھیوں کو بیمار بنا کر مچھر دانیوں کے اندر لٹایا لیکن صوبیدار چندر بہادر یا ستندر سنگھ نے کبھی بھی چادر الٹ کر نہ دیکھا بلکہ برآمدے میں کھڑے کھڑے ہی اپنی تسلی کر لیتا رول کال کے وقت اکثر یوں ہوتا کہ لیفٹننٹ کرنلوں کو گننے کے بعد

فال آؤٹ کروا دیا جاتا اس کے بعد جونیئر افسروں کی گنتی ہوا کرتی منصوبہ یہ تھا کہ اگر ہمیں پہلے چھوڑ دیا گیا تو میں اور کرنل شریف جلدی سے بیرک کے اندر آ کر ان دونوں کے بستروں میں گھس جائیں گے اور ہاتھ ذرا چادر سے باہر لٹکا لیں گے تاکہ اسے دور ہی سے مکمل اعتبار ہو جائے اور شک کی کوئی گنجائش نہ رہے اور نہ ہی انہیں چادر اٹھا کر دیکھنا پڑے۔

چونکہ اس تدبیر کا خاکہ کیپٹن سلیم نے پیش کیا تھا اور وہ خود اس کوشش پر عمل پیرا ہونے کے لئے بہت خواہشمند تھا اس لئے مناسب یہی تھا کہ اسے موقع دیا جائے۔ کیپٹن ذاکر نے اس کا ساتھ دینے کی پیش کش کی۔ اس کے علاوہ بھی چند افسر اس کوشش میں حصہ لینے کے خواہشمند تھے، کیپٹن جاوید جلال الدین بڑا بے چین تھا مگر دو سے زیادہ کو وہاں سٹور میں چھپانا ممکن نہ تھا، سلیم اور ذاکر نے بڑی جوانمردی اولوالعزمی اور جرأت کا ثبوت دیا، جب کامیابی کے مواقع زیادہ روشن نہ ہوں تو ایسے کام میں ہاتھ ڈالنے کے لئے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے ان نوجوان افسروں میں یہ احساس تھا کہ فرار کی کوشش ہمارا فرض ہے اور فرض کی ادائیگی کے لئے صریح کامیابی ضروری امر نہیں ہے اپنی طرف سے پوری احتیاط سے تدبیر پر عمل پیرا ہونا چاہیئے باقی جو اللہ کی مرضی۔ اگر ناکامی بھی ہوئی تو جذبۂ جدوجہد کی تشنگی تو بجھے گی۔ شام کے دھندلکے میں سٹور سے نکل کر باہر کے گیٹ سے گزرنے تک پکڑے جانے اور گولی لگنے کا بھی خطرہ ہو سکتا تھا لیکن کیا محض گولی کے ڈر سے کوئی جائز کوشش کرنا غلط ہے۔

کیپٹن سلیم ایک فوجی کنبہ سے تعلق رکھتے ہیں اور موروثی جنگی قیدی ہیں ان کے دادا پہلی جنگ عظیم میں ترکی میں جنگی قیدی بنا لئے گئے وہ رسالدار میجر کے عہدہ پر فائز تھے کیپٹن سلیم کے والد دوسری جنگ عظیم میں شمالی افریقہ میں قیدی بنے جہاں سے ان کو اٹلی لے جایا گیا قید سے انہوں نے پانچ دفعہ فرار ہونے کی کوشش کی لیکن ہر دفعہ دوسرے شہروں تک پہنچنے کے بعد پکڑے گئے آخر چھٹی دفعہ بھاگے اور فرانس میں اتحادی فوجوں کے کیمپ میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں سے ان کو لندن بھجوا دیا گیا ان کے گھر والوں کا خیال تھا کہ وہ مارے

گئے ہیں کہ ایک دن بغیر اطلاع دیئے وہ اپنے گاؤں میں آوارد ہوئے کتنی خوشی ان کے گھر والوں کو ہوئی ہوگی۔ سلیم اکثر کہا کرتا کہ میرے والد نے چھ مرتبہ فرار کی کوشش کی تھی اور میں صرف تا حال ایک ہی کی ہے۔

مجھے اپنی خاندانی روایات برقرار رکھنے کے لئے ہی کم از کم دو تین اور کوششیں کرنی چاہییں کیپٹن ذاکر بلتستان کا رہنے والا ہے جہاں وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور ادب کا دلدادہ ہے وہاں اس میں ایک عمدہ سپاہی کی خصوصیت کی کسی لحاظ سے کمی نہیں۔

آئندہ چند روز ہم نے شام کے وقت سنتریوں کی نقل و حرکت کو نوٹ کرنے پر صرف کئے مختلف قسم کے سگنل آپس میں مقرر کئے تاکہ جب یہ دونوں کمرے کے اندر بند ہوں تو شام پڑنے کے بعد ایسے موزوں وقت پر ان کو بتایا جا سکے جس وقت باڑوں کے باہر سی آر پی کے جوان نہانے اور کھانے کے لئے ٹولیوں میں جا رہے ہوں تاکہ وہ اس وقت باہر نکلیں مثلاً گھی کے ٹین کو زور سے بجانے سے ان کو یہ اشارہ ملے۔ اسی طرح خطرہ کا الارم مقرر کیا گیا۔

۳۰ مارچ ۷۳ء کو پندرہ افسر سٹور میں اپنا سامان رکھنے اور واپس لے جانے کیلئے لے جائے گئے اس میں ہمارا کوئی ساتھی نہ گیا اور ہم نے ان کے لے جانے اور واپس لانے کی تمام تر تفصیل کو بغور دیکھا۔ چیکنگ اور گنتی بڑی لاپرواہی سے کی گئی اس لئے کامیابی کے مواقع روشن نظر آنے لگے۔

آئندہ روز فرار پارٹی کے دس افسروں کو سٹور میں جانے کے لئے تیار کیا گیا۔ انکے علاوہ پانچ دوسرے افسروں کو بھی جانا تھا جن کو اس منصوبے کی بالکل خبر نہ تھی باقی پورے کیمپ میں اس کی کسی کو خبر تک نہ ہوئی کل پندرہ افسروں نے جانا تھا اس کے علاوہ اپنے دو مزید افسروں کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ بھی چپکے سے ساتھ ہولیں تاکہ اگر جاتی دفعہ پندرہ کی بجائے سترہ افسر نکل جائیں تو واپسی پر گنتی کے وقت دو کے غائب ہو جانے کا علم نہ ہو سکے۔

۳۱ مارچ کی صبح کو بڑا تذبذب تھا میری دلی دعا تھی کہ کس طرح یہ دونوں فرار میں کامیاب

ہوجائیں تو بھارتی حفاظتی تدابیر کی ناکامی سے کتنی خوشی ہو۔ اس بات سے میں بخوبی واقف تھا کہ ان کے کامیاب فرار کے بعد ہمیں باز پرس اور سخت سزا ہوگی مگر اس کے لئے ہم تیار تھے ہم بارہ افسروں نے اس روز صبح ناشتے کے وقت ان کو اپنی پوڑی کے علاوہ ایک ایک فالتو پوڑی کھلائی اور باقی دس پوڑیوں کو ایک لفافے میں ڈال کر بند کر دیا یہ پوڑیاں سٹور میں رکھی جانی تھیں، تاکہ دونوں کے لئے دوپہر کا کھانا اور شام کے کھانے کا کام دے سکیں۔ سادہ پانی کی دو بوتلیں سلیم کی پرائیوٹ رضائی میں لپیٹ دی گئیں رضائی سٹور میں رکھنی تھی۔ مجھے اپنے بکس میں سے دو جوڑے سول کپڑوں کے نکال کر ایک کونے میں چھپانے تھے اور ان کے ساتھ وہ ٹائیلٹ سوپ کی چاکی بھی جس میں میں نے بھارتی کرنسی نوٹ چھپا رکھے تھے۔

دس بجے صبح ہماری پارٹی نکلی صوبیدار چندر بہادر اور حوالدار ستندر سنگھ نے ہمیں لے جانا تھا کیج کے دروازے پر میں نے رجسٹر میں اپنا نام درج کیا اور ساتھ لکھا کہ میرے ہمراہ چودہ افسر جا رہے ہیں۔ تجویز کے مطابق پندرہ کی بجائے ہم سترہ افسر چل پڑے کسی نے گننے کی کوشش نہ کی سٹور کی طرف ہم آدھ راستہ گئے ہوں گے کہ چندر بہادر نے یوں ہی ہمیں چلتے چلتے گنتے ہوئے کہا کہ صاحب ادھر تو سترہ افسر آ گئے ہیں آخری دو کو میں نے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ آپکی باری کل آئے گی سٹور میں ہم سب اکٹھے جا گھسے سٹور کے پیچھے کھڑکی کی طرف بھی دو تین سنتری کھڑے تھے جو کھڑکی کے شیشوں میں سے اندر ہمیں دیکھ سکتے تھے کیپٹن ظفر سعید اور لیفٹننٹ منیر نے بستر اٹھا اٹھا کر کھڑکی کے سامنے لگانے شروع کر دیئے تاکہ ان کو اندر کچھ نظر نہ آ سکے۔ میں نے کپڑے نکالے ایک پتلون میجر غلام رسول سیاہی سے لی ان کو اور پوڑیوں کے بنڈل کو ایک طرف چھپایا باقی نے ملکر سلیم اور ذاکر کو دو کونوں میں بٹھا کر ان کے سامنے اور اوپر سوٹ کیس اور بستر رکھ دیئے باقی پانچ افسر جن کو اس منصوبے کا علم نہ تھا وہ اپنے صندوق برآمدے میں لے جا کر اپنی چیزیں نکالنے اور رکھنے میں مشغول تھے

دس بارہ منٹوں میں سب نے اپنا اپنا کام ختم کیا اور ہم سب برآمدے میں واپس جانے کے لئے کھڑے ہو گئے سٹور کو چندر بہادر نے تالا لگایا اور ہم کو واپس لیکر وہ اور حوالدار ستندر سنگھ

چل دیئے پہلا مرحلہ کامیابی کے ساتھ طے ہو چکا تھا۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اللہ کرے گا تو باقی مراحل بھی کامیابی سے طے ہوتے چلے جائیں گے چلتے چلتے صوبیدار چندر بہادر ستندر سنگھ سے بولا کہ یہ تو تیرہ افسر ہیں ستندر سنگھ نے جواب دیا کہ وہ جو دو واپس کر دیئے تھے اس لئے تیرہ رہ گئے ہیں جتنے آئے تھے سب کے سب واپس جا رہے ہیں سٹور میں تو اب کوئی افسر نہیں تھا۔ آپکو گننے میں غلطی ہو گئی اور چندر بہادر کچھ منہ میں بڑبڑا کر خاموش ہو رہا۔ ہم واپس کیمپ کے اندر آ گئے لیکن چندر بہادر کی بے چینی ختم نہ ہوئی۔

ہم نے واپس پہنچتے ہی سلیم اور ذاکر کی چارپائیوں پر مچھر دانی لگائی، بستر پہ کمبل اس طرح گول کر کے رکھے اور اوپر چادر تان دی جیسے دونوں سوئے ہوئے ہوں اس سے تین روز پہلے سے دونوں نے بیماری کا بہانہ کر کے رول کال پر فال ان ہونا بند کر دیا ہوا تھا گیارہ بجے کی رول کال کا وقت ہو چکا تھا سیٹی بجائی گئی ہم سب باہر صحن میں فال ان ہو گئے تا حال کیمپ میں اپنے دوسرے افسروں کو بھی علم نہ ہو سکا تھا کہ دونوں غائب ہیں وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ بیماری کی وجہ سے وہ دونوں لیٹے ہوئے ہیں، چندر بہادر نے گنتی کی اس دن لیفٹنٹ کرنلوں کو پہلے نہ چھوڑا گیا اس لئے میں اور شریف تو جا کر اندر ان کی جگہ لیٹ نہ سکے لیکن اندر کمبلوں سے خاطر خواہ بندوبست کر دیا گیا تھا دو افسر گنتی میں کم نکلے تو چندر بہادر نے ان کے متعلق پوچھا ہم تو خاموش رہے لیکن جن کو اس بات کا علم نہ تھا یکے بعد دیگرے کہنے لگے کہ وہ سامنے چارپائی پر ذاکر صاحب ہیں ان کی طبیعت خراب ہے اور وہ چار نمبر کمرے میں سلیم صاحب لیٹے ہوئے ہیں۔ اس نے ستندر کو کمروں میں دیکھنے کے لئے بھیجا۔ ستندر سنگھ چار نمبر کمرے میں آیا۔ دونوں کو مچھر دانی کے اندر لیٹا دیکھ کر واپس لوٹنے ہی والا تھا کہ اسے نہ جانے کیوں خیال آیا کہ وہ آگے بڑھا اور مچھر دانی کے اندر ہاتھ ڈال کر چادر کو ذرا ہٹاتے ہوئے صاحب۔ صاحب کہہ کر پکارا۔ وہاں صاحب ہوتے تو جواب دیتے، کمبل تو بول نہ سکتے تھے، ستندر سنگھ نے چادر ہٹائی کمبل پرے پھینکا اور شور مچاتا ہوا باہر نکلا کہ اندر نہیں ہیں وہاں کمبل لیٹے ہوئے ہیں غسلخانوں اور ٹٹی خانوں میں دیکھا

گیا۔ چارپائیوں کے نیچے دیکھا۔ ہر طرف سنسنی مچ گئی۔ سیٹیاں بجنے لگیں الارم بج گیا مزید سنتریوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ افسر دوڑتے ہوئے آئے۔ چندر بہادر اور ستندر سنگھ سٹور کی طرف لپکے۔ کام بگڑ گیا تھا ان کے ساتھ اور بھارتی مسلح فوجی بھی سٹور کی طرف بھاگے۔

سلیم اور ذاکر کو میں نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ معلوم ہو جانے پر انہیں خود کو بغیر کسی مزاحمت کے اپنے آپ کو سنتریوں کے حوالے کر دینا چاہیے، کیونکہ مزاحمت اور تشدد جنیوا کنونیشن کے خلاف تھا۔ سیٹیوں کی آواز سن کر ذاکر اور سلیم دونوں کونوں میں بیٹھے ایک دوسرے سے گویا ہوتے کہ بلی تھیلے سے نکل گئی ہے۔ سٹور کا دروازہ کھلنا تھا کہ دونوں پکڑے گئے، ستندر سنگھ نے آؤ دیکھا نا تاؤ دونوں کو زود کوب کرنا شروع کیا ان کو بری طرح پیٹا۔ سلیم چونکہ مضبوط اور طاقتور تھا اس لئے اس کا تو گریبان پھاڑنے پر اکتفا کیا، لیکن ذاکر کو پانچ چھ نے ملکر خوب مارا اور دونوں کو گھسیٹتے ہوئے باہر لاتے ہم سب خاموش ہوتے سب کچھ دیکھ رہے تھے، دونوں میں سے کسی نے بالکل مزاحمت نہ کی لیکن اس کے باوجود ان کو پیٹا جانا سراسر جنیوا کنونیشن کے خلاف تھا سب بھارتی عہدیدار لعن طعن کرنے میں مصروف تھے سوائے انسپکٹر جے دیال سنگھ کے جو سی آر پی کا انچارج تھا وہ دونوں افسروں کو مخاطب ہو کر بولا۔ میں ایک راجپوت ہوں۔ آپ دونوں نے بڑی جوانمردی اور بہادری کا مظاہرہ کیا ہے اور آپ کی کوشش قابل تعریف ہے۔ میں آپ کے جذبے کی بیحد قدر کرتا ہوں اتنے میں کیپٹن یادو اور میجر چوان بھی آگئے دونوں کو ہتھکڑیاں لگا کر لے گئے ان کو چارج پر رکھا گیا اور پندرہ پندرہ روز کی قید تنہائی کی سزا دی گئی اور ہمارے پہلے والے کیمپ کے سٹور روم میں بند کر دیا گیا۔

سٹور کے اندر بھی دونوں کو دن رات ہتھکڑیوں میں جکڑے رکھا ان کو اس تکلیف دہ انداز سے ہتھکڑی لگائی کہ دونوں کے داہنے ہاتھوں کو اکٹھا جکڑا گیا دونوں نہ ٹھیک طرح سو سکتے نہ پہلو بدل سکتے اور نہ ہی نماز آسانی سے پڑھ سکتے یہ سراسر جنیوا کنونیشن کی خلاف ورزی تھی۔

پہلے دن جب ان کو لے کر گئے تو ہمیں علم تھا کہ اول تو پہلے تین دن صرف ایک سوکھی روٹی

دیں گے اور دوسرے پہلے چوبیس گھنٹے کے دوران بالکل بھوکا رکھا جائے گا چنانچہ کسی تدبیر کا نکالنا ضروری تھا ان کا کمبل تولیہ بالٹی اور شیو کا سامان تو جانا تھا میں نے کرافٹ چیز (پنیر) کا ڈبہ لیا اور اس کو کاٹ کر دو نہانے والی صابن کی ٹکیاں بنائیں دو نئے لکس صابن لئے کاغذ میں اصلی صابن نکال کر سفید پنیر سے بنائے ہوئے صابن ان کے اندر رکھ دیئے اور ان کو صابن دانیوں میں رکھ دیا پھر ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوبوں میں سے ساری ٹوتھ پیسٹ نکال کر ان کی جگہ گاڑھا دودھ بھر دیا۔

جب بھارتی این سی او سامان لینے آیا تو وہ چیزیں ان کے حوالے کر دیں۔ جب وہ نہانے لگے تو ذاکر صابن جسم پر مل کر تعجب کرنے لگا کہ یہ کیسا صابن ہے اس کی جھاگ ہی نہیں بنتی۔ لیکن جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ یہ تو پنیر کی ٹکیہ ہے بھوک سے ان کی جان تو نکلی جا رہی تھی۔ دونوں نے فوراً پنیر کی ٹکیاں ہڑپ کر لیں دانت صاف کرنے لگے تو میٹھے دودھ کا مزہ آیا چنانچہ دونوں کو یوں کھانے کو کچھ مل گیا۔

آئندہ روز سے انہیں باقاعدگی سے کھانا بھیجا جانے لگا ان کا کھانا ہمارے کیمپ سے جایا کرتا تھا چنانچہ ہر وقت کے کھانے میں گھی زیادہ ڈال کر بھیجا جاتا چپاتیوں کے اندر ہلکا سا گھی لگایا جاتا ایسا کرنے کا صرف اتنا مدعا تھا کہ ان دونوں کو یہ محسوس رہے کہ ان کے آڑے وقت میں بھی ہم سب کو ان کا خیال ہے اور اس طرح ان کا حوصلہ بلند رہے یہ بالکل معمولی اقدام تھے۔ نہ تو ان سے ان کی خوراک کی غذائیت بڑھ سکتی اور نہ ہی مزے میں زیادہ فرق پڑتا تھا ان کی واپسی پر انہوں نے میرے خیال کی تصدیق کی کہ ان اقدام سے بلاواسطہ طور پر ان کا ہم سب سے رابطہ قائم رہا جو تسکین کا سبب بنا۔ انکا ویسا ہی اثر تھا جیسا کسی غمزدہ کو افسوس کا خط لکھنے کا ہوتا ہے کچھ بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے یا جیسے بیمار کی مزاج پرسی سے بیمار پر اچھا اثر پڑتا ہے اس کے علاوہ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں لیکن سوچنے سے دماغ میں کئی تدبیریں آہی جاتی ہیں ان کا حال پوچھنے کے لئے اور ریڈیو کی خبریں مختصر طور پر دینے کے لئے کسی طرح کی خط و کتابت کا سلسلہ قائم رکھنے کی ضرورت تھی ایک مختصر رقعے میں خبریں قلمبند کی گئیں ان کی بلند ہمتی کی داد

دی گئی اور صبر و ہمت کا دامن تھامے رکھنے کی تلقین کی گئی رقعے کو پولیتھین کے کاغذ میں پیٹا اور اسے صبح کے ناشتے کے وقت پوڑی کے پیڑے کے اندر لپیٹ کر پوڑی تلوائی اور وہ انکو بھیج دی گئی دو روز بعد ان کی طرف سے بھی احوال معلوم کرنے کے لئے رقعے میں ان کو ہدایت دی کہ دیئے ہوئے کوڈ کو استعمال کر کے سالن والے سلور کے ڈبے کے نیچے اپنا حال تحریر کریں کیا ان کو ایک کمرے میں رکھا گیا ہے یا علیحدہ علیحدہ اگر ایک میں ہیں تو A لکھیں اگر علیحدہ علیحدہ ہیں تو B لکھیں ہتھکڑی لگی ہوتی ہے یا نہیں. کھانا ٹھیک مل رہا ہے یا نہیں باہر دو گھنٹے کے لئے نکالتے ہیں یا نہیں وغیرہ وغیرہ. یہ رقعہ بھی پوڑی میں بھرتی کر کے بھیجا گیا کھانے کی تلاشی لیکر کھانا ان کو دیا جاتا تھا بد قسمتی سے تلاشی لینے والے نے پوڑی دھوپ میں دیکھی تو اسے ایک غیر معمولی چیز جھانکتی نظر آئی توڑا تو رقعہ برآمد ہوا رقعے میں میں نے از طرف کڑا کا لکھا ہوا تھا یہ ذاکر کا کیمپ میں دیا گیا نام تھا کیونکہ جب وہ شطرنج کھیلنے بیٹھتا تو اپنے حریف کو اکثر کہا کرتا کہ تمہارا کڑا کا نکال دوں کیپٹن پوار نے پوچھنے کے لئے آدمی بھیجا کہ فوراً بتائیں یہ رقعہ کس نے بھیجا ہے ورنہ پورے کیمپ کو سزا دی جائے گی.

معاملہ تو گڑبڑ ہو چکا تھا اسے چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا میں نے اسے کہلا بھیجا کہ میں نے بھیجا ہے اگرچہ دونوں کو پندرہ روز کی سزا دی گئی تھی مگر اسی روز انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ سزا کو گھٹا کر آٹھ روز کر دیا جائے اس کے علاوہ اس سے ایک روز پیشتر ان کی ہتھکڑیاں اتار دی گئی تھیں بد قسمتی سے اسی روز ان کے آٹھ روز مکمل ہو رہے تھے ہمیں سزا میں اگر اس کمی کا علم ہوتا تو رقعہ بھیجنے کی کوشش ہی نہ کرتے. خیر. رقعے کی پاداش میں ان کی دو دن کی سزا بڑھا دی گئی اور اسی روز پھر انہیں ہتھکڑیاں لگا دی گئیں.

یکم اپریل کو جب ان کو سزا دی گئی تھی میں نے کمانڈنٹ کا انٹرویو لیا اور اس کو میں نے دونوں کی سزا کے دوران جنیوا کنونشن کے مطابق سلوک روا رکھنے کی یاد دہانی کرائی اس کے علاوہ ستندر سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی زیادتی پر شدید احتجاج کیا اس نے مجھے بتایا

کہ وہ لیفٹننٹ کرنل غفور کو بھی چارج پر رکھنے کا ارادہ رکھتا ہے کیونکہ بحیثیت سنیئر اور نمائندہ افسر اس نے صوبیدار چندر بہادر کو رول کال کے وقت غلط رپورٹ دی تھی کہ دو افسر کمرے میں بیمار لیٹے ہوئے ہیں میں نے اسے بتایا کہ اس میں کرنل غفور بالکل بے قصور ہیں اور یہ حقیقت بھی تھی کہ ان کو آخری وقت تک اس ساری مہم اور ماجرے کا علم نہ تھا اور وہ اسی خیال میں تھے کہ دونوں کی طبعیت واقعی خراب ہے میں نے اس کو بتایا کہ اس ساری مہم کا ان دو افسروں کے علاوہ مجھے علم تھا اگر وہ ضروری سمجھتا ہے تو ان کے فرار میں مدد دینے کے جرم میں وہ مجھے سزا دے سکتا ہے آئندہ چند روز میں بلاوے کا انتظار کرتا رہا مگر مجھے نہ بلایا گیا اور نہ سزا دی گئی۔

آخر دس اپریل کو یعنی گیارہ روز کے بعد سلیم اور ذاکر واپس کیمپ میں پہنچے ہم نے ان کا پرزور خیر مقدم کیا۔ شام کے وقت ہم نے مل کر کھانا کھایا ان دونوں کے لئے دستور کے مطابق پراٹھے تیار کروائے گئے ایک محفل سی ہو گئی جس میں دونوں نے اپنے اپنے تاثرات بیان کئے کہ وہاں قید تنہائی میں رہنے کے بعد یہ کیمپ تو گھر کی طرح محسوس ہوتا ہے از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است والا مقولہ ٹھیک بیٹھتا ہے پوری کہانی ان کی زبانی سنی۔ سب نے خوب قہقہے لگائے ذاکر نے وہاں بھی کافی غزلیں اور مزاحیہ نظمیں لکھی تھیں وہ اس نے سنائیں ہر کوئی بے حد محظوظ ہوا۔ اس تکلیف اور مصیبت سے گزرنے کے بعد دونوں پہلے سے کہیں زیادہ پر عزم دکھائی دیتے تھے ہم سب کو ان کی کارکردگی پر فخر تھا۔

مشکلات اور مصیبتیں عزم اور یقین کے پودوں کے لئے کھاد کا سا کام دیتی ہیں، لیکن اسی صورت میں جبکہ انسان کا ان کی بابت ذہنی رویہ درست ہو ان سے گھبرانے کی بجائے ان سے مقابلہ کرنے کا جذبہ رکھتا ہو ورنہ یہ کھاد کی بجائے آگ کی طرح انسان کو جھلسا دینے کی بھی قوت رکھتے ہیں ان سے فرار تباہی کا موجب بنتا ہے اور ان سے پیکار فتح اور کامرانی کا سہ

جنت تیری پنہاں ہے ترے خون جگر میں ∴ نیچے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

مجھے یقین ہے کہ سلیم اور ذاکر اپنی آئندہ زندگی میں اس ناکام لیکن جرأت مندانہ عمل سے تقویت حاصل کرتے رہینگے اور ماضی کی ان مشکلات کو جوانمردی سے سہنے کا خیال انکو تقویت پہنچاتا رہیگا اور مشکلات کے باوجود اپنے فرض کے پورا کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں گے۔

## ۲۱

دس اپریل کو تلاشی ہوئی اور میری ایک عدد کاپی، جس میں بھارتی حکام کی زیادتیوں اور جنیوا کنونیشن کی خلاف ورزیوں کا ذکر تھا اور جس میں ان کے رویئے پر تنقیدی نوٹ اور چٹ پٹے جملے تھے پکڑی گئی یہ کاپی بمعہ دوسری کاپیوں کے اور ایک عدد یادداشت (AID MEMOIR) جو میں انگریزی میں لکھ رہا تھا وہ لے گئے۔ اس یادداشت میں میں نے ہر روز کی گئی جنیوا کنونیشن کی خلاف درزیوں کا ذکر کیا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ آئندہ ہونے والی خلاف ورزیوں کو ساتھ ساتھ لکھتا جاؤں گا اور مستقبل کی کسی تاریخ کو کیمپ حکام اور انٹرنیشنل ریڈ کراس کو دوں گا تاکہ وہ فرصت کے اوقات میں اسے پڑھ کر اپنے کئے پر نادم ہوں۔ ہفتہ عشرہ کے بعد فارسی اور پشتو کی کاپیاں تو واپس آگئیں مگر وہ کاپی اور یادداشت ضبط کرلی گئی۔ کاپی چونکہ اردو میں تھی اس لئے وہ انٹیلی جنس برانچ کو بھیجدی گئی۔ دو ماہ یوں ہی گزر گئے اس دوران صرف اتنا سنا میں آیا کہ منصور نے اپنی ڈائری میں بھارتی حکام کے خلاف بہت سی تہمتیں لگائی ہیں۔ کاپی میں ہمارے خطوط پھاڑنے کی شکایت بھی تھی چنانچہ کچھ عرصہ بعد ہمیں خط زیادہ تعداد میں اور ذرا باقاعدگی سے ملنے شروع ہوگئے۔ ان کے راشن کھانے اور موٹے ہونے پر تبصرہ تھا۔ راشن زیادہ ملنے لگا۔ پھلوں کا اختصار اور حجم کا تذکرہ تھا، مالٹے اور کیلوں کا سائز بڑا ہوگیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کاپی میں درج شکایات انٹیلی جنس والوں نے بالا حکام کو پہنچائیں جس کے نتیجہ میں وہ اپنی کارکردگی بہتر کرنے کی صورت نکال رہے تھے۔ افسروں کے موٹاپے کا ذکر تھا۔ آئندہ چند ماہ کے دوران بھارتی افسر جسمانی ورزش کرتے اور دوڑتے دکھائی دینے لگے تاکہ

ہمارے راشن سے پروردہ توندوں کو کم کرسکیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ تحریر کارآمد ثابت ہوئی تھی۔ میرا تو پہلے خیال تھا کہ میری شکایات پڑھنے کے بعد پکڑ ہوگی۔ سزا بھی ہوگی جس کے لیئے میں تیار تھا۔ جب چند ہفتے یوں ہی گزر گئے تو مجھے تسلی ہو گئی کہ سزا کے بغیر ہی کام بن گیا لیکن میرا خیال غلط نکلا۔

۱۰ جون کو کیپٹن وید آیا۔ دوپہر کا وقت تھا اور میں سویا ہوا تھا۔ مجھے باہر برآمدے میں آنے کے لیئے کہا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا باہر کرسی پر آن کر بیٹھ گیا۔ کیپٹن وید (ہکلاتے ہوئے) تم نے میرے خلاف الزام لگایا ہے کہ میں نے کسی قیدی کی سویٹر چوری کر لی ہے۔

میں :۔ میں نے ایسا کوئی الزام نہیں لگایا۔

وید :۔ کسی سے ذکر کیا ہوگا۔

میں :۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے ایسا کیا ہو۔

وید :۔ سوچ لو! یہ بڑا گمبھیر معاملہ ہے۔ میری عزت کا سوال ہے۔

میں :۔ میں نے سوچ لیا۔ میں نے کوئی ایسی الزام تراشی نہیں کی۔

وید :۔ تم نے اپنی ڈائری میں درج کیا ہوگا۔

میں :۔ ڈائری میں تو میں نے اتنی چیزیں درج کی ہیں کہ سب کی سب مجھے یاد نہیں۔

وید :۔ یاد کرنے کی کوشش کرو۔

میں :۔ بہتر کرتا ہوں (وقفہ کے بعد) کرلی ہے۔ کچھ دھندلی سی یاد تازہ کرلی ہے۔ ایک مدھم سی آواز بلند ہو رہی ہے ٹھہرو! تصویر کا خاکہ کھینچ رہا ہے۔ کچھ یاد پڑتا ہے کسی کی جرسی چوری ہونیکا ذکر کیا تھا

وید :۔ کس کی جرسی کا۔

میں :۔ تم کو مجھ سے زیادہ معلوم ہونا چاہیئے۔

وید :۔ میں نہیں جانتا۔

میں :۔ جانتے نہیں کہ جاننا نہیں چاہتے۔ اگر نہیں چاہتے تو چھوڑو اس معاملے کو۔ مٹی ڈالو۔ بات ہوگئی۔ جرسی چوری ہوگئی۔ تم نے چرالی۔ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ کیا فائدہ گڑھے مردے اکھاڑنے کا۔

**وید:**۔ یہ میری عزت کا سوال ہے تمہیں ایسا کرنے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں ایک خاندانی آدمی ہوں چور نہیں۔ یہ میرے کیریئر کا سوال ہے۔

**ملیں:**۔ اگر یوں ہے تو پھر مجھے تمہاری مدد ضرور کرنی پڑے گی۔ جرسی کرنل شریف کی تھی۔ باقی تفصیل ان سے دریافت کرلو۔ شاید اپنا کیریئر بچا سکو۔

کرنل شریف کو بلایا گیا۔ مجھے وہیں بٹھائے رکھا۔ یہ غلط الزام نہ تھا اور نہ ہی کوئی مبالغہ آمیزی تھی، ۶، مئی ۷۲ء کو جب ہماری سرنگ پکڑی گئی اور ہماری تلاشی ہوئی تو اس وقت کرنل شریف کی دو عدد جرسیاں کیپٹن وید اٹھا کر لے گیا۔ پھر نومبر میں جب وہ ایک دن ہمارے کیمپ میں آیا تو وہ وہی جرسی زیب تن کئے ہوئے تھا۔ کرنل شریف آنکھیں ملتا ہوا پہنچا تو وید نے اس سے سوال کیا۔

**وید:**۔ کیوں کرنل تمہاری کوئی سوئیٹر چوری ہوئی ہے؟

**شریف:**۔ ایک نہیں دو چوری ہوئی ہیں۔

**وید:**۔ کس نے چرائی ہیں۔

**شریف:**۔ تم نے۔

**وید:**۔ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہیں

**شریف:**۔ کیونکہ میں نے تمہیں اپنی ایک جرسی پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ جب تم نومبر میں ہمیں سٹور میں لے جانے کے لئے آئے تھے۔ تو تم نے میری سوئیٹر پہنی ہوئی تھی۔

**وید:**۔ اس کا رنگ کیا تھا؟

**شریف:**۔ براؤن اور ہلکی زرد یعنی دو رنگی۔

**وید:**۔ اس طرح کی اور بھی ہو سکتی ہے۔

**شریف:**۔ میں اپنی چیز کو اچھی طرح پہچان سکتا ہوں۔ وہ ڈبل رنٹ کی سوئیٹر تھی اور میری بیوی نے میرے لئے بنائی تھی۔ میں اسے ایک سال استعمال کر چکا ہوں اس لئے غلطی کا احتمال نہیں ہو

سکتا۔ اس کے علاوہ اس کے بازو تمہیں لمبے تھے۔ میرے بازو تمہارے بازوؤں سے ذرا لمبے ہیں یہ بحث بے حد گرما گرم اور دلچسپ رہی۔

وید کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ شیخ شریف صاحب نے بڑی بے رحمی سے سچ کہا تھا۔ مگر وہ بخوبی جانتے تھے کہ بڑے گھر کی سیر ضرور کرنا پڑے گی۔

۱۲ جون کو ہم فارسی کی کلاس میں بول چال کی مشق کر رہے تھے کہ شیخ صاحب کا بلاوا آگیا۔ وہاں جب کسی کو بلاوا آیا کرتا تو اس کے بعد کمبل پلیٹ اور مگ لینے کے لئے بھارتی آدمی آیا کرتا۔ سو میں نے شیخ صاحب سے کہا کہ آپ چلیں۔ میں آپ کا کمبل مگ اور پلیٹ بھجوانے کا انتظام کرتا ہوں۔ پہلے دو گھنٹے شیخ صاحب کو دھوپ میں کھڑا رکھا گیا۔ شیخ صاحب جسم کے نحیف مگر دل گردے کے مضبوط آدمی واقع ہوئے ہیں وہ مسکراتے ہوئے چل دیئے۔ تھوڑی دیر بعد کیپٹن پا دار نے دس روپے کے کوپن باڑ کے باہر سے اندر بھیجے کہ یہ کرنل ستار کو واپس دے دیئے جائیں۔ قریباً ایک سال پہلے کرنل ستار کی جیب میں سے کیپٹن پاوار نے ایک دس روپے کا بھارتی نوٹ نکال لیا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ ضبط کر کے بھارتی سرکاری خزانے میں جمع کرواتا اس نے اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اب چونکہ شکایتوں اور چوریوں کے قصے زیر بحث آگئے تھے اس لئے اس نے ڈر کر وہ دس روپے کرنل ستار کو کوپنوں کی شکل میں واپس کر کے اپنی جان بچانی چاہی۔

دھوپ میں کھڑا رکھنے کے بعد شیخ صاحب کو دفتر میں بلایا گیا۔ جہاں میز پر چند سوئیٹریں دھری تھیں شیخ صاحب نے اپنی سوئیٹر پہچان لی۔ اپنی بیوی کے ہاتھوں کی بنی ہوئی سوئیٹر کون نہیں پہچان سکتا۔ کرنل ستار جو پہلے بلاک میں شیخ شریف کے ہم کمرہ تھے ان کو بلوا کر سوئیٹر کی شناخت کروائی گئی اور انہوں نے بھی درست سوئیٹر کی طرف اشارہ کیا۔ شیخ صاحب کے پرانے اردلی کو جو اب جے سی او بلاک میں تھا بلا کر پوچھا گیا۔ معلوم نہیں اس کو کیا دھمکی دی گئی پہلے اس نے کہا مجھے ٹھیک طرح پہچان نہیں پھر ایک ادھ بنی سوئیٹر

کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا شاید یہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر دباؤ ڈالا گیا تھا

شیخ صاحب کی دونوں سوئیٹریں اسی دن اڑالی گئی تھیں جس دن سرنگ پکڑے جانے کے آئندہ روز ہمیں کمروں میں بند کر کے سامان کو تہس نہس کر کے تلاشی لی گئی تھی۔ کرنل مرزا کی گھڑی اڑالی گئی تھی۔ جونیئر افسروں کے بلاک میں سے کیپٹن جاوید جلال الدین کی رے بین کی قیمتی عینک لے گئے اور میجر راجہ صابر کا قیمتی سیفٹی ریزر۔ میرے کچھ کوپن وغیرہ وغیرہ۔

شیخ صاحب کی غلط الزام لگانے کے جرم میں چارج شیٹ تیار کی گئی ان کو مزید تین گھنٹے دھوپ میں کھڑا رکھنے کے بعد دفتر میں بلایا گیا اور بیس دن کی قید تنہائی کی سزا سنانے کے بعد ان کو دفتر سے لے جا کر ہمارے پرانے کیمپ میں ایک سٹور روم میں بند کر دیا گیا۔ یہ سراسر زیادتی تھی ایک چوری اور دوسرے سینہ زوری۔ شیخ صاحب کا کمبل تولیہ۔ بالٹی مگ اور پلیٹ بھجوا دیئے گئے۔

اگلے روز میں نے ایک انٹرنیشنل ریڈ کراس کے نام اور ایک کیمپ کمانڈنٹ کے نام درخواست لکھی۔ کہ شیخ صاحب کو سزا دینا جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی تھی، وہ بالکل بے قصور ہیں۔ کنونیشن کے تحت کسی قیدی کی طرف سے کی گئی شکایت جو خواہ بالکل ہی بے بنیاد ہو کی بناء پر سزا دیئے جانے کی ممانعت ہے اور اس صورت میں اوّل تو شیخ صاحب نے کوئی شکایت کی ہی نہ تھی اور دوسرے چوری والی بات سچ پر مبنی تھی۔ کمانڈنٹ کو میں نے لکھا کہ اگر کوئی موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے تو وہ ناچیز ہے اس لئے شیخ صاحب کو بری الذمہ قرار دے کر واپس بھیج دیا جانا چاہیے" ابھی میں درخواستیں سیدھی ہی کر رہا تھا کہ میرا بلاوا آگیا۔ تمام ہمنوا بول اُٹھے۔ کرنل صاحب آپ چلیں ہم آپ کا کمبل پلیٹ اور مگ بھجوانے کا بندوبست کرتے ہیں۔

۱۴ جون مجھے صبح آٹھ بجے کمانڈنٹ کے دفتر لے جایا گیا اور جون کی گرم گرم دھوپ سینکنے کے لئے مجھے ایک بجے تک باہر کھڑا رکھا گیا۔ قید نے کچھ سخت جان بنا دیا تھا۔ قوت برداشت بڑھ چکی تھی۔ عام حالات میں شاید چکر اکر گر پڑتا۔ مگر وہاں عزت اور عزم کا معاملہ تھا۔ حوالدار میجر تھاپا کو مجھے کمانڈنٹ کے دفتر کے اندر مارچ کروانے کے لئے کہا گیا۔ افسروں کو حوالدار میجر مارچ

کروایا نہیں کرتے۔ یہ بھی کنونشن کی ایک اور خلاف ورزی تھی۔ میں نے احتجاج کیا۔ وہ نہ مانے۔ حوالدار میجر اپنا ورڈ آف کمانڈ بولتا گیا اور میں اپنے وقت میں اپنی مرضی سے کمانڈنٹ کی میز کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے کچھ تُرش کلامی سے کام لیا۔ میں بے فکر کھڑا رہا۔

میجر چوان :۔ نمبر ۶۱۰۸۴۵ کرنل منصور الحق ملک پاکستان آرمی۔ کیا تمہارا نمبر نام رینک درست ہے؟

میں :۔ نہیں ہنوز دلی دُور است۔

چوان :۔ میں نے جگہ کا کب نام لیا ہے جو تم دلی کی باتیں کر رہے ہو۔ اور ہاں ہنوز اور است کیا ہیں؟

میں :۔ یہ فارسی ہے۔ میں دلی کے بارے میں نہیں بتا رہا۔ بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں۔ کہ لیفٹنٹ کرنل ہوں۔ کرنل نہیں۔ اور اس فارسی کے مقالے سے مراد یہ ہے کہ فی الحال میرا کرنل بننا کافی دُور ہے۔

چوان نے اپنی غلطی کو محسوس کیا اور میرا درست رینک دہراتے ہوئے چارج پڑھا۔ کہ بھارتی فوجی قانون کی فلاں دفعہ کے تحت تم کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہے کہ تم نے اپنی ڈائری میں جھوٹے الزامات قلمبند کئے ہیں اور سنیئر بھارتی افسروں پر نکتہ چینی کی ہے۔ بھارتی افسروں اور بھارتی کیمپ سٹاف کی برائیاں بیان کی ہیں، جب میں باہر دھوپ میں کھڑا تھا تو دفتر کے اندر میں نے چند کلرکوں کو باتیں کرتے سنا کہ ۲۱ دن کی سزا مل رہی ہے۔ اس لئے میں سزا کے لئے تیار تھا۔

چوان نے چارج شیٹ پڑھنے کے بعد مجھ سے سوال کیا۔

چوان :۔ تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو۔

میں :۔ میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ کیونکہ تم نے پہلے ہی مجھے ۲۱ دن قید تنہائی دینے کا فیصلہ کر لیا ہوا ہے۔ اس لئے سزا سنائیے اور کام ختم کیجئے۔

چوان :۔ تمہیں کیسے علم ہے کہ تمہیں ۲۱ دن کی سزا دی جانی ہے۔ وہ کچھ گھبرا کر بولا۔

میں :۔ مجھے انٹیوشن ہوتی ہے

چوان :۔ وہ کس بلا کا نام ہے؟

میں :۔ لغت دیکھنی پڑے گی۔ ویسے یہ حسِ ششم کہلاتی ہے جو شاید ہٹلر کو آیا کرتی تھی وحی سے کم۔

**چوان :۔** اپنا لیکچر بند کرو۔ تم ایک لیفٹیننٹ کرنل ہو، اتنی سروس کی ہے اس طرح کی غلط الزام تراشی تمہیں زیب نہیں دیتی۔

**ملیں :۔** اوّل تو میں نے کوئی الزام تراشی کی نہیں۔ جو کچھ میری ڈائری میں درج ہے وہ سو فی صد حقیقت ہے۔ ویسا ہی درست ہے جیسے میں یہ کہوں کہ باہر آسمان پر سورج نکلا ہوا ہے اور اس ۱۱۸ ڈگری درجہ حرارت میں آپ نے مجھے پانچ گھنٹے دھوپ میں کھڑا کر کے جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی کی ہے دوسرے کس لیفٹیننٹ کرنل کی آپ بات کر رہے ہیں، دنیا کی کون سی فوج میں لیفٹیننٹ کرنلوں کو حوالدار میجر مارچ کروا کر چارج پورے جاتے ہیں۔ مجھے سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں، مہربانی کر کے اپنی سزا سنایئے اور میرا مزید وقت ضائع نہ کیجیے۔

مجھے یقین تھا کہ سزا ۲۱ دن سے بڑھا کر ۳۰ دن ہو جائے گی۔ ۳۰ دن سے زائد اس لئے نہیں کہ جنیوا کنونشن کے تحت اس سے زائد سزا ایک وقت میں نہ دی جا سکتی تھی لیکن میجر چوان نے میرے یقین کے پرخچے اڑا دیئے اور ۲۱ دن قید تنہائی کی سزا سنا کر مجھے روانہ کر دیا۔

مجھے اسی بیرک میں لایا گیا جہاں ہم پہلے رہا کرتے تھے اور جس کے باورچی خانے میں ہم نے سرنگ کھودی تھی شیخ شریف کو سٹور روم سے منتقل کر کے ایک کمرے میں بند کر دیا اور مجھے سٹور میں بند کر دیا گیا جس کے اندر کموڈ بھی پڑا تھا۔ عقب میں ایک چھوٹی کھڑکی تھی جس میں سلاخیں نصب تھیں۔ سامنے والا لکڑی کا دروازہ مقفل کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ کھڑکی کھلی تھی لیکن اس کے مقابل کا دروازہ بند ہونے کی وجہ سے ہوا آر پار نہ جا سکتی تھی اور ذرہ بھر ہوا اندر نہ آتی، کمرے کے اندر بے حد حبس تھا۔ گرمی تھی اور دم گھٹتا تھا۔ اس کمرے کے اندر ۲۱ دن گزارنے تھے اس لئے ضروری تھا کہ فوراً خود کو نئے ماحول میں ڈھال لیا جائے۔ میری جیب میں سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس تھی قمیض اور پتلون میں نے اتاری اور صرف جانگیے میں فرش پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر دل کو تسلی دینے کے لئے یہ شعر ذرا دھیرے سے ترنم سے گانے لگا۔

رونق روئے زیست ہے ان سے — جو مصیبت میں مسکراتے ہیں

خار و گل میں ہے فاصلہ کتنا! — غم خوشی ساتھ ساتھ آتے ہیں

یہ شعر میری بیوی نے اپنے ایک خط میں لکھے تھے۔ یقین جانئے کہ ان کے پڑھنے سے میرے دل کو بڑی تقویت ملی اور فکر سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ دل و دماغ سے نکل کر سٹور کی پراگندہ فضا میں سفر کرنے لگا۔ سارے قصے پر غور کرنے سے بڑی ہنسی آئی۔

بے حد پیاس لگی تھی اور بھوک بھی۔ پانی تو ملنے کی امید تھی لیکن کھانا چند روز تک بند ہی رہنے کی توقع تھی۔ پیاس سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ کمرے کے اندر چہل قدمی کرنے لگا عقب کی کھڑکی سے باہر باورچی خانے پر نگاہ پڑی تو سرنگ کے تمام واقعات یکے بعد دیگرے دماغ میں چکر کھانے لگے شیخ صاحب کو دو چار آوازیں دیں تاکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ وہ یہاں اکیلے نہیں خادم بھی وہیں ہے مگر وہ دو کمرے چھوڑ کر تیسرے کمرے میں بند تھے ان تک میری آواز نہ پہنچ سکی۔

تین بجے کے قریب حوالدار درشن سنگھ آیا، وہ ایک شریف اور اچھا سپاہی تھا اس کا رویہ بیحد درست تھا۔ وہ میرا کمبل شیو کا سامان، تفہیم القرآن، پلیٹ مگ اور پانی سے بھری ہوئی گرم پانی کی بالٹی مجھے دیکر چلا گیا۔ اگرچہ پانی گرم تھا لیکن خوب پیا۔ پیاس بری چیز ہے پانی پینے سے تسلی ہوئی مگر اب پیٹ میں چوہے ناچنے لگے۔ جیسے وہ بھی پیاس کی وجہ سے پیٹ کے اندر بے ہوش پڑے ہوں۔

کھڑکی کے باہر لمبی لمبی ہری گھاس لگی تھی اور گھاس کے درمیان اینٹوں کے دو میناروں کے اوپر پانی کی چھوٹی سی ٹینکی تھی اور اس ٹینکی کے نیچے ایک گلہری اور ایک بوڑھا گرگٹ ایک دوسرے کے ساتھ کھیل رہے تھے، میں کافی دیر ان کے کھیل میں محو رہا۔ ۲۱ دن ایسے ہی کھیل تماشوں سے بہلا کر گزارے جا سکتے تھے،

کھڑکی سے نیچے نظر ڈالنے پر مجھے ایک بیحد موٹا مینڈک دکھائی دیا۔ یوں ہی خیال آیا کہ

کیسا رہیگا، مشرقی پاکستان سے موٹے مینڈک جاپان کو برآمد کئے جاتے تھے اور فوج میں بھی سنا تھا کہ زندہ رہنے کی تربیت کے دوران مینڈک کھلائے جاتے ہیں۔ حرام حلال کا مسئلہ نہ تھا یہاں تو ذرا پیٹ کو حوصلہ دینے کا سوال تھا نہ جانے اگلے روز بھی کھانے کو بھی کچھ ملتا تھا یا نہیں، لیکن مینڈک پکڑنا کوئی آسان کام نہ تھا اور وہ بھی بند کمرے کی کھڑکی کے اندر سے جس پر سلاخیں نصب تھیں۔ لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ میں نے اپنے جانگئے سے آزاربند نکالا اسے لمبائی کے داؤ کا درمیان سے بلیڈ کے ساتھ کاٹ کر آپس میں باندھا، کوئی دو گز لمبا بن گیا۔ ایک سرے پر پھندا بنایا اور اسے کھڑکی سے نیچے زمین پر لٹکا دیا۔ مگر مینڈک خبیث ذرا ہٹ کر بیٹھا تھا۔ ازاربند اتنا لمبا نہ تھا کہ پھندے والا سرا اس تک پہنچ سکے۔ پکڑے جانے کے لئے اس کا خود پھندے میں چلا آنا لازمی تھا لیکن اغلباً وہ بے وقوف ہونے کے باوجود اتنا بیوقوف نہ تھا۔

میں بھی مچھلی پکڑنے والے کی طرح کانٹا پھینک کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ گھنٹہ بھر کھڑا رہا مگر مینڈک تھا کہ اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہ لیتا تھا، مرغی کو جیسے دانہ ڈالتے وقت آ۔ آ کر کے بلاتے ہیں میں نے اس کو بلایا۔ بلی کو بلانے کی آواز نکالتے ہوئے ہُپ ہُپ کیا۔ چونکہ میں مینڈک کو بلانے کی آواز سے ناواقف تھا اُسے نہ بلا سکا۔ اسے کافی گالیاں بھی دیں۔ الو کا پٹھہ۔ سُور کا بچہ۔ پاجی مگر اس پر ذرا بھر اثر نہ ہوا۔ ہوتا بھی کیسے وہ نہ ہی اُلو کا پٹھہ تھا اور نہ ہی سُور کا بچہ وہ تو مینڈک کا بچہ تھا۔ غصے میں آ کر میں نے ٹڈّو کا بچہ کہا تو اس نے ایک جست ماری اور دور چلا گیا۔ سارا انتظار فضول ثابت ہوا۔ میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا فرش پر بیٹھ کر آرام کرنے لگا۔ پھر اٹھا وضو کیا اور عصر کی نماز ادا کی۔ اس سے فارغ ہو کر باہر جھانکا۔ تو مینڈک کھڑکی کے عین نیچے بیٹھا تھا کوئی دس پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد خدا کا کرنا یوں ہوا کہ وہ پھندے میں پھنس گیا۔ کس طرح۔ یہ میں بھی نہیں جانتا۔ بس اس کی موت کا طریقہ اور وقت مقررہ ہو چکا تھا پھنستا کیسے نہیں؟ میں نے آزار بند اوپر کھینچا اور میاں مینڈک اندر تشریف لے آئے۔ اسے میں نے دھویا، بلیڈ کے ساتھ حلال کیا۔ پتہ نہیں اس کو حلال کرتے ہیں یا مچھلی کی طرح اس کو حلال کرنے

کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خیر میں نے کر ہی دیا۔ کھال بڑی مشکل سے اتاری" اندر سے ایک مختصر آنت اور غدود نکال کر باہر پھینکے۔ کموڈ کے نیچے سے ایک چھوٹی سی تختی توڑی اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈھیری بنائی۔ دس بارہ ماچس کی تیلیاں اور سگریٹ کی ڈبی کے کاغذ بھی ڈھیری تلے رکھے۔ مینڈک کو سیفٹی ریزر کے ہینڈل میں پھنسا دیا۔ آگ جلائی اور مینڈک کو آگ پر بھوننے کے لئے لے کر بیٹھ گیا۔ چار پانچ منٹ خوب آگ جلی مگر جلد ہی راکھ ہو گئی۔ گوشت نے بھنا گیا تھا۔ اتنے عرصے میں البتہ کچھ گرم اور جھلس سا گیا۔ میں نے تھوڑا سا چکھا کچھ دھواں لگی مچھلی کا سا مزہ تھا اگر نمک ہوتا تو شاید زیادہ لطف آتا۔ تھوڑا تھوڑا چکھتے چکھتے آدھے سے زیادہ ہڑپ کر گیا۔ بُرا ہرگز نہیں تھا۔ ممکن ہے بھوک کی زیادتی کی وجہ سے لذت میں اضافہ ہو گیا ہو۔ جی تو کرتا تھا کہ باقی بھی کھا جاؤں مگر یہ خیال کر کے کہ کچھ کل کے لئے رکھ چھوڑنا چاہیئے باقی ادھ بھنے مینڈک کو کھڑکی پر لگی میخ کیساتھ لٹکا دیا۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ واقعی وہی ہے جو پتھر کے اندر بھی کیڑے کو روزی پہنچاتا ہے اور سٹور کے اندر جنگی قیدی کو بھنے ہوئے مینڈک مہیا کرتا ہے۔ بڑا کارساز ہے وہ رب عظیم جو اس ساری کائنات کا مالک ہے چھ بجے شام کے وقت درشن سنگھ نے دروازہ کھولا اور ساتھ کے غسلخانے میں نہانے کے لئے پانچ منٹوں کے لئے جانے کی اجازت ملی۔ میرے نہا لینے کے بعد شیخ صاحب کو وہاں نہانے کے لئے بھیجا گیا اور پھر ایک بڑی اچھی بات ہوئی اور وہ یہ کہ ایک بھنگی گندے سے کپڑے میں کچھ لپیٹے کمرے کے اندر آیا۔ پہلے اس نے ہمارے کموڈ صاف کئے پھر انہی گندے ہاتھوں سے وہ گندے کپڑے کی گانٹھ کھول کر اس نے ایک ڈبہ نکالا۔ انہی گندی انگلیوں کی مدد سے آدھی دال میری پلیٹ میں ڈالی اور دو عدد چپاتیاں ہاتھ میں تھما کر وہ باقی حصہ شیخ صاحب کو دینے چلا گیا۔ درشن سنگھ نے دروازہ بند کیا۔ کھانے کا ملنا بڑی غنیمت تھی۔ فرش پر چوکڑی مار کر پلیٹ سامنے رکھی اور کھانا کھایا۔ پانی پیا اور شام کی نماز کے ساتھ دو عدد شکرانے کے نفل ادا کئے ابھی تک تو سارے وقت کا کافی حصہ مینڈک پکڑنے اور بھوک کی فکر میں گزر گیا تھا۔ ان کی وجہ سے گرمی اور حبس کا خیال زائل ہو چکا تھا مگر اب جبکہ پیٹ کی آگ بجھائی

جا چکی تھی شدت کی گرمی محسوس ہونے لگی۔ دم گھٹنے لگا۔ اپنے جانگیے میں فرش پر چت لیٹ گیا۔ باوجود تھکے ہونے کے نیند کہاں اور کیسے آسکتی تھی مچھر کانوں میں نغمے الاپ رہے تھے اور جسم پسینے سے شرابور تھا۔

دس بجے کے قریب اٹھ کر وضو کیا۔ عشاء کی نماز ادا کی۔ آیت الکرسی چند مرتبہ پڑھی اور پھر ساری رات فرش پر کروٹیں بدلتے اور ٹہلتے گزاری۔ ساری رات میں اتنا پسینہ نکلا جتنا شاید پوری گرمیوں کے موسم میں نہ نکلا ہوگا، صبح کاذب کے وقت اٹھ بیٹھا۔ یہ کوئی ایک آدھ دن کا معاملہ نہ تھا پورے اکیس دن گزارنے کا سوال تھا۔ اس لئے ایک باقاعدہ اور مسلسل پروگرام کا ہونا ضروری تھا تاکہ پورا وقت مشغولیت میں گزرے۔ دماغ میں ایک بھرپور پروگرام کا خاکہ بنایا اور صبح ہی سے اس پر عمل شروع کر دیا۔ یہ قید تنہائی میں روزانہ کا مشغلہ ٹھہرا۔ یعنی علی الصبح نماز پڑھنے کے بعد نیند، ذرا روشنی پر آدھ گھنٹہ کمرے میں ورزش، اس چھوٹے سے کمرے کے اندر دوڑنا شپر شاشن کرنا۔ ڈنٹر نکالنا۔ چند یوگا کی مشقیں کرنا، پھر درشن سنگھ آجاتا اور پانچ منٹ کے لئے غسلخانے میں جانے کی اجازت ملتی، نہا کر واپس آتا۔ ناشتہ ایک عدد سوکھی روٹی اور چائے کے ساتھ کیا جاتا، پھر دو گھنٹے کے لئے تفہیم القرآن کا مطالعہ۔ کاغذوں کے پرزوں اور فرش پر ہندی لکھنے کی مشق اندازاً ایک گھنٹہ اور پھر فارسی بولنے اور اردو سے فارسی میں جملے بنانے کی مشق کرنا۔ دوپہر کا کھانا، کچھ دیر آرام۔ ظہر کی نماز، گھنٹہ بھر ورزش اور کمرے کے اندر دوڑ، شام کو پانچ منٹ کے لئے دروازہ کھلنے پر غسلخانے میں جاکر غسل، شام کا کھانا۔ پھر اقبال کی نظموں کا الاپنا اور شعر و شاعری (زبانی تحریری نہیں کیونکہ کمرے کے اندر اندھیرا ہوتا) عشاء کی نماز اور پھر فرش پر نیند۔ غسلخانے میں آتے یا جاتے وقت شیخ صاحب کی کبھی کبھی جھلک دکھائی دیا کرتی تو ان کا حال پوچھ لیتا۔ ان سے باتیں کرنے کی اجازت نہیں تھی جنیوا کنونشن کے تحت ہمیں کم از کم دو گھنٹہ روزانہ کھلی فضا میں نکالنا چاہیئے تھا۔ اس گرم اور تنگ و تاریک سٹور میں بھی یوں بند کرنا جنیوا کنونشن کی سراسر خلاف ورزی تھی۔

ایک پتھر کے ٹکڑے کے ساتھ میں نے دیوار پر تاریخ اور دن کندہ کرنے کا سلسلہ شروع کیا تاکہ دنوں کا حساب رہے۔ ۱۵ جون کو کیپٹن وید آیا۔ شاید یہ بتانے کہ دیکھا نا بچو، میں نہ کہتا تھا کہ میں تم سے نپٹ کر رہوں گا۔ مجھے سگریٹ پیش کیا۔ میں نے انکار کیا اور جیب سے اپنی سگریٹ کی ڈبیا نکال کر ایک عدد سگریٹ سلگایا۔ بولا کہ یہاں سگریٹ رکھنے کی اجازت نہیں۔ میں نے ڈبیہ اور ماچس دیتے ہوئے کہا کہ اگر نہیں تو یہ لو۔ لے جاؤ۔ کہنے لگا نہیں یہ رکھے رکھو۔ مگر شام کو درشن سنگھ سے کہا کہ سگریٹ واپس لے لو۔ میں نے اسے بتایا کہ ان حالات میں رکھنا جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی ہے اور یہ کہ شیخ صاحب کو سزا دے کر بڑی زیادتی کی گئی ہے انہیں چھوڑ دینا چاہیئے۔ وہ ایک خبیث مسکراہٹ کے ساتھ چلتا بنا۔

دروازے کے نیچے آدھ اینچ چوڑی درز تھی اس میں سے ذرا ہوا آتی تھی۔ چنانچہ دروازے کے ساتھ میں وقتاً فوقتاً پانی گراتا رہتا۔ جو ہوا لگنے سے فرش کو ذرا ٹھنڈا کر دیا کرتا۔ پھر رات کو اس درز کے ساتھ منہ لگا کر فرش پر لیٹ جاتا۔ ناک کو ذرا تازہ ہوا لگتی تو ذرا نیند آجایا کرتی۔ شروع کے ایک دو دن تکلیف محسوس ہوئی۔ پھر سب کچھ زندگی کا معمول بن گیا۔ سٹور مانوس لگنے لگا اور گرمی اور پسینہ ضروریات زندگی، ساتھیوں کے ساتھ اتنا عرصہ ایک طرح کے ماحول میں رہتے کچھ بوریت سی ہو چکی تھی۔ یہاں سٹور میں آنے سے ایک نیا ماحول ملا اور ہوا بدلی ہو گئی ایک خاموش زندگی بسر کی۔ باڑ کے باہر لوگ چلتے پھرتے دکھائی دیتے۔ یہ بھی نیا منظر تھا۔ کچھ ویران کو دیکھنے میں گزارتا۔

لانس نائیک پیرومل اور حوالدار درشن سنگھ صبح شام غسلخانے میں لے جانے کے لئے آیا کرتے۔ بھنگی نے کموڈ صاف کرنا بند کر دیا تو وہ بھی خود ہی صاف کرنا پڑتا۔ اس کو خود ہی کہا تھا کہ چونکہ وہ کھانا تقسیم کرتا ہے اس لئے اس کام سے باز رہے تو بہتر ہے۔ اپنا کام خود کرنے میں کوئی عار محسوس نہ ہوتی۔ چنانچہ تربیت دہ قیام ثابت ہوا۔

۱۹ جون کو کیپٹن گپتا جو کہ کیمپ ایڈجوٹنٹ تھا شام کو آیا۔ وہ یہ بتانے آیا تھا کہ اگر ہم اپنی

غلطی کا اعتراف کرلیں تو سزا گھٹائی جا سکتی ہے اس نے بتایا کہ میں نے کاپی میں یہ لکھ کر کہ کیمپ کا سٹاف قیدیوں کا راشن کھا کھا کر موٹا ہو رہا ہے ان سب کو پورے سٹیشن میں مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ جہاں وہ جاتے ہیں دوسرے انگلیاں اٹھا کر کہتے ہیں کہ لو یہ توندوں والے قیدیوں کے راشن پر پل رہے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کی ذمہ داری کیمپ سٹاف کی ہے جنہوں نے میری ڈائری بغیر میری مرضی کے لے جا کر یہ ساری کہانی کو مشتہر کیا۔ اپنی غلطی کے اعتراف کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ درست تھا البتہ اس کو میں نے جنیوا کنونشن کی خلاف ورزیوں کا تدارک کرنے کے لئے کہا۔

۲۲ جون کو درشن سنگھ نے صبح آکر اطلاع دی کہ ہماری باقی ماندہ سزا ختم کر دی گئی ہے اور ہمیں واپس جانے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ یہ غیر متوقع خبر تھی اور باعث خوشی۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ہماری قید تنہائی سے جلدی رہائی کا سبب کیا تھا۔ ایک تو ۲۷ جون کو انٹرنیشنل ریڈ کراس کے نمائندے ہمارے کیمپ میں آرہے تھے اور ان کو اس ناگفتہ بہ حالت میں ہمیں دکھانے سے برا اثر پڑ سکتا تھا، دوسرے میجر وکرم چوان بہار رجمنٹ کی تبدیلی کا آرڈر آگیا تھا اور اس کی جگہ میجر ڈھلن آیا تھا۔ جب ہمیں دفتر میں لایا گیا تو میجر ڈھلن بھی وہاں بیٹھا تھا میں نے اس کو بتایا کہ آپ خود سوچیں کہ ہم مشرقی پاکستان میں اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آئے ہیں۔ ہزار ہا روپوں کی چیزیں وہیں چھوڑ آئے ہیں اور جب ہم یہاں آپ کے رحم و کرم پر ہیں تو کوئی بیوقوف قیدی ہی ہوگا جو جھوٹے الزام تراشنے کی کوشش کرے اور وہ بھی پچاس ساٹھ روپوں کے سوئٹر کے لئے اگر آپ ہماری جگہ ہوتے تو کیا آپ یوں کرتے۔ میجر ڈھلن کے رویہ سے ہم نے محسوس کیا کہ وہ ایک سلجھا ہوا سمجھدار افسر ہے۔ ملک کا ایک معمولی عہدیدار اپنے ذاتی رویہ سے اپنی قوم اور ملک کی ذہنیت کی جس طرح چاہے ترجمانی کر سکتا ہے اگر وہ اعلیٰ قدروں کا پاس رکھتا ہے تو اس سے قوم کی عزت بڑھے گی۔ اس کے برعکس اگر وہ گھٹیا رویہ اختیار کرتا ہے تو قوم و ملک کے وقار کو ٹھیس پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا۔ بھارتی

حکومت نے کیمپ میں غیر موزوں افسروں کا تعین کر کے اپنی تمام کوششوں پر خود پانی پھیر دیا۔ جنگی قیدیوں کے کیمپ کے سٹاف کے انتخابات میں انہیں بڑے تدبر سے کام لینا چاہیئے تھا اگر یوں کرتے تو جنگی قیدیوں کی بڑی تعداد کو اپنی قوم کے اچھے کردار سے متاثر کر سکتے تھے۔

جب ہم کیمپ میں واپس پہنچے تو ساتھیوں نے پُرتپاک استقبال کیا۔ سب سے گلے ملے۔ جیسے صدیوں کے بعد واپس لوٹے ہوں۔ حسب معمول محفل جمی۔ کھانا مل کر کھایا۔ ذاکر نے موقع کی مطابقت میں دو عدد نظمیں سنائیں اور ہم نے اپنا حال سنایا۔ اتنے دنوں کے بعد ساتھیوں کے ساتھ مل کر بیٹھے تو بیحد خوشی حاصل ہوئی۔

## ۲۲

۱۰ اپریل کو پاکستان کے نئے آئین کے پاس ہونے کی خبر سن کر بے حد مسرت ہوئی۔ یہ ہماری ترقی کی طرف ایک اہم اور جامع قدم تھا۔ زیادہ خوشی کا باعث یہ تھا کہ آئین پوری نیشنل اسمبلی جس میں حزب اختلاف بھی شامل تھی کی منظوری سے پاس ہوا۔ اور یہ ملک کے لئے اچھا شگون تھا آخر ۲۶ سال کی جدوجہد کے بعد عوام کے اپنے منتخب کردہ نمائندوں نے آئین بنایا تھا۔ ۱۲ اپریل کو صدر بھٹو نے بل کی منظوری دے دی۔ ہم نے شکرانے کے طور پر ختم قرآن کیا۔ مل کر نماز پڑھی اور پاکستان کے استحکام اور عوام کی خوشحالی کی دعا مانگی۔ اس کے بعد ایک مجلس بھی منعقد کی جس میں آئین کی اہمیت پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ ذاکر نے آئین پر ایک بہت عمدہ نظم پڑھی جو اس نے وزیر قانون عبد الحفیظ پیرزادہ کو بھی لکھ کر بھیجدی اور جس کے جواب میں وزیر قانون نے اسے شکریے کا خط بھی تحریر کیا۔ کیمپ کی طرف سے صدر بھٹو کو بھی مبارک کا ایک خط بھیجا گیا۔

۲۱ اپریل کو علامہ اقبالؒ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ہر چند اہل ذوق نے اکٹھے بیٹھ کر اقبال ڈے منایا ہر ایک نے علامہ اقبال کے فلسفہ اور شاعری کے کسی ایک پہلو پر اپنی رائے کا اظہار کر کے دوسروں کو اپنے خیالات سے مستفیض کیا۔ ایسی محفل سے چند نوجوان افسروں پر

اقبالؒ کے اشعار کی اہمیت کا راز افشا ہوا کیونکہ اس موقعہ پر ہم میں سے چند نے ان کے منتخب اشعار پڑھ کر سنائے چنانچہ آئندہ مہینے بانگ درا اور بالِ جبریل کی خرید کے لئے بندوبست ہوا اور یوں اقبالؒ کے کلام کی کاپیاں کیمپ کے افسروں میں پڑھی جاتی دکھائی دینے لگیں۔ اقبالؒ ہمارا قومی شاعر ہے اور اس کا کلام جہاں ہماری کمزوری کو اجاگر کرتا ہے وہاں وہ رُوح پرور پیغامِ زندگی بھی دیتا ہے ۔

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا !
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا !
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس میرا شعلہ بار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا !
ہزاروں موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

ے وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

ریڈیو پر ہم نے خبر سنی کہ حکومت پاکستان نے جنگی قیدیوں کو تحائف بھیجنے کے لئے ایک کروڑ روپے کی رقم الاٹ کی ہے اگرچہ اس جذبے کی ہمیں بے حد قدر تھی لیکن اتنی بڑی رقم کو کسی منصوبے میں لگا کر بہتر طریق سے خرچ کیا جا سکتا تھا، یہاں قید میں دو عدد وردی کے جوڑوں میں گزارہ بخوبی ہو سکتا تھا۔ باوجود ان تحائف اور ان کے علاوہ گھر سے آئے ہوئے تحفوں کے میں نے صرف دو وردی کے جوڑوں سے گزارہ کیا۔ انسان اپنی ضروریات کو جتنا بڑھانا چاہے بڑھا سکتا ہے اور پھر بھی تسلی نہیں ہوتی۔ ہم نے جی ایچ کیو میں ایڈجوٹنٹ جنرل کو ایک عدد خط لکھا جس میں ان کو مشورہ دیا کہ تحفوں پر خرچ کئے جانے والی رقم کو کسی مفید قومی مصرف پر خرچ کیا جانا چاہیے۔ خیر! ان تحائف کے پیکٹ ہمیں ملے۔ اس میں سب سے زیادہ کارآمد

چیز خاکی نکر تھی جو گرمیوں میں بہت کام آئی۔

پاکستان ریڈ کراس کی طرف سے بھی گفٹ پارسل موصول ہوئے اپنے ملک کی ریڈ کراس کے اس جذبے سے ہم بیحد متاثر ہوئے۔ کبھی فرصت کے وقت میں خیال آتا کہ ہمارے ملک میں سوشل آرگنائزیشن کی جو خدمت کے لئے واقف ہوں کس قدر کمی ہے۔ حالانکہ ایسے نیک کاموں پر جتنا اسلام نے زور دیا ہے اتنا کسی اور مذہب نے نہیں دیا۔ ایسے ادارے جو محتاجوں۔ نادارں یتیموں، بیماروں اور مصیبت زدگان کی خدمت اور مدد کریں وہ بڑی ہی محدود تعداد میں ہیں۔ بعض ایسے بھی ادارے ہیں جو خدمتِ خلق کے پردے میں پیسے بٹورنے کے لئے وجود میں آتے ہیں جیسے کئی یتیم خانے۔ ہمیں حقیقی خدمتِ خلق کے لئے وقف اداروں کی ضرورت ہے جس کو چلانے کے لئے نہ صرف حکومت بلکہ تعلیمی سیاسی اداروں صحافی۔ ادیب۔ شاعر، طلباء اساتذہ مسلح افواج یعنی ہر طبقہ فکر کے لوگوں کو برسرِ عمل ہونا چاہیئے۔

وقتاً فوقتاً کیمپ کی زندگی میں کوئی واقعہ تبدیلی رونما کر دیا کرتا۔ مثلاً عالمی اولمپک میونخ میں ہونے والے ہاکی کے میچوں کا آنکھوں دیکھا حال ہم باقاعدگی سے ریڈیو پر سنا کرتے جس دن بھارت اور پاکستان نے سیمی فائنل کھیلنا تھا دل میں بڑی بے چینی رہی۔ ہم سب صحن میں بیٹھے میچ کا حال لاؤڈ سپیکر پر سن رہے تھے کہ بھارت کی ٹیم کو ایک عدد گول ہو گیا۔ ہم نے جوشِ مسرت سے بڑے زوردار نعرے لگائے مگر ساتھ ہی حکام نے لاؤڈ سپیکر بند کر دیا۔ اپنی ہار کا حال سنانا انہوں نے مناسب نہ سمجھا۔ بعد میں ہمیں نتیجہ کا علم ہوا کہ پاکستان جیت گیا۔ فائنل کا حال جو کہ مغربی جرمنی اور پاکستان کے درمیان تھا وہ بھی بڑی بے چینی کے ساتھ سُنا۔ پاکستان کے جرمنی کے ہاتھوں ہارنے کا ہمیں بے حد رنج ہوا۔ پورے کیمپ میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اور کیمپ میں خاموشی اور سناٹا چھا گیا۔

عالمی ہاکی کپ کے مقابلوں کا آنکھوں دیکھا حال سُنا۔ ان مقابلوں کے دنوں میں کیمپ کی زندگی میں تبدیلی واقع ہوئی۔ بھارت اور پاکستان کے مقابلے کے دن حسبِ معمول بڑی

بے چین قسم کی دلچسپی پائی جاتی تھی۔ ہماری ٹیم نے بڑے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا مگر افسوس کہ جیت نہ پائے جس کا چند دن بے حد افسوس رہا۔ سردیوں میں میں رات کو کافی دیر تک کتاب کا مطالعہ کرتا تھا۔ اکثر بارہ ایک بج جاتے۔ بیرک میں چند افسروں کو سوتے میں بولنے کی عادت تھی رات کی اس سنسان خاموشی میں ایک دم یوں کسی کے بولنے سے شروع شروع میں میں چونک جایا کرتا۔ مگر آہستہ آہستہ اس سے مانوس ہوگئی۔ ہر روز تو نہیں مگر ہر مہینے میں چھ سات دفعہ کسی نہ کسی کی بڑبڑاہٹ سنا کرتے جس کو سن کر میں بھی بلند آواز سے انہیں کچھ جواب دے دیا کرتا۔ کافی مضحکہ خیز باتیں کیا کرتے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

"میں نے گھر جانا ہے گھر جانا ہے میں ادھر نہیں رہ سکتا۔ مجھے جلدی گھر بھیجیں" اور میں اسے تسلی دینے کے لئے کہہ دیا کرتا "چلے جاؤ گے، چلے جاؤ گے، آخری اتنی جلدی بھی کیا ہے، ابھی تو صرف تیرہ ماہ ہوئے ہیں، آج جانے کی ضد نہ کرو" وہ تو سویا ہوتا میری آواز کہاں سنتا۔

ایک صاحب جو کچھ تصنیف کر رہے تھے اکثر پریس والوں سے باتیں کیا کرتے "مینجر صاحب ایڈیٹر صاحب میری کتاب کب تک شائع ہو سکے گی۔ کتنے پیسے لگیں گے۔ ہاں ہاں پچیس ہزار کاپیاں پرنٹ کر دیجئے۔ ٹھیک ہے، پچیس ہزار اور ضرورت پڑی تو چھپوالیں گے" اور میں آواز کستا۔ "پچیس کافی رہیں گے، پچیس ہزار نہ ہی علامہ اقبال اور نہ ہی چچا غالب کے کلام کی پہلی دفعہ چھپ پائیں" مگر وہ بڑبڑاتا ہوا سو جاتا۔

ایک صاحب ذرا لمبی تقریر کرنے کے عادی تھے۔ ذرا پند و نصیحت سے بھرپور تیز تیز بولا کرتے تھے۔ جیسے ان کی گاڑی چھوٹنے والی ہو۔ اکثر چار پانچ منٹ تک لگاتار بولے جاتے "دیکھو یہاں سے بھارتی سپاہی ہمیں دیکھتے ہیں اس لئے ہمیں ہر وقت اپنا ٹرن آؤٹ اچھا رکھنا۔ بالوں کو کنگھی کی ہوئی ہونی چاہیے۔ لباس سے متاثر ہوں گے۔ تو ہماری صلاحیتوں کے متعلق اچھی رائے قائم کریں گے۔ یہ ضروری ہے۔ سمجھے! یہ بہت ضروری ہے،

ایک صاحب کی منگنی ہو چکی تھی۔ اگر قیدی نہ بن گئے ہوتے تو شادی کافی عرصہ کی ہو گئی

ہوتی، وہ ایک رات شور مچاتے ہوئے سنے گئے۔" میں پہلے شادی کروں گا روٹی بعد میں کھاؤں گا" میں نے کہا" برخوردار روٹی کھالو! شادی بعد میں ہو جائے گی" شاید اس کو میرا مشورہ پسند نہ آیا۔ کیونکہ وہ شادی پہلے کرنے کی رٹ کافی دیر تک لگاتا رہا۔ صبح اٹھا تو میں نے اسے کہا کہ واپسی پر برات باڈر سے سیدھا دلہن کے گھر لے جانا۔ مگر اسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا' جب اسکو سارا ماجرا سنایا تو خوب ہنسا۔

ایک صاحب شاید کسی کے عشق میں گرفتار تھے۔ اپنی محبوبہ کو اپنی وفا کا یقین دلایا کرتے، اس کے حسن کی تعریف کرتے اور اس جدائی کا گلہ کیا کرتے۔ ان کے اندازِ گفتگو سے یوں معلوم ہوتا کہ وہ اپنی محبوبہ کے جواب کو بھی سنا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی باتوں کا سلسلہ یوں ہوتا جیسے کوئی کسی سے فون پر بات کر رہا ہو" کیا باتیں کرتی ہو، تم بن کیسے زندہ رہ سکتا ہوں' نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ چاہو تو آزما لو۔ بتاؤ تم کو ایسا خیال بھی کیوں آیا۔

ایک صاحب بھارتی حکام کو انگریزی میں گالیاں دینے کے عادی تھے۔ اکثر جب ان کی انگریزی کی گالیاں ختم ہو جایا کرتیں تو MORE OVER کہہ کر پنجابی میں کافی بھرپور قسم کے تبرّوں کا استعمال کیا کرتے ایسے چٹکلے رات کے سناٹے میں بے حد دلچسپی کا باعث بنا کرتے۔

۲۷ جون ۱۹۷۳ء کو انٹرنیشنل ریڈ کراس کے نمائندے مسٹر ٹیمپی تشریف لائے تو میں نے ان سے اپنی اور کرنل شریف کی سزا کے سلسلے میں کی جانیوالی جنیوا کنوینشن کی خلاف ورزیوں کی شکایت کی انہوں نے یہی مشورہ دیا کہ مصلحت اسی بات میں ہے کہ شکایت نہ کی جائے کیونکہ شکایات کی وجہ سے ہمیں خود ہی خواہ مخواہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ مسٹر ہاف مین کے نکال دیئے جانے کے بعد انہوں نے مصالحانہ روش اختیار کرنے ہی میں ہماری بہبود اور اپنی نوکری کا تحفظ جانا وہ ہماری شکایات کو جائز تو سمجھتے تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ خاموش رہنے ہی میں ہماری بہتری ہے۔ ہمارا نکتہ نظر یہ تھا کہ وہ ان خلاف ورزیوں کو اپنی رپورٹ میں درج کریں تاکہ لوگوں کو حقیقت کا پتہ چل سکے ہم شکایات کا خمیازہ بھگتنے کے لئے

تیار ہیں۔

جولائی ۷۳ء کے شروع میں پاک بھارت مذاکرات کی خبر گرم ہوئی تو ساتھی واپسی کے تذکرے کرنے لگے۔ جولائی کے آخر میں ہکسر اور عزیز احمد کی پنڈی میں ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ اُمیدیں بندھتی اور ٹوٹتی رہیں۔ مجھے ذاتی طور پر ان مذاکرات سے خاطر خواہ نتیجہ کی کم ہی امید تھی۔ ان مذاکرات کا مدعا ۱۹۷۱ء کی جنگ سے پیدا شدہ انسانی مسائل کا حل ڈھونڈنا تھا، بنگالیوں کی پاکستان سے، بہاریوں کی بنگلہ دیش سے اور جنگی قیدیوں کی ہندوستان سے واپسی کے مسائل درپیش تھے۔ بین الاقوامی مسائل کے حل میں حریف بے حد سودا بازی سے کام لیا کرتے ہیں، پاکستان کا مطالبہ کہ جنگی قیدیوں کو بلا شرط رہا کیا جائے حق پر مبنی تھا۔ اس کے برعکس بھارت اور بنگلہ دیش اس مطالبے کو پورا کرنے کے عوض زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کے خواہاں تھے تاکہ جس قدر زیادہ سے زیادہ بہاریوں کو وہ ملک بدر کر سکیں اتنا ہی پاکستان پر اقتصادی بوجھ پڑے گا۔ چنانچہ یہ سودا بازی کسی دوکان سے سودا خریدنے سے کسی طرح مختلف نہ تھی۔ جب گاہک جا کر قیمت پوچھتا ہے، دوکاندار اگر پانچ روپے بتاتا ہے تو گاہک اسے چار روپے پر راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر ایک اور دو دو آنے کر کے دوکاندار قیمت گھٹاتا ہے اور گاہک بھی دو تین آنے بڑھانے پر رضامند ہو جاتا ہے اور پھر جب قیمت طے نہیں ہو پاتی تو گاہک امتحاناً کر کے دوسری دکان کا رخ کرتا ہے۔ آخر گھنٹہ بھر کی سودا بازی کے بعد قیمت طے پا جاتی ہے۔ اگر پانچ روپے کی چیز پر سوداگری کا یہ حال ہے تو جہاں لاکھوں انسانوں کی نقل و حرکت اور آبادکاری میں کروڑوں روپوں کا مطالبہ ہو وہاں معاملہ کس قدر پیچیدہ ہوگا۔

آخر پنڈی مذاکرات بھارت کی ہٹ دھرمی کے سبب نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔ آئندہ مذاکرات دہلی میں ہونے طے پائے۔ ۱۷ اگست کو عزیز احمد صاحب کی قیادت میں پاکستانی وفد دہلی پہنچا۔ ہر روز ریڈیو پر خبریں بڑی بے چینی سے سُنی جاتیں۔ ۲۵ اگست کو خاصی بُری خبریں آنے لگیں۔ مذاکرات کی ناکامی کی تصویریں کھینچ رہی تھیں۔ اسی وجہ سے آئندہ دو روز

پورے کیمپ میں مردنی چھائی رہی۔ میرا اپنا اندازہ تھا کہ کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے ابھی چند اور مذاکرات ہوں گے۔ مزید سودا بازی ہوگی مگر ۲۸ اگست کی شام کو خلاف توقع مذاکرات کی کامیابی کی خبر سے پورے کیمپ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ساتھی ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔ یہ خوشی کا موقع ضرور تھا مگر ۱۹۵ جنگی قیدیوں کا مسئلہ جن پر مقدمہ چلایا جانا تھا التوا میں ڈال دیئے جانے سے کچھ افسوس ہوا۔ پورے اکیس ماہ کے بعد اب کوئی واپسی کی صورت بنتی دکھائی دینے لگی تھی سب سے زیادہ خوشی ہمیں اس بات کی تھی کہ پاکستان نے اپنے موقف اور اصولوں سے ایک قدم پیچھے نہ ہٹایا۔

۲۹ اگست کو معاہدے کی مکمل تفصیلات کا اعلان ہوا۔ تینوں ممالک سے اندازاً چار لاکھ لوگوں کی واپسی کا بندوبست کرنے میں ضرور کافی وقت لگنے کی توقع تھی۔ ۳۰ اگست کو کرنل سکدڑ جو پیر اسنٹر کا کمانڈنٹ اور سٹیشن کمانڈر تھا بمعہ کیمپ کمانڈنٹ کے مبارک دینے کے لئے آیا۔ اس نے ہماری جلد واپسی کی اُمید ظاہر کی اور یہ بھی بتایا کہ گوالیار کے کیمپوں کی واپسی آگرہ کے کیمپوں کے بعد ہے اور یہ راز بھی افشا کیا کہ ہم میں سے چند قیدیوں کو بھارت کے مختلف تاریخی مقامات کی سیر کو لے جایا جائے گا۔ مجھے ان کی یہ تجویز موزوں معلوم نہ ہوئی کیونکہ ہمارے ساتھ برا سلوک کرنے کے بعد یہ مہمان نواز طریق ہماری مزید توہین کرنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ میں نے کمانڈنٹ کے نام ایک درخواست دی کہ ہمارے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کے بعد سیر و تفریح کے منصوبے کی ہرگز ضرورت نہیں کیونکہ توہین اور مہمان نوازی کا آپس میں جوڑ نہیں ہو سکتا۔ ہمارا کوئی بھی سپاہی اس تفریح پر لے جانے کو ہتک گردانے گا۔ اس لئے اس تفریح پر لے جانے کا خیال ترک کر دیا جانا چاہیئے۔

ایران نے ان ہی دنوں دو ارب سے زائد روپے کے فوجی ساز و سامان خریدنے کا اعلان کیا تو بھارتی حکومت کی طرف سے اس پر بڑی تنقید کی گئی۔ اخبارات میں اس خطرے کا سدباب کرنے کے لئے حکومت پر زور دیا جانے لگا۔ اخبارات میں اداریئے اور مضامین شائع ہوتے کہ ایران اور چین اور پاکستان مل کر بھارت کے خلاف محاذ آرائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایران اپنے آپ کو کیوں مسلح کر رہا ہے؟ اسے فوجی طاقت بڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس قسم کے

سوال پوچھے جانے لگے۔ ایران نے واضح الفاظ میں اپنی پوزیشن صاف کردی کہ ایران پاکستان کے خلاف کی جانے والی کسی نئی جارحیت کی صورت میں پاکستان کی بھرپور مدد کرے گا۔ اور یہ کہ ایران کی فوجی طاقت بھارت سے محاذ آرائی کے لئے نہیں بڑھائی جارہی بلکہ یہ محض ایک دفاعی قدم ہے۔ اس کے تیل کی برآمد کے راستوں کے تحفظ کے لئے اس کا مضبوط ہونا ضروری تھا۔ پھر بھی اخبارات اور لوک سبھا میں گریہ زاری جاری رہی۔

اگست ۱۹۷۳ء کے السٹرٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں عطیہ مسعود کی ایک کھلی چٹھی شائع ہوئی جس میں اس نے بڑی بے باکی سے بھارتی حکومت سے سوال کیا کہ کسی دوسرے آزاد ملک کے فوجی قوت بڑھانے کے اقدامات کے خلاف وہ کیونکر اعتراض کرسکتی ہے اگر بھارتی حکومت یہ پوچھنے کی مجاز ہے کہ ایران اپنی فوجی قوت کیوں بڑھا رہا ہے تو ایران والے بھی بھارت سے ایسا ہی سوال کرسکتے ہیں کہ بھارت نے پچاس آرڈیننس فیکٹریاں کیوں قائم کررکھی ہیں اور وہ جنگی طیارے اور بحریہ کے جہاز کیوں تیار کررہا ہے اس نے مزید لکھا کہ ۱۹۷۱ء میں بھارت کی کھلم کھلا مشرقی پاکستان میں جارحیت کے بعد یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مغربی پاکستان کے خلاف جارحیت کا مرتکب نہ ہوگا۔ اس لئے دوسروں کے دفاعی اقدامات پر نکتہ چینی کرنے سے پہلے بھارت کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے ماضی کے کردار پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ اور ان غیر ضروری اعتراضات کا سلسلہ بند کرنا چاہیئے۔ ان کا یہ جرأت مندانہ خط قابل ستائش تھا۔ ۱۴ اگست کو جہاں پاکستان کے آئین کے نفاذ کی خوشی ہوئی وہاں پنجاب اور سندھ میں سیلاب کی تباہ کاریوں کا سن کر سخت رنج ہوا جو کچھ ریڈیو پر ہم نے سنا اس سے حکومت کی کارکردگی سے ہم متاثر ہوئے، وزیراعظم سے لیکر نیچے تک دوسرے وزرار کا سیلاب زدہ علاقوں میں امدادی کاروائیوں کی خود دیکھ بھال کرنا قابل تعریف عمل تھا۔

اس قید خانے کے اندر ایک خیال کافی ستایا کرتا اور وہ یہ کہ ہماری قید اللہ میاں کی طرف سے ہمارے لئے سزا تھی، یا وہ ہمارا امتحان لے رہا تھا، قرآن مجید میں جہاں خدا یہ کہتا

ہے کہ وہ اپنے نیک بندوں کا امتحان لینے کے لئے ان کو مشکلات سے دوچار کرتا ہے اور ان مصیبتوں کے وقت صبر و تحمل اور یقینِ محکم کا مظاہرہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا کسی کو بغیر اس کی غلطی کے سزا نہیں دیتا یعنی انسان کے ذاتی اور اجتماعی بُرے اعمال کی پاداش میں خدا ان کو سزا دیتا ہے۔ کیا ہماری یہاں کی قید سے خدا کو اپنے نیک بندوں کا امتحان لینا مقصود تھا یا وہ ہمارے گناہوں کی ہمیں سزا دے رہا ہے؟ یہ سوالات قابلِ غور تھے۔ اس کے علاوہ عام زندگی میں بھی مصائب و آلام سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے اور ہر مصیبت کی سزا میں اور امتحان میں کیونکر تفریق کی جاسکتی ہے۔

گزری قوموں پر جن کا تذکرہ قرآن شریف میں ہے آفات کی آمد ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے ہوئی۔ خواہ وہ عاد کی قوم تھی یا ثمود کی یا لوطؑ کی یا نوحؑ کی یا وہ فرعون کے ساتھی تھے انہوں نے خدا کو جھٹلایا۔ بے حیائی کے کام کیئے۔ ناپ تول میں دھوکہ کیا تو خدا نے ان پر تیز کڑک پتھراؤ۔ آندھی اور طوفان لاکر ان کو تباہ و برباد کردیا۔ اس کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر قوم میں یا ہر شہر یا ملک میں جہاں کے بیشتر افراد اپنے اعمال کی وجہ سے سزا کے مستحق ہوں وہاں ان میں کچھ نیک اور بے قصور انسان بھی تو ضرور موجود ہوں گے اور اگر خدا کو بد اعمال لوگوں کو سزا دینی مقصود ہو تو اس طرح کی عام آفتوں میں جو کے ساتھ گھن بھی پس جانے سے انصاف کی پامالی ہوتی ہے لیکن اس برتر ہستی سے بے انصافی کا خیال بھی پاس نہیں لایا جاسکتا تو پھر اس سزا اور امتحان کے مسئلے کا کیا جواب ہے؟ کس مصیبت کو ہم سزا کہیں گے اور کس کو امتحان!

کسی ناگہانی آفت کے آنے پر نیک و بد میں کیسے تمیز ہو سکتی ہے؟ مشرقی پاکستان کی خانہ جنگی۔ قتل و غارت۔ تباہی و بربادی میری ذاتی رائے میں ہمارے قومی کردار کی پستی کے عوض خدا نے سزا کے طور پر ہم پر وارد کی۔ اجتماعی طور پر ہم اسلام کے اصولوں اور اس کی قدروں سے کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے۔ بُرے اعمال اچھے دکھائی دینے لگے تھے، اس ایک سال کی آفت کے دوران ہزارہا لوگ مارے گئے اور خدا کا قہر غضبناک طور پر چھایا رہا۔ ایسی مصیبتوں کے آنے

پر خواہ وہ ایک شخص پر آئیں یا ان کی لپیٹ میں پوری بستی یا پوری قوم کے لوگ آ جائیں۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ ایک مختلف انداز سے متاثر ہوتا ہے۔ جن کا کردار پاک اور اعمال اچھے ہوتے ہیں اور خدا ان کو مزید مدت کے لئے زندہ رکھنا چاہتا ہے ان کو ایسی عام آفت میں بھی بغیر آنچ آئے بچا لیتا ہے، جیسا کہ نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو اور لوطؑ اور موسیٰؑ اور ان کے نیک ساتھیوں کو بچا لیا اور باقی تمام کو برباد کر دیا۔ ان آفتوں میں بعض نیک آدمی بھی وہ اپنی طرف اٹھا لیتا ہے، زندگی اور موت سے سزا یا انعام کی تفریق کرنا غلط ہوگا۔ آخر شہدا بھی تو اس دنیا سے ظاہری طور پر کوچ کر جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مرے اس لئے کہ انہیں سزا ملی اور جو بچ گئے انہوں نے زندگی انعام کے طور پر حاصل کی۔

کئی ایسے بھی ہوتے ہیں جو نیک اور خدا کے فرمانبردار بھی ہوتے ہیں مگر پھر بھی اس آفت کے دوران ان کو نقصان پہنچتا ہے خواہ وہ جسمانی ہو جانی ہو یا مالی ہو، ایسے لوگوں کو باوجود ان نقصانات کے ذہنی سکون اور قناعت قلب میسر ہوتی ہے کہ وہ ان مشکلات میں گھرنے کے باوجود خوش و خرم ہوتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے یہ مصیبتیں امتحان ہوا کرتے ہیں اس کے برعکس انکے دوسرے ساتھی جن کے اعمال بُرے ہوتے ہیں اور جن کو نقصان تو شاید اتنا ہی پہنچتا ہے لیکن یہ مصیبت ان پر پہاڑ بن کر ٹوٹتی ہے۔ ان کو ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ایسے لوگوں کے لئے یہی مصیبتیں سزا ہوا کرتی ہیں اور ایسی ذہنی کوفت کا اثر ہر بُرے شخص کے ذاتی اعمال کی مقدار کی تناسب سے ہوتا ہے اگر وہ زیادہ گناہوں کا مرتکب ہوا ہے تو وہی مصیبت اسے زیادہ دکھ پہنچائے گی اور اگر مقابلتاً اس کے گناہ کم ہیں تو اُسے مصیبت سے کم ذہنی تکلیف ہوگی۔ آخر مصیبت اور تکلیف ایک ذہنی تکلیف کا دوسرا نام ہے، ایک امیر آدمی باوجود تمام آسائشوں اور آرام کے ذہنی طور پر مصیبتوں میں گرفتار ہو سکتا ہے اور سکونِ قلب حاصل کرنے سے قاصر رہ سکتا ہے اور ایک غریب محنت کش آدمی باوجود جسمانی تکلیفوں کے جو اُسے زمین پر سو کر، سوکھی روٹی کھا کر اور سردیوں میں ٹھٹھر کر سہنی پڑتی ہیں خوش باش ہو سکتا ہے، ایک چور اور ایک فلسطینی مجاہد جو

اپنے وطن کی آزادی کی جنگ میں گرفتار ہو کر یہودیوں کی جیل کی کال کوٹھڑی میں ظاہراً تو ایک ہی طرح کی تکلیف جھیلیں گے مگر چور کا ضمیر اُسے اپنے بُرے اعمال کی بنار پر اس کال کوٹھڑی میں بیحد کوسے گا۔ اُسے ذہنی تکلیف ہو گی مگر مجاہد کو اس مصیبت میں گرفتار ہو کر بھی خوشی ہو گی کہ وہاں ایک نیک مقصد کے حصول کی خاطر قید کیا گیا ہے کسی بُرے ذاتی فائدے کے لئے نہیں۔

یہ اصول ہر شخص پر درست اترتا ہے بعینہٖ جنگی قیدیوں کی یہاں کی نظر بندی کا حساب ہے جن کا ضمیر پاک ہے اور ان کا ماضی کا کردار اور ان کے اعمال نیک ہیں نظر بندی ان کے لئے امتحان ہے اس نظر بندی کے دوران انہیں مکمل سکونِ دل میسر رہا ہو گا۔ اس کے برعکس جن کا صفحۂ اعمال گندہ رہا تھا ان کے لئے ہر لمحہ تکلیف دہ ثابت ہوا ہو گا۔ اور ان کے لئے یہ اعمال کی سزا تھی۔ سورۃ انفال میں لکھا ہے کہ "خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا اور جو نعمت خدا کسی قوم کو دیا کرتا ہے جبتک وہ خود اپنے دلوں کی حالت نہ بدلیں خدا اسے نہیں بدلا کرتا۔

۱۷ اگست کو وزیر اعظم بھٹو کی ریڈیو تقریر سُنی جس میں انہوں نے ایڈمنسٹریٹو سروس میں اصلاحات کا اعلان کیا تھا۔ یہ ایک جرأتمندانہ اور صحیح سمت میں لیا گیا قدم تھا۔ ہمارے ملک میں سی ایس پی ایک مضبوط پارٹی کی حیثیت حاصل کر چکی تھی کیونکہ تمام اعلیٰ عہدے ان کے قبضے میں تھے اس لئے ملک کا انتظامی ڈھانچہ ان کی روش میں ڈھال دیا گیا تھا، ان کی روش میں عوام کی خدمت کا جذبہ بالکل مفقود تھا، انتظامیہ کو قوم اور عوام کے خادموں کی طرح کام کرنا چاہیئے نہ کہ مالکوں کی طرح۔ اگر ڈویژن، ضلع اور تحصیل کے عہدیداروں میں اپنے آرام و آسائش اور ذاتی مفاد سے بے نیاز ہو کر عوام کی خدمت کا جذبہ نہ ہو تو لوگوں کی فلاح و بہبود کو کیوں کر ترقی دی جاسکتی ہے۔ ایسی بیوروکریسانہ روش سے پاک ہونے ہی میں ترقی کا راز مضمر ہے۔

ان اصلاحات سے ایک حلقہ کے لوگوں کی چودھراہٹ ٹوٹنے کے بعد انتظامیہ کو اپنا رویہ بدلنا پڑے گا اس کے علاوہ ان بڑے اور اہم عہدوں کے لئے انتخاب زیادہ وسیع دائرہ میں سے کئے جانے سے زیادہ قابل عہدیدار مل سکیں گے۔ اس طرح دیگر سروسز کا چھینا ہوا

حق انہیں مل جائے گا اور ایسی سروسز کے قابل افسروں کو ملکی انتظامیہ میں خدمت کا حق اور موقعہ مل جائے گا۔ تمام سروسوں کو توڑ کر ایک کرنے سے نیچے درجے سے اوپر درجے تک کے تمام ملازمین کو اپنی قابلیت کے مطابق ترقی کرنے کے یکساں مواقع میسر ہوں گے۔ یہ ایک منصف معاشرے کے قیام کی طرف ایک درست قدم ہے۔ سیلاب کی تباہ کاریاں سندھ اور پنجاب کے علاقوں میں بڑھتی جا رہی تھیں، روزانہ ریڈیو پر ان خبروں سے تشویش ہو اکرتی۔ سیلاب جہاں اس قدر تباہی اور بربادی ساتھ لایا وہاں اسسے پیدا شدہ مشکلات کا ایک روشن پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ قومیں جو کچھ مشکلات سے دوچار ہو کر سیکھتی ہیں وہ ایک پرسکون دور میں نہیں سیکھ سکتیں، ان طوفانوں سے گزرنے کا نام ہی زندگی ہے، بلند پایہ قوموں کے لوگ تو مشکلات کی جستجو کرتے ہیں تاکہ ان سے دوچار ہو کر وہ لذتِ زندگی حاصل کریں، ایسی مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی ہمت اسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہے جب یا تو ایسے طوفان آتے رہیں اور وہ ان کا مقابلہ کرنے کی استطاعت پیدا کریں اور یا وہ اپنا نصب العین اتنا بلند رکھیں کہ ان کو دن رات ایک تجسس اور لحہ نئی کشمکش سے نبرد آزما ہونا پڑے تاکہ ان کی ہر منزل ایک معرکہ ہو، ایسی آزمائشیں اگر ولولہ خیز ثابت ہوں اور ہمارے جذبۂ جدوجہد کو ابھاریں تو ان سے پیدا شدہ نقصانات سے کہیں زیادہ قومی کردار کی پرورش ہو سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ایسے ہی خیالات کا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہے۔

~ اس عقدہ کشا یہ خارِ صحرا ~ کم کر گلۂ برہنہ پائی

~ تعمیر آشیاں سے میں نے یہ راز پایا ~ اہلِ نوا کے حق میں بجلی ہے آشیانہ

یہ نہیں کہ ایسے طوفانوں کی تمنا کی جانی چاہیے، لیکن جب یہ پیش آجائیں تو ان کو اپنی منزل کا پڑاؤ گردانا چاہیئے، ذاتی زندگی میں بھی ہم اپنے آرام و آسائش کے لئے کیا کیا بنانے اور حاصل کرنے میں سرگرداں نہیں پھرتے، بنیادی ضروریاتِ زندگی کا حصول تو ایک جائز اور ضروری امر ہے لیکن ہمیں آسائش کا دلدادہ بھی نہ ہونا چاہیئے کہ ہم میں جفاکشی کا مادہ ہی باقی نہ رہے اس لئے باوجود اونچے طبقے کے پاس دولت کی فراوانی کے آسائش زندگی پر کنٹرول نافذ کرنا حکومت

کا فرض ہونا چاہیئے تاکہ قوم کا ایک اہم ترین طبقہ تن آسانی کا قائل ہو کر چھوت کی بیماری کیطرح باقی قوم کو بیمار نہ کر دے، موجودہ روش تو کچھ اسی سمت چلتی دکھائی دیتی ہے، ہماری تمام تر مصروفیات اپنے لئے آرام و آسائش ڈھونڈنے پر صرف ہوتی ہیں۔ شاندار بنگلہ بنانا۔ ان کو قالینوں اور صوفوں سے سجانا۔ فوم میٹرس کے نرم نرم بچھونوں کا حصول ہی ہمارا نصب العین بن چکا ہے حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اخلاقی ترقی اور منصفانہ معاشرے کے قیام کی طرف اپنی تمام تر توجہ مبذول کریں۔ ایک جائز حد تک جسم کو آرام کی ضرورت ہے مگر اس سے زیادہ نہ صرف جسم بلکہ دل و دماغ کے مفلوج کرنے کا سبب بنتا ہے۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں — اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ — ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

(اقبالؒ)

## ۲۳

دہلی معاہدے کے بعد کیمپ سٹاف کا رویہ رفتہ رفتہ بدلنے لگا۔ ہر دوسرے روز فوجی افسر ملنے کے لئے آنے لگے۔ بیماروں کے لئے دوائیاں جو کئی کئی دنوں بلکہ ہفتوں بعد ڈاکٹر کے مسلسل اصرار پر بڑی کم مقدار میں ملا کرتی تھیں اب سرعت سے آنے لگیں میں بذاتِ خود رویہ میں ایسی تبدیلی کو کردار کی کمزوری سمجھتا ہوں کہ چلو جاتے جاتے چند اچھی مثالوں کا مظاہرہ کر کے پرانے سارے کرتوت کو دھو ڈالو، تاکہ بھارتی یہ کہنے والے بنیں کہ انہوں نے نہایت اچھا سلوک کیا ہے ایسے اچھے کردار سے وہ محض اپنے آپ کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔

کیپٹن ویدکے چہرے پر بھی مسکراہٹ دکھائی دینے لگی وہ ہمارے افسروں سے گھل ملنے کی کوشش کرنے لگا کبھی آن کر ہمارے افسروں کے ساتھ جو تاش کھیلنے میں مشغول ہوتے گپ لگانے کی کوشش کرتا مگر شاید ہی سارے کیمپ میں کوئی ایسا ہو جو اسے منہ لگانے کے لئے تیار ہو۔

۱۸ ستمبر سے پاکستان سے بنگلہ دیش کو اور ڈھاکہ سے پاکستان کو بنگالیوں اور بہاریوں

کی نقل وحرکت شروع ہوئی ہم نے ۱۲ستمبر کو ریڈیو پاکستان سے بنگالی فوجیوں اور انکے اہل وعیال کے لاہور سے الوداع ہونے کا آنکھوں دیکھا حال سنا ۔میجر نورالامین سے کمنٹیٹر نے پاکستان سے جانے کے متعلق تاثرات بیان کرنے کے لئے کہا ،میجر نورالامین ۴۴ بلوچ رجمنٹ (قلندری) کا ایک افسر تھا ۔اور یہ کہتے ہوئے کہ اسے خدا حافظ کہنے کا بے حد رنج ہے اور وہ ساری عمر اپنی بٹالین کو کبھی بھول نہ پائے گا وہ رو پڑا ۔آخر سالہا سال کا تعلق یوں عمر بھر کے لئے توڑتے ہوئے کسے افسوس نہ ہوگا ہم میجر نورالامین کے تاثرات سے بیحد متاثر ہوئے ہمارے پرانے رشتوں اور دونوں ممالک یعنی پاکستان اور بنگلہ دیش میں آپس کے دوستوں کی وساطت سے ہمیں پھر سے ایک دوسرے کے نزدیک آتے زیادہ دیر نہیں لگے گی ۔باوجود اتنا کچھ ہونے کے ہم ماضی کی رنجشوں کو بھول کر اپنی باہمی جدوجہد جو ہم نے آزادی کے لئے کی تھی اس کے سہارے اور پچیس سال کی ایک واحد قوم کی تاریخ اور دائمی مذہبی برادری کے جذبہ سے اس برصغیر میں ایک واحد نصب العین کی طرف قدم بڑھائیں گے ۔بنگلہ دیش اور پاکستان کے باوجود دو علیحدہ آزاد ریاستیں ہونے کے راستے متوازی نہیں ہو سکتے کیونکہ ہماری منزل مقصود ایک ہے اس لئے ایک ہی راہ پر ہم دونوں کا گامزن ہونا ضروری ہے یہ علیحدہ اختیار کئے گئے راستے جلد آپس میں ملیں گے ۔

ستمبر ۷۳ء میں قیدیوں کو بھارت میں قریباً پونے دو سال ہونے کو آتے تھے اس طویل نظربندی کے دوران قیدی کا نفسیاتی جائزہ بھی ایک دلچسپ مضمون ہے ۲۱ ماہ کی مسلسل نظربندی کے بعد قیدی کی عادات ،طرز فہم اور انداز فکر اپنی ہی نوعیت کا بن چکا تھا جہاں یہ انداز اور طرز نرالا ہے وہاں بے حد دلچسپ بھی ۔

مثلاً دہلی معاہدہ سے کچھ پہلے جب واپسی کی کوئی صورت مستقبل قریب میں دکھائی نہ دیتی تھی تو قیدی اکثر کہتا سنائی دیتا کہ واپسی خواہ جلد نہ بھی ہو لیکن اگر واپسی کا فیصلہ ہو جاتے تو یہ بے چینی اور تذبذب بالکل ختم ہو جاتے خواہ پھر واپسی میں آٹھ دس ماہ ہی کیوں نہ لگیں ۔لیکن دہلی معاہدے کے اعلان کے فوراً بعد قیدی مطمئن ہونے کے بجائے زیادہ بے چین نظر آنے لگے ۔عزیز احمد صاحب

نے جب انٹرویو میں بتایا کہ واپسی چار پانچ ماہ میں مکمل ہو جائے گی تو قیدی سٹ پٹایا چار پانچ ماہ... ...... کیوں ..... آخر اتنی تاخیر کیوں. نہیں یہ محض قیاس آرائی ہے. اکتوبر کے آخر تک سب قیدی واپس پاکستان پہنچ جائیں گے. عیدالفطر سے پہلے پہلے. روز کے اگر چار ہزار قیدی واپس کئے جائیں تو بھی کام ایک ماہ کے اندر اندر ختم ہو سکتا ہے۔

کسی نے کہا سمندری جہازوں اور ہوائی جہازوں کی ضرورت ہو گی. بنگالیوں اور بہاریوں کی نقل و حرکت کے لئے وہ کہاں سے آئیں گے وہ. وہ...... امریکہ کے لئے چالیس پچاس بڑے جہاز دینا کیا مشکل کام ہے روس دے گا آخر اس نے بنگلہ دیش کو خوش کرنا ہے. پی آئی اے اپنے تمام بوئنگ طیارے اسی کام پر لگا سکتی ہے۔

ایک صاحب بڑے وثوق کے ساتھ پاؤں زمین پر مار کر بولے کہ ہماری واپسی ستمبر کے آخر تک مکمل ہو جائے گی مگر جب ستمبر کے آخر میں کچھ بھنک سنی کہ شاید ہمارے کیمپ کا نمبر دسمبر کے آخر میں آئے تو انہیں بخار چڑھ گیا۔

ایک روز کرنل غفور دفتر گئے واپس لوٹے تو کہنے لگے کہ وہاں ایک سیکنڈ لیفٹنٹ ملا. اس نے ان سے اظہار افسوس کیا کہ ہمارے کیمپ کا نمبر سب سے آخر میں ہے یہ سن کر کئی قیدیوں نے احتجاجاً کہا غلط بالکل غلط کیا پتہ ہے اس کم سال چھوکرے کو سیکنڈ لیفٹنٹ کو ہماری نقل و حرکت کی کیسے خبر ہو سکتی ہے ایسے ہی مارتا ہو گا۔

لیکن چند روز بعد ایک جونیئر افسر نے گفتگو کے دوران قیدی کو بتایا کہ اس کیمپ کا دوسرا نمبر ہے آگرہ پھر گوالیار تو ایسی خبر کو فوراً سراہا گیا ہاں بھی جونیئر افسر ہمیشہ ایسی باتوں کا کھوج لگاتے رہتے ہیں ایسی خبریں ان سے کیسے پوشیدہ رکھی جا سکتی ہیں. بالکل درست کہتا ہے اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے آخر افسر ہے کوئی غیر ذمہ دار شخص تو نہیں تو یوں دو تین دن میں کل کا کم سال چھوکرا آج کا ذمہ دار افسر بنا دیا گیا۔

قیدی کا مزاج چڑچڑا ہو گیا تھا بات بات پر غصہ. معمولی سی بات پر ناراضگی. کسی نے کہہ

دیا کہ واپسی میں تھوڑی مدت لگے گی تو وہ بگڑ گیا چڑچڑے پن کے ساتھ ہٹ دھرمی عود کر آئی تھی۔ بس جو کچھ ایک دفعہ کہہ دیتا پھر اس سے ذرہ بھر ادھر ادھر ہٹنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ خواہ کسی بارے میں ذاتی رائے ہو یا حقیقی تاریخی بات۔ مثلاً ایک نے کہا کہ پانی پت کی پہلی لڑائی بابر اور رانا سانگا کے درمیان ۱۸۵۷ء میں پانی پت کے مقام پر ہوئی تھی دوسرے نے اسے درست کرتے ہوئے کہا۔ اماں کیا بات کرتے ہو پانی پت کی پہلی لڑائی بابر اور رانا سانگا کے درمیان نہیں بلکہ بابر اور ابراہیم لودھی کے درمیان ۱۵۲۶ء میں ہوئی تھی بس پھر کیا تھا جواب ملا تم کیسے جانتے ہو میں نے آٹھویں جماعت میں خود پڑھا ہے میں اپنی جماعت میں تاریخ کے مضمون میں اول آیا تھا سو میں سے ۹۰ نمبر حاصل کئے تھے تمہاری طرح دانے دیکر نہیں پڑھا۔

اسے اس نے پھر سمجھایا کہ یہاں تمہارے اور میرے نمبروں سے سروکار نہیں یہ تو تاریخ کی کھلی حقیقت ہے فلاں سے پوچھ لو۔ فلاں سے پوچھا گیا تو اس نے دوسرے سے اتفاق کرتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی کہ ابراہیم لودھی ایک لاکھ فوج اور بے شمار ہاتھیوں کے ساتھ آیا تھا بابر کی کل بارہ ہزار فوج تھی مگر وہ ماننے والا نہ تھا وہ ابراہیم لودھی نہیں تھا رانا سانگا تھا جس کی ایک لاکھ فوج اور بے شمار ہاتھی تھے اور جس کے جسم پر اٹھادن زخم لگے تھے تیسرے نے سمجھایا کہ نہیں تمہیں غلطی لگی ہے وہ ابراہیم لودھی ہی تھا اور سال ۱۵۲۶ء درست معلوم ہوتا ہے اگر یہ نہیں تو اس کے قریب ہوگا ۱۸۵۷ء تو کسی صورت میں نہیں ہو سکتا کیونکہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں انگریز راج تھا اور اس سال پہلی آزادی کی جنگ جو غدر کے نام سے مشہور ہے لڑی گئی۔

ان صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو مگر ہٹ دھرمی قیدی کی سرشت بن چکی تھی کہنے لگے بس چھوڑو تم اپنا علم اپنے پاس رکھو میرے ساتھ مزید بحث مت کرو۔ مجھے تاریخ کا آپ لوگوں کے مقابلے میں زیادہ علم ہے۔

قیدی ہر فن مولا بن گیا تھا اصل میں بن نہیں گیا تھا بلکہ اپنے آپ کو ہر فن مولا سمجھنے لگا تھا، سائنس کا سوال ہو یا علم نجوم کا۔ نفسیات کا تذکرہ ہو یا مذہب و شریعت کا۔ جغرافیہ کی بات

ہو یا قانون کی وہ اپنی رائے ضرور دیتا تھا خواہ کچھ جانتا ہو یا نہیں بڑے وثوق کیساتھ اظہار خیال کیا کرتا اہمیت حاصل کرنے کے لئے مبالغہ آمیزی اور گپ سے کام لینے کا عادی ہوگیا تھا۔

ایک ہی خبر کا ہر قیدی پر مختلف اثر ہوتا، ایک سادہ خبر کی ہر کوئی مختلف تفسیر پیش کرتا سیدھی بات کی گہرائیوں میں گھس کر ایسی ایسی مہمل باتیں اور نتیجے اخذ کرتا کہ انداز فکر قابل ستائش اور مزاح کے ملے جلے اثرات پیدا کرتی، مثال کے طور پر دہلی میں مذاکرات کے دوران مسٹر ہکسر نے جو بھارتی وفد کے لیڈر تھے بیان دیا کہ پورا بھارتی وفد اس انسانی معاملہ کا خاطر خواہ حل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے مگر پاکستانی وفد تعاون نہیں کر رہا ایک صاحب بولے اس بیان میں پورا کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ آپ نہیں جانتے کیونکہ یہ ڈپلومیٹک زبان ہے اس کا مطلب اصل میں یہ ہے کہ جہاں تک بھارت کے سارے نمائندے حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہاں پاکستانی وفد میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ دنیا کے تمام ڈپلومیٹ اس "پورا" لفظ کے یہی معنی لیں گے۔

اس بیان کا صرف یہی مطلب ہے کہ آغا شاہی اور عزیز احمد صاحب میں ضرور تکرار ہو رہی ہوگی عزیز احمد سخت لائن اختیار کر رہے ہوں گے جبکہ آغا شاہی کا رویہ زیادہ مصالحانہ ہوگا دیکھیں اتنے اہم مذاکرات میں بھی آپس میں پھوٹ ہے انہیں جب سمجھایا گیا کہ لفظ "پورا" کا مطلب یہاں سیدھا سادہ ہے کہ ان کے کہنے کے مطابق جہاں بھارت والے کوشش کر رہے ہیں کہ اپنی بات منوائیں وہاں پاکستان کا رویہ سخت ہے لیکن انہوں نے نہ ماننا تھا نہ مانا آخر یہ کہہ کر چپ ہوگئے کہ واپس جا کر بے شک عزیز احمد صاحب سے دریافت کر لیجئے گا۔

ستمبر کا مہینہ ان قیاس آرائیوں میں گذر گیا مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ واپسی کب ہوگی البتہ ستمبر کے آخر میں عید الفطر سے پہلے گھر جانے والوں کا جوش ٹھنڈا پڑنا شروع ہوگیا اور دبی زبان سے یہ کہتے سنے جانے لگے کہ اگر عید البقر تک پہنچ جائیں تو بھی ٹھیک ہوگا بے چین ہونے سے انسانی الجھن بڑھتی ہے اور بے چینی میں اضافہ ہوتا ہے۔

قیدی بڑا نکتہ چین بن گیا تھا ہر معاملہ پر کڑی نکتہ چینی کرتا ہر معاملہ کا خواہ وہ بین الاقوامی ہو سیاسی ہو یا انتظامیہ کا ہو یا کسی کا ذاتی ہو۔ قیدی اس کا تفصیل سے جائزہ لیتا اور ہر بات میں اسے کمزوریاں ہی کمزوریاں نظر آتیں اگر معاملہ محض ذاتی ہو تو اسے اپنی آنکھ کا شہتیر بھی دکھائی نہ دیتا اور دوسروں کی آنکھ کا تل بھی نمایاں طور سے دیکھتا ذاتی تحفظ اور خود پسندی کا مادہ بڑھ گیا معلوم ہوتا تھا شاید یہ نظر بندی سے پیدا شدہ FRUSTRATION کی وجہ سے تھا آخر عام زندگی میں طرح طرح کی مصروفیات ہیں جن میں انسان الجھا رہتا ہے اور جب دائرہ عمل محدود ہو کر رہ جائے اور وہ بھی زیادہ مدت کے لئے تو پھر دل کی بھڑاس دوسروں کی نکتہ چینی کر کے ہی نکالی جا سکتی ہے جوانوں کے کیمپوں میں آئے دن آپس کی لڑائی جھگڑوں کی اطلاع ملتی تھی کئی دفعہ سر پھٹے سپاہیوں کو سامنے سڑک سے ہسپتال کو لے جاتے دیکھا افسر تو چونکہ کتابیں پڑھ کر بین الاقوامی حالات پر تبصرہ کر کے برج اور شطرنج کھیل کر اپنے آپکو کافی حد تک مشغول رکھ سکتے تھے لیکن ہمارے سپاہیوں کو اول تو کتابیں ہی کم مہیا کی گئیں تھیں دوسرے انہیں پڑھائی کا زیادہ شوق بھی نہ تھا بے کاری بڑی لعنت ہے اور ایسی ناپسندیدہ بے کاری میں دل کی بھڑاس نکالنے کیلئے ایکدوسرے کی مار کٹائی کے علاوہ اور طریقہ بھی کیا ہو سکتا تھا۔

عام حالات میں ہمارا فوجی سپاہی اپنے افسروں سے کہیں زیادہ مصروف زندگی بسر کرنیکا عادی ہے اس لئے یہ بیکاری اس کے لئے زیادہ تکلیف دہ اور جان سوز ثابت ہوتی ہوگی اس کے علاوہ سگریٹ کے شائق لوگوں کے لئے چودہ روپے ماہوار رقم کم پڑتی ہو، سگریٹ کا نشہ بری بلا ہے نشہ پورا نہ ہو تو طبعیت بیمار ہو جاتی ہے ہمارے کیمپ کے تو چند افسروں نے سگریٹ پینے چھوڑ دیئے اور ایسے چھوڑے کہ پھر بالکل ہاتھ نہ لگایا۔ اس لحاظ سے تو یہ نظر بندی ان کے لئے مصلحت کا باعث بنی۔

کئی فوجی جوان اور افسر عام حالات میں اپنے گھر والوں کو اپنی تنخواہ کا خاطر خواہ حصہ اپنی ذمہ داری پوری کر کے بھیجنے کے عادی نہ تھے اس نظر بندی کے دوران ان کی تنخواہیں باقاعدگی

سے حکومت کی وساطت سے ان کے لواحقین کو پہنچنے لگیں یعنی نوجوان افسر جو ہر ماہ اپنی تنخواہ فضول خرچی میں ضائع کرتے رہتے ان کے حاجت مند والدین کو یہ رقم ملنے سے کتنی خوشی اور سہولت ہوتی ہوگی ان کے لئے تو ان کے بیٹے جیسے بیرونی ممالک میں ملازمت پر گئے ہوئے تھے آخر ایران اور بحرین بھی لوگ اپنے اہل و عیال سے دور کمانے کے لئے جاتے ہیں اور اس قدر مصروف زندگی بسر کرتے ہیں کہ ان کو اپنا ہوش نہیں ہوتا۔ پھر تین چار سال کے بعد وطن کا چکر لگاتے ہیں بس اپنی کمائی اپنے گھر والوں کو بھیج کر اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہیں۔

بعض افسر آپس میں یوں بات چیت کرتے سنائی دیتے۔ میرا تو چوبیس ہزار روپیہ وہاں جمع ہوگیا ہے پھر کوئی اس رقم سے بنگلہ بنانے کا۔ کوئی کار خریدنے اور کوئی سکوٹر خریدنے کا پروگرام بناتا سنائی دیا کرتے، ان کے لئے ایسے حالات میں یہ ایک تسکین کا سبب تھا بڑے سے بڑے واقعات کا کوئی نہ کوئی روشن پہلو ضرور ہوتا ہے جیسا کہ سیاہ بادلوں کے ارد گرد سورج کی چمکتی لکیریں دکھائی دیا کرتی ہیں۔

۲۸ ستمبر کو الہ آباد کے کیمپ نمبر ۳۸ سے سویلین وطن واپس پہنچنے شروع ہو گئے ان کا ان کیمپوں میں نظر بند رکھنا بڑا انسانیت سوز عمل تھا۔ اس پہلے گروپ کے کل ۴۲ ۸ نظر بندوں میں سے زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے، اس بات سے بیحد خوشی ہوئی کہ کم از کم ان معصوموں کو تو واپس وطن بھجوایا گیا۔ ایسی بے رحم روش کی مثال زار کے وقت صرف روس میں ملتی ہے جہاں کئی معصوم لوگوں کو بمعہ ان کے بیوی بچوں کے سائیبریا کے کیمپوں میں سالہا سال کے لئے بند کر دیا جاتا تھا۔

میری ذاتی رائے ہے کہ ان میں سے سمجھدار بچے اس بحران سے گزرنے کے بعد بڑے محب وطن شہری بنیں گے۔

رمضان کی پہلی تاریخ ۲۴ ستمبر کو مسٹر کوکب دری صاحب ہم سے خطاب کرنے تشریف لائے یا یوں کہہ لیجئے کہ لائے گئے اپنا تعارف کراتے ہوئے انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ علیگڑھ

کے پڑھے ہوئے ہیں اور ان کے کئی ہم جماعت مثلاً حسن قادری صاحب اور جسٹس نور العارفین آجکل پاکستان میں مقیم ہیں کوکب صاحب نائیٹرس انٹرنیشنل میں ملازم تھے جو کیمیائی کھاد کا دھندہ کرتی تھی میں نے سوچا کہ کیمیائی کھاد اور قیدیوں کا آپس میں کیا تعلق ہو سکتا ہے اور یہ کوکب صاحب ہمیں کیمیائی کھاد کے بیوپار کے متعلق کچھ کہہ کر کیا پائیں گے، سوائے اس کے کہ بھارتی حکومت کا اگر ارادہ ہو کہ جنگی قیدیوں کو کسی بنجر علاقے کی آبادکاری کے لئے استعمال کیا جائے جہاں کیمیائی کھاد کو استعمال میں لانا ہو۔ لیکن کوکب صاحب نے اپنے تعارف کے بعد بھارت میں ہمدرد فاونڈیشن اور صنعتی ترقی کی راہ میں اپنی خدمات پر روشنی ڈالنے کے بعد بھارت میں مسلمانوں کی حالت زار کے متعلق جو ان کے مطابق غلط فہمیاں ہو گئی ہیں ان کو دور کرنے کی رائیگاں کوشش کی۔

اس ضمن میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جان بوجھ کر حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی ملازمت کے مواقع کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کے برعکس حکومت بہت کوشش کر رہی ہے کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب بڑھے مگر موجودہ حالات کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان نہ تو محنت کرنے کا عادی اور نہ ہی ملک کی معمولی ملازمتوں پر کام کرنے کے لئے تیار ہے کیونکہ مسلمانوں کے دور حکومت کی شان کا نشہ ابھی تک اس کے دماغ پر سوار ہے جو محنتی مسلمان ہیں انکو اپنا حق مل رہا ہے مثال کے طور پر انہوں نے بھارت میں اور اپنے محکمہ میں سٹینو گرافروں کے کام کو لیا جس کے لئے مسلمان کام کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اس میں شک نہ تھا کہ یہ دلائل کوکب صاحب کے دل سے نہیں نکلے تھے ان کو ایک خاص مقصد کے لئے ان کی حکومت نے بھیجا تھا اور وہ بہ امر مجبوری یہ کام کر رہے تھے چنانچہ کرنل ستار چوہدری نے پاکستان میں صنعتی ترقی پر روشنی ڈالنے کے بعد بتایا کہ بھارت میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر صرف ہم ہی نہیں کر رہے بلکہ آئے دن بھارتی اخبارات میں ان سے کی جانے والی ناانصافیوں کی تفصیلات پڑھنے میں آتی ہیں السٹریٹیڈ ویکلی کے شمارے

میں دی جانے والے اعداد و شمار دیتے ہوئے کرنل ستار نے کہا کہ مسلمانوں کیساتھ ناانصافی ہو رہی ہے اور بھارتی حکومت اس کے انسداد کے لئے کچھ نہیں کہہ رہی آخر یہ کون ماننے کو تیار ہے کہ بھارت سے گئے ہوئے مسلمان پاکستان میں ہر عہدہ پر کام کرنے کے لئے تیار بھی ہیں ان میں قابلیت بھی ہے اور وہ محنتی بھی ہیں مگر جو یہاں رہ گئے وہ پچیس سالوں میں اسقدر نالائق ہو گئے کہ کسی عہدہ اور ملازمت کے قابل ہی نہ رہے ہو سکتا ہے کہ سٹینو گرافروں کی مثال درست ہو مگر فوج اور دوسرے انتظامیہ کے محکموں میں بھی ان کا نہ لیا جانا کیوں کر حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے آخر اسی بھارت کے علاقہ کے مسلمان بڑے جنگجو اور اچھے سپاہی تھے مگر اب حال یہ ہے کہ باوجود مسلمانوں کی دس فیصد آبادی کے ایک فیصد مسلمان دفاعی افواج میں نہیں لیا جاتا۔

کوکب صاحب نے اردو زبان کی ترقی کے سلسلے میں حکومتِ ہند کی کوششوں کا ذکر کیا اور کہا کہ بھارت اور پاکستان کی معیشت بڑی حد تک ایک دوسرے سے منسلک ہے اور ہمیں ایک دوسرے کیساتھ تجارتی رشتے استوار کرنے چاہئیں تاکہ دونوں اس سے فائدہ حاصل کر سکیں اس پر میں نے انہیں بتایا کہ کوئی غیر دانشمند شخص ہی یہ کہے گا کہ بھارت اور پاکستان آپس کی تجارت سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے مگر ایسے دوستانہ رشتوں کو قائم کرنے کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ صحیح ماحول اور صاف ستھری فضا پیدا کی جائے۔ اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ باوجود بھارت کی طرف سے کی جانے والی تمام ناانصافیوں کے ایسا ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے جس میں تجارتی اور دوستانہ رشتے پرورش پائیں تو یہ خیال خام ہے۔ مناودر، کشمیر حیدر آباد اور اس کے بعد مشرقی پاکستان پر جارحیت کی موجودگی میں وہ ماحول جو دونوں کے لئے سازگار ہو پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے بجائے اس بات کے پرچار کرنے کے کہ باہمی تجارت سے دونوں فائدہ اٹھائیں گے انہیں چاہیئے کہ اپنی حکومت اور عوام کو پاکستان کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کے تدارک کی ترغیب و تلقین کریں کشمیر

کا مسئلہ انصاف کے اصولوں پر طے کیا جانا چاہیئے۔ ماضی میں بھارت نے اپنی دیانت کا ثبوت نہیں دیا۔ جنگی قیدیوں کی مسلسل نا جائز نظر بندی تازہ ترین مثال ہے عورتوں اور بچوں کو نظر بند رکھ کر بھارت نے اس خاطر خواہ ماحول قائم کرنے کی طرف قدم نہیں بڑھایا جو ان تجارتی اور دوستانہ رشتوں کے لئے ضروری ہیں پاکستان بھارت کی بالادستی قبول کرنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوگا یہ باہمی تعلق برابری اور انصاف کی بنیادوں پر ہی قائم ہو سکتا ہے۔

مجھے کوکب صاحب سے ہمدردی تھی کہ آئے تو تھے ہمیں اپنا ہم خیال بنانے مگر جاتے ہوئے وہ ہمارے ہم خیال ہو کر لوٹے۔

آئے دن اخبارات اور رسالوں میں بھارت کے آٹھ کروڑ ہریجنوں کی حالت زار پڑھ کر ہر کسی ذی عقل کو دکھ بھی ہوتا ہوگا اور حیرت بھی کہ اس بیسوی صدی میں انسان کیساتھ حیوان سے بھی بدتر سلوک روا رکھا جا سکتا ہے اور بھارتی سیکولرزم میں یہ انسانیت سوز ماحول دنیا کی نگاہوں سے کیونکر چھپا ہوا ہے ڈاکٹر ایمبید کرنے جو کہ شودروں کے رہنما تھے گاندھی جی کو ایک خط میں لکھا تھا میرا کوئی وطن نہیں میں اس زمین کو اپنا وطن کیسے کہہ سکتا ہوں اور اس مذہب کو اپنا مذہب کیسے کہہ سکتا ہوں جس میں ہمارے ساتھ کتوں اور بلیوں سے بدتر سلوک روا رکھا جاتا ہے جہاں ہمیں کنوئیں سے پانی پینے کی اجازت نہیں۔ کوئی خود دار ہریجن اس ملک پر فخر نہیں کر سکتا اگر ایسا کہنے سے مجھے غدار کا لقب دیا جائے تو بھی مجھے ذرہ بھر افسوس نہ ہوگا اس کی سراسر ذمہ داری وطن پر ہے جو مجھے غدار بننے پر مجبور کر چکا ہے اگر ہریجنوں کے جائز حقوق کے حصول کے لئے مجھے وطن کے خلاف بھی کام کرنا پڑے تو بھی اسے گناہ تصور نہیں کرونگا۔

پچیس سال کی آزادی کے بعد ہریجنوں کی حالت کا اندازہ مندرجہ ذیل باتوں سے لگایا جا سکتا ہے یہ اعداد و شمار اخبارات کے علاوہ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کے ۳۰، ستمبر ۱۹۷۳ء کے شمارہ سے اخذ کئے گئے ہیں۔

(۱) قریباً دو سو ہریجنوں کو ہر سال اچھوتے پن کی بنا پر بھارت میں موت کے گھاٹ

اتارا جاتا ہے۔

(۲) پولیس عدالت اور انتظامیہ مجرموں کی طرف داری کرتے ہیں اسی لئے جب (تامل ناڈو) کے گاؤں کنیر ونمانی میں ۴۲ ہریجن عورتوں اور مردوں کو زندہ جلانے کی واردات ہوئی تو اونچی ذات کے ۲۳ ہندو مجرمین کو بالکل کوئی سزا نہ دی گئی اور انکو بری الذمہ قرار دیا گیا۔

(۳) ضلع راج گڑھ (مدھیا پردیش) میں کسی ہریجن کو اونچی مونچھ رکھنے کی اجازت نہیں۔

(۴) اندھرا پردیش کے کئی علاقوں میں دھوبی ہریجنوں کے کپڑے نہیں دھوتے۔

(۵) بھارت کے بیشتر علاقوں میں ہریجنوں کو مندروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔

(۶) تامل ناڈو کے کئی علاقوں میں ہریجنوں کو اونچی ذات کے ہندوؤں کے گھروں کے سامنے سے گزرتے وقت اپنی جوتیاں اتارنی پڑتی تھیں۔

اسی طرح ہریجنوں کی باراتیں کاسٹ ہندوؤں کے گھروں کے سامنے سے اس وقت تک نہیں گزر سکتیں جب تک دلہن اپنے کان کی بالیاں اتار نہ لے اور دلہن کے اوپر رکھی ہوئی چھتری کو بند نہ کر لیا جائے۔

(۷) کاسٹ ہندوؤں کے کپڑوں یا کسی چیز کو اگر ہریجن کا ہاتھ چھو جائے تو وہ بھرشٹ یعنی ناپاک ہو جاتا ہے اور ہندو کو پاک ہونے کے لئے نہانا پڑتا ہے اور چیز کو گندی نالی میں پھینکر ہریجن سے ہرجانہ وصول کیا جاتا ہے۔

(۸) فروری ۱۹۸۸ء کو کنچلچرپا کے قصبے میں ایک ۱۹ سالہ انکا تھا کوٹیس نامی ہریجن لڑکے کو ایک پندرہ روپے کی گڑوی چرانے کے الزام میں مکان کے ستون کے سر ھ باندھ کر اور مٹی کا تیل ڈال کر زندہ جلا دیا گیا جبکہ کاسٹ ہندوؤں کا بھاری مجمع تماشہ دیکھتا رہا۔

(۹) ہریجن بچوں کو کئی سکولوں میں داخل نہیں کیا جاتا۔ معلوم نہیں ایسی قوم انسان ہونیکا کیسے دعویٰ کر سکتی ہے جبکہ وہ اپنے ہی ساتھیوں کو حیوانوں سے بدتر سمجھتی ہو۔

ہمارے ملک میں بھی کئی رسم و رواج میں ہندوؤں کے اثر کی جھلک ملتی ہے خاص کر ذات

بات کا معاملہ باوجود اسلام کے بنیادی مساوات۔ اسلام، بھائی چارہ اور رواداری کے اصولوں ہم میں کچھ ناپسندیدہ خامیاں پیدا کر گیا ہے یہ اونچی اور کمی ذات کا سلسلہ ہمارے معاشرے میں بھی پایا جاتا ہے، وہ جولاہا ہے۔ فلاں موچی ہے اور فلاں چمار اور فلاں کمہار ہے اور اگر ہم یہ کہیں کہ ہمارے معاشرے میں کمی ذات کے لوگوں کو اسی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جیسا کہ میر صاحب چودھری صاحب یا خانصاحب کو تو یہ غلط بیانی ہو گی۔ اسلامی مساوات اور بھائی چارے کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ دیواریں مسمار کر دی جائیں۔

۳۰ ستمبر کے ٹائمز آف انڈیا اخبار میں ایک خبر جلی سرخیوں سے شائع ہوئی کہ بنگلہ دیش میں بیراب پل کی افتتاحی رسم پر بھارتی وفد کے ساتھ بڑی بے رخی برتی گئی یہ پل جو پاک بھارت جنگ کے دوران تباہ ہو گیا تھا کچھ حد تک برطانوی لیکن زیادہ تر بھارتی مدد اور بھارتی عملہ کی وساطت سے مرمت کیا گیا تھا۔ ۲۸ ستمبر کو اس کی افتتاحی رسم شیخ مجیب الرحمن نے ادا کی بھارت کے نائب وزیر برائے ریلوے اور ریلوے بورڈ کے چیئرمین اور بنگلہ دیش میں بھارتی سفیر بھی اس تقریب میں شریک ہوئے کیونکہ پل کی تعمیر میں زیادہ تر ہاتھ بھارت کا تھا اس لئے نائب وزیر ریلوے اور چیئرمین نے اپنی تقریروں کی ایڈوانس کاپیاں بنگلہ دیش حکومت کو پہلے ہی روانہ کر دی تھیں اور یہ دونوں حضرات اس تقریب میں تقریریں کرنے کے لئے ہی تشریف لے گئے تھے۔ مگر تقریب شروع بھی ہوئی اور ختم بھی ہو گئی مگر ان حضرات کو نہ کسی نے پہلے یہ بتایا کہ ان کو تقریر کرنے کا موقع نہیں دیا جا سکے گا اور نہ بعد میں کوئی معذرت کی گئی اور یہ دونوں حضرات اپنی تقریریں اپنے ہاتھوں میں تھامے اپنا سا منہ دیکھتے رہ گئے۔ شیخ مجیب الرحمن کی تقریر کے بعد شیخ صاحب بمعہ برطانوی ہائی کمشنر کے اپنے ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر ڈھاکہ روانہ ہو گئے اور بھارتی سفیر اور دوسرے اراکین کو بذریعہ ریل ڈھاکہ آنے کے لئے پیچھے چھوڑ گئے بھارتی نائب وزیر اور چیئرمین ناراض ہو کر اکھوڑا کے رستے اگرتلا واپس چلے گئے، یہ خبر پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی اور قیدی بے ساختہ کہہ اٹھے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا  آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

بھارتی اخبارات نے بنگلہ دیش کے اس رویہ پر کڑی تنقید کی تھی۔ بی بی سی کے ایک تبصرہ کے مطابق بنگلہ دیش کے عوام کو بھارت کے خلاف بے حد غصہ ہے کہ وہ جنگ کے خاتمہ پر تمام فوجی سامان یہاں تک کہ فیکٹریاں بھی اٹھا کر لے گئے پیچھے صرف دو پرانے ٹینک اور چھ ناکارہ توپیں بنگلہ دیش کے حوالے کر گئے بھارتی فوج نے سقوط ڈھاکہ کے بعد کافی لوٹ مار کی ایک خبر کے مطابق میجر جنرل ناگرہ کو ڈھاکہ سے کئی مرسیڈیز کاریں لے جا کر کلکتہ میں بیچنے کے الزام میں برطرف کر دیا گیا اور ۷۰ فوجیوں کو لوٹ کھسوٹ اور عورتوں کی عصمت لوٹنے کے الزام میں پکڑا گیا۔ اس کے علاوہ ڈھاکہ میں بھارتی ناکارہ اشیاء کے خلاف مظاہروں کی خبریں اکثر اخبارات میں چھپا کرتیں۔

بھارت کی ناقص ساڑھیوں اور گھٹیا مال کے خلاف بنگلہ دیش میں احتجاج زور پکڑ رہا تھا بنگلہ دیش سے پٹ سن اور کھانے پینے کی اشیاء کی سمگلنگ سے چیزوں کی قیمتوں میں تین سے چار گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اکثر خیال آتا کہ وہاں کے مسلم عوام کو اب تو اس بات کا احساس ہوا ہو گا کہ مغربی پاکستان ان کو لوٹ کر کھا گیا کا نعرہ زیادہ سیاسی اور مبالغہ آمیز تھا۔ بہر حال بھارت کے خلاف بنگلہ دیش میں یہ روش امید افزا ہے وہاں کے لوگوں کو پاکستان کے ساتھ اپنے دائمی رشتوں کو استوار کرنے ہی میں انکی اور ہماری بہتری کا راز مضمر ہے اللہ کریگا کہ وہ دن دور نہیں ہونگے۔

## ۲۴

۸ اکتوبر کو بعد از دوپہر مصر و شام اور اسرائیل کی جنگ کی خبر سنی پھر معلوم ہوا کہ مصر کی فوجیں نہر سویز کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گئیں ہیں، دوسری طرف شام کی فوجیں بھی جولان کے علاقہ میں پیش قدمی کر رہی ہیں۔ ہمارے لئے یہ اپنی واپسی کی خبر سے بھی زیادہ خوش کن اور عزیز خبر تھی اس دن سے ہماری تمام تر توجہ اس جنگ کی خبروں کی طرف مبذول ہو گئی ہر وقت دنیا کے مختلف ریڈیو سٹیشنوں سے جنگ کے بارے میں تازہ ترین حالات معلوم کرنے

کے لئے بڑی بے چینی لگی رہتی اور اس رمضان کے مبارک مہینہ میں دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی کہ اللہ میاں اس جنگ میں عربوں کو کامیاب و کامران اور فتح یاب کرے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں کے تنزل کی سب سے بڑی وجہ ان کا نفاق تھا اگر تمام اسلامی ممالک اسلام کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہیں اور آپس میں اتحاد پیدا کریں تو دنیا کا مضبوط ترین بلاک بن سکتے ہیں مگر افسوس کا مقام ہے کہ باوجود یہودیت کے خطرہ کے عرب ممالک تاحال اکٹھے ہونے نہ پائے۔ ان کے آپس کے جھگڑوں سے دشمن کے سوا اور کون فائدہ اٹھا سکتا ہے دوسرے ممالک کا بھی حال اچھا نہیں۔ ملائشیا کی انڈونیشیا سے ان بن رہی عراق کی ایران سے۔ افغانستان کی پاکستان سے گڑبڑ رہی ہے نہ معلوم مسلمان کب اور کیوں کر سمجھے گا۔ کہ اسکی بقا اور فلاح اسلامی ممالک کے باہمی اتحاد میں مضمر ہے ایسے اتحاد کے حصول کے لئے ایک تحریک کی ضرورت ہے عربوں کی فنون سپہ گری میں کمزوری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پچھلی چند صدیوں سے وہ برسر پیکار ہوتے نہیں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۲ء تک کے عرصہ کی تین جنگیں بالکل مختصر رہیں اور ان کے آغاز ہی میں عربوں کے حریف نے اس سرعت سے شکست دی کہ وہ دیکھتے ہی رہ گئے۔ قوموں کی زندگی اور پرورش کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ فنون سپہ گری سے خود کو آراستہ رکھیں آخر انہی عربوں نے اپنے قوت عمل اور مہارت سپہ گری سے دنیا کا کتنا بڑا حصہ مطیع کیا تھا طویل امن اور آسائش کی زندگی قوموں کے لئے زہر ثابت ہو سکتی ہے لہو کو گرم رکھنے کے لئے سپاہ گری کی روایات کو زندہ رکھنا ضروری ہے ماضی کی شکستوں کے بعد عربوں نے اس دفعہ بہتر شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے اس دفعہ شاید مکمل فتح نہ بھی ہو تو بھی پیہم جدوجہد میدان کا فتح کی جانب پہلا قدم ضرور ثابت ہوگا آخر قوموں کا مستقبل ایک مختصر جنگ سے وابستہ نہیں ہوا کرتا۔ سال ہا سال کی قربانیوں اور جانفشانیوں کے بعد ہی حق و انصاف کا ثمر اور عزت و احترام کا مرتبہ میسر آیا کرتا ہے ۱۹۷۲ء کے موسم گرما میں جب ہم کو ۲۸ مئی کو اس نئے کیمپ میں لایا گیا تھا تو کیمپ میں صرف چھ بالٹیاں اور پانچ لوٹے تھے دن میں کم از کم دو

ورنہ اکثر تین مرتبہ قریباً سب کے سب افسر اور جوان نہا لیا کرتے تھے۔ ہر روز تین مرتبہ صبح دوپہر اور شام کے وقت پانی کوئی ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے کھلا کرتا تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ وقت پانی نہ بھی آتا تو گزارہ ہو جایا کرتا کوئی زیادہ تکلیف محسوس نہ ہوتی، ۱۹۷۳ء کے موسم گرما کے آغاز میں ماسوائے سات افسروں کے جن میں میں بھی شامل تھا۔ ہر ایک نے اپنی بالٹی اور لوٹا خرید لیا تھا کہ نہانے کے وقت پانی جمع بھی کر کے رکھ سکیں۔ کیمپ میں پچاس بالٹیاں اور کچھ لوٹے ہو گئے تھے جس کا نتیجہ ہوا کہ پانی کے آنے سے گھنٹہ آدھ پہلے ہی غسلخانوں کے باہر لمبی قطاریں لگنی شروع ہو جاتیں کچھ افسروں کی نہانے کی باری ہی نہ آتی اس کے برعکس کئی نہا کر اپنی بالٹی اور لوٹا بھی بھر کر غسلخانے سے نکلتے۔ اسی وجہ سے ان گرمیوں میں زیادہ تعداد کو تکلیف اٹھانا پڑتی اس کی مثال ذخیرہ اندوزی سے ملتی جلتی ہے جب ہر کوئی اس قدر محتاط ہو جائے کہ اپنے لئے وقتی ضرورت کے علاوہ مستقبل کے لئے سمیٹ کر رکھنا شروع کر دے تو ظاہر ہے کہ چیزوں کی کمی پیدا ہو گی جس سے ہر کسی کو تکلیف پہنچے گی یہ شاید ہماری کمزوری ہے یا انسانی ہو۔ پانی نہ آنے کی صورت میں ایک وقت کیا ایک آدھ دن بھی اگر نہانا میسر نہ آتا تو کون سی بڑی بات تھی۔ یا ایک عدد لوٹے سے نہا کر تازگی کا حصول ممکن تھا۔ تنگ دلی اور ذاتی ضرورت کی اہمیت نہ صرف اوروں کے لئے بلکہ خود اپنے لئے بڑی تشویش کن اور آزردہ خاطر ثابت ہوا کرتی ہے اگر ہر شہری یہ رویہ اختیار کرے کہ اوروں کی ضرورت اس کی ضرورت سے زیادہ ہے تو نہ صرف اسے سکون دل میسر ہو گا بلکہ کسی شخص کو چیزوں کی کمی کا احساس بھی نہ ہو سکے گا۔ طنز ہماری روزمرہ گفتگو کا حصہ ہے بعض لوگ طبعاً طنزیہ واقع ہوتے ہیں طنز کرنیوالے کسی پر چست سا فقرہ چسپ کر کے بے حد محظوظ ہوتے ہیں دوسرے حاضرین بھی اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن جس پر طنز ہوتی ہے اسکو اسقدر دکھ ہوتا ہے کہ شاید کھلی دی گئی گالی سے بھی نہ ہو کیونکہ گالی کا جواب تو سیدھی گالی میں دیا جا سکتا ہے مگر طنز کا جواب محض طنز میں ہی دیا جا سکتا ہے کچھ ایسے ہی آداب گفتگو ہیں فی الفور طنزیہ جواب کا دماغ میں لانا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ اگر آ جائے خواہ ڈھیلا ڈھالا سا ہی کیوں نہ ہو تو طبیعت کچھ ہلکی ہو

جاتی ہے ورنہ طنز کا شکار ہونے والے پر غصے کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے وہ شرمندہ ہو کر اور دل پسیج کر رہ جاتا ہے اگر دونوں حریف برابر کی طنزیہ اہلیت کے مالک ہوں تو پھر جواب اور جواب در جواب کا سلسلہ یوں شروع ہوتا ہے کہ آخر میں تلخ کلامی پر نوبت آجاتی ہے اگر ہاتھا پائی نہیں تو گالی گلوچ تو ضرور انجام ہوتا ہے اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ طنز کرنیوالے شخص میں قوت برداشت کم ہوتی ہے وہ دوسروں پر طنزیہ جملے کس کر تو مزہ لیتا ہے مگر جب اپنی باری آتی ہے تو ایسی باتیں اسے ناپسندیدہ لگتی ہیں پہلا سبق تو یہ نکلا کہ جو چیز انسان کو اپنے لئے ناپسندیدہ ہو وہ اسے دوسروں کے لئے بھی ناپسندیدہ ہی تصور کرنی چاہیئے دوسرا یہ کہ طنز ایک نازیبا حرکت ہے طنزیہ جملوں کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے اوروں کا دل دکھتا ہے اور دوسروں کو آزردہ خاطر کرنا شرافت نہیں اکثر طنز کا مقصد دوسروں کی کمزوری یا کسی برے عمل کا سد باب کرنا ہوتا ہے مگر یہ ایک بھونڈا طریقہ ہے غلطی کرنیوالے کو ایک دوست کی حیثیت سے سمجھانے ہی سے کام نکلنے کی امید کی جاسکتی ہے طنزیہ فقروں سے نہیں۔

کیمپ میں ہر مزاج کے لوگ موجود تھے بے حد دلچسپ شخصیتیں بھی تھیں اگر اس ساری کہانی اور سارے ڈرامے میں میں ایک کردار کا ذکر نہ کروں تو کہانی اور ڈرامہ ادھورا رہ جائے گا ہر سوسائٹی میں طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں بعض دلچسپ۔ بعض خشک۔ بعض غصیلے اور بعض کندۂ ناتراش۔ کئی کردار بے شمار خصائل کا مرکب ہوتے ہیں یعنی دلچسپی، غصے دلیری صاف گوئی بے ضبطگی جنکا زندگی اور زندگی کے ہر معاملے کے متعلق اپنا نرالا اندازِ فکر اور رویہ ہوتا ہے ایسے کردار کا مالک یا تو اپنے ساتھیوں میں بے حد مقبول ہوتا ہے اور یا بے حد ناپسندیدہ وہ ہر کسی سے گزارا نہیں کر سکتا اسکی خصلت کو سمجھنے کے لئے نفسیاتی علم اور چشم بینا کی ضرورت ہوتی ہے ہمارے کیمپ میں ظفر سعید ملک کی شکل میں ایک ایسا ہی کردار تھا ہر ایسے کام میں سب سے آگے جس میں شرارت ہو ہر ایسی مہم میں پیش پیش جو بھارتی حکام کی حکم عدولی، اور ان کیساتھ کشمکش کیلئے ہو اس کی ہر حرکت اور بات کیمپ کی کہانی بنی ہوتی۔

اسکا عزم مضبوط اور دلیری سرکشی اور لاپرواہی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی اس کا ہر دوست چند روز ہی میں اسکی سرکشانہ دلیری کا ساتھ نہ دیتے ہوئے ایک مختصر بحث و تکرار کے بعد خفا ہو جایا کرتا۔ وہ خود چونکہ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دوستی کا حق پورا کرنے کا قائل تھا۔ اور دوسرے ایسا رویہ اختیار کرنے سے قاصر ہوتے تو وہ انکی دوستی سے مایوس ہو کر جنگ پر اتر آیا کرتے، بھارتی حکام اس سے بے حد تنگ تھے اور کیمپ کے کافی افسر بھی وہ کیمپ میں بعض دفعہ معمولی تلخی پیدا کرنیکے باوجود بیحد رونق کا باعث بنا رہا ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اسکے منہ پر کچھ دانے سے نکل آتے تو ڈاکٹر نے اسے داڑھی رکھنے کی اجازت دیدی کیپٹن وید نے اسے داڑھی ترشوانے کیلئے کہا لیکن وہ تو ایسے موقع کی تاک میں ہوتا صاف انکار کر دیا کہ یا تو میں مکمل داڑھی مونڈوں گا یا اسی طرح رکھونگا ترشواؤں گا ہرگز نہیں۔ وید نے بڑی دھمکیاں دیں سزا کا ڈر دیا مگر وہ نہ مانا اسنے اسے ہتھکڑیاں پہنا کر ہاتھ پیچھے باندھ دیئے دفتر میں لے گیا اور حجام سے داڑھی ترشوادی اور حکم دیا کہ اب شیو نہیں کرو گے واپس کیمپ میں پہنچ کر وہ سیدھا بیرک میں آیا اور سیفٹی ریزر سے داڑھی صفا چٹ کر دی کیپٹن وید آیا اسے دیکھ کر پیٹا یا اور اسکی شکل دیکھتا رہ گیا اسی طرح گورو پہلے بھی سزا بھگت چکا تھا کئی دفعہ بھارتی افسروں پر جملے کسنے کے الزام میں اسکی سرزنش ہوئی وہ کیمپ کا گورو تھا ہر کوئی اسے گورو کہتا اپنے سکول میں ایام میں بھی وہ گورو تھا اس کے والد بھی اسے اغلباً گورو کہہ کر پکارتے تھے، رمضان کا مہینہ عبادت میں گذرا ۲۸ اکتوبر کو عید ہوئی جو اس سے پہلے کی تین عیدوں کی طرح منائی گئی نماز صحن میں اکٹھے ہو کر پڑھی محفل موسیقی منعقد کی شور مچایا اور دن گزر گیا۔

۲۹ اکتوبر کو صبح دس بجے کے قریب فال ان کا آرڈر ملا کرنل آنند سنگھ اور کیمپ کمانڈر میجر ڈھلن آئے آنند سنگھ نے خبر سنائی کہ میری والدہ سخت بیمار ہے اس لئے مجھے اور میرے بھائی میجر منظور الحق کو انٹرنیشنل ریڈ کراس کی سفارش سے آج ہی واپس بھجوانے کی ہدایت موصول ہوئی ہے اور پاکستان واپس جانے کیلئے ہم دونوں کو فوراً تیار ہو جانا چاہیئے کیونکہ بارہ بجے یہاں سے

جانا ہو گا نہ صرف مجھے بلکہ کیمپ کے دوسرے ساتھیوں کو بھی اس خبر سے تشویش ہوئی کیونکہ ہمارا اندازہ یہ تھا کہ والدہ کی بیماری کی خبر تو محض بہانہ ہے اصل میں ان کا ارادہ مجھے اس کیمپ سے لے جانے کا ہے گزشتہ بائیس ماہ کے تکرار اور کشمکش کے بعد وہ اتنے مہربان کیونکر ہو سکتے تھے کہ واپس پاکستان اتنی آسانی سے بھیج دیں خاصکر میرے ساتھ تو ان کا اینٹ کتے کا بیر تھا۔ وہ چلے گئے ہم برخاست ہوئے تو ساتھیوں نے ہمدردی کی باتیں شروع کیں۔ کچھ والدہ کی سخت بیماری کے سلسلے میں اور کچھ وہاں سے آگرہ لے جانے کے ڈر کے سلسلے میں کچھ ساتھیوں نے آنند سنگھ سے حقیقت معلوم کرنیکی کوشش کی۔ کرنل جعفری میرے پاس آئے تو انہوں نے بتایا کہ حقیقت یہ ہے کہ میری والدہ فوت ہو گئی ہے اور چونکہ ہم تین بھائی وہاں نظر بند تھے اسلیئے انسانی ہمدردی کے پیش نظر ہمیں واپس بھیجا جا رہا ہے یہ خبر میرے لیئے انتہائی افسوسناک تھی اور اسکے لیئے میں بالکل تیار نہ تھا اور نہ ہی دل ماننے کو راضی تھا کہ میری والدہ یوں داغ مفارقت دے سکتی ہیں لاہور کینٹ کے ریلوے سٹیشن کا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا جب میں اپریل ۷۱ء کو مشرقی پاکستان اپنی بٹالین کو لیکر آ رہا تھا اور انہوں نے وہاں پلیٹ فارم پر دعائیں دیکر رخصت کیا تھا کون کہہ سکتا تھا کہ یہ آخری ملاقات ہو گی نظر بندی کے دوران تو میں ہر روز ارادہ کرتا کہ واپس جا کر والدہ کی اتنی خدمت کرونگا کہ انکے قدموں کی جنت کی تہہ تک پہنچ جاؤں مگر یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی میں نے اپنے بھائی کو انکی وفات کی خبر وہاں کیمپ میں نہ دی راستے میں ٹرین میں اس بات کا انکشاف کیا۔ ایک طرف یہ رنج۔ دوسری طرف پاکستان کو واپسی اس پر یہ خیال کہ واپسی بھی ایک طرح کے بھارتی احسان تلے ہو رہی ہے اور پھر اپنے ساتھیوں کو ان مشکلات میں چھوڑ کر چلے جانے کا احساس یہ سب کچھ ایک عجیب کفیت پیدا کر رہے تھے۔ جی تو چاہا کہ یوں بھارتی احسان تلے واپس جانے سے انکار کر دوں اور ساتھیوں کا ساتھ دوں مگر آنند سنگھ نے بتا گیا تھا کہ میت کو برف خانہ میں رکھوایا گیا ہے اور ہماری واپسی کا انتظار کیا جائیگا پیشتر اس کے کہ انکو دفن کیا جائے آخری مرتبہ والدہ کا منہ دیکھنے کی تمنا دوسرے جذبات سے زیادہ تھی جن چند چیدہ چیدہ افسروں کو وفات

کا علم تھا انہوں نے تعزیت کی زندگی اور موت کے متعلق میرا ذاتی نظریہ کافی حد تک حقائق پسند ہے ہر کسی نے مرنا ہے اور زندگی و موت خدا کے ہاتھ میں ہے موت کو خدا کی رضا سمجھتا ہوں اسی لئے دوستوں اور رشتہ داروں کی وفات کے موقع پر اس اندازِ فکر سے حوصلہ مل جاتا ہے دکھ تو ہوتا ہے مگر دل نہیں ہارتا مشکل حالات میں وہاں ہر کسی کو میں بلند حوصلگی اور صبر کی تلقین کرتا رہا تھا اسلئے یہ بھی ضروری تھا کہ میں خود اب اس خبر سے زیر نہ ہو جاؤں میرے لئے معمولی انداز کا مظاہرہ ضروری تھا اپنا مختصر سامان اردلیوں میں تقسیم کیا اپنا سوٹ کیس سٹور سے لایا جسے باہر ہی تاروں کے پاس رکھوا دیا گیا۔ شیو کا سامان لائف بوائے صابن پاؤڈر کا ڈبہ اور دیسی صابن جن میں میری تحریر کردہ کتابیں تھیں اور مختصر بسترہ باہر لایا۔ میری اور سوٹ کیس کی تفصیل سے تلاشی لی گئی، ساتھیوں نے گھر کے پتے، خطوط اور فون نمبر دیئے تھے، ماچس اور سگریٹ کی ڈبیاں اور کچھ ٹوپی کے اندر چھپا رکھے تھے ماچس کی ڈبیا تلاشی میں پکڑی گئی صابن اور پاؤڈر کا ڈبہ صحیح سلامت سوٹ کیس میں رہا اور میری جان میں جان آئی۔ ورنہ ان کتابوں کو لکھنے کی ساری محنت رائیگاں جاتی اور وہاں کے کیمپ کے صحیح حالات پھر کبھی تحریر نہ کر پاتا اور شاید آپ بھی اس کتاب سے محظوظ نہ ہو سکتے۔ سب ساتھیوں سے ملا ماضی کی رنجشوں کو خیر باد کہا سب بغلگیر ہوئے ایک بجے مجھے اور منظور کو باہر لایا گیا ایک فوجی ٹرک کے اندر آدھے حصے میں کانٹے دار تار لگا کر ایک پنجرہ سا بنایا ہوا تھا اسکے اندر بٹھا دیا گیا ٹرک دفتر کے سامنے رکا وہاں چند فارموں پر دستخط کئے اور واپس ٹرک میں آ بیٹھے۔ ہمارے ساتھ ایک جے سی او اور تین بھارتی پہرہ دار ٹرک میں تھے گاڑی گوالیار کے سٹیشن سے ڈیڑھ بجے چلتی تھی۔ چلتے چلتے دیر ہو گئی پورے بائیس ماہ کے بعد ٹرک میں بیٹھے اس قید خانہ سے باہر نکلے خار دار تاروں کے اندر اپنے ساتھیوں کو کھڑے دیکھ کر جو الوداعی ہاتھ ہلا رہے تھے بڑے رقت آمیز جذبات پیدا ہوئے

ٹرک گوالیار کے سٹیشن سے باہر رکا پلیٹ فارم پر گاڑی آ چکی تھی اور گارڈ سیٹی بجا رہا تھا ہمارے جے سی او دیر سے پہنچنے کی وجہ سے مخمصے میں پڑا تھا اسے وارنٹ فارم ابھی تبدیل کرنا تھا اس کا

خیال تھا کہ یہ گاڑی نہ پکڑ پائیں گے ہم ٹرک سے نیچے اترے تو میں نے مناسب سمجھا کہ وقت کی نزاکت کا تقاضا ہے کہ خود کمان سنبھال لوں۔ اس جے سی او کو حکمانہ انداز میں جلدی اپنے پیچھے چلنے کے لئے کہا۔ پہرہ داروں کو حکم دیا کہ فوراً ہمارا سامان اٹھا کر گاڑی کی طرف بھاگیں وہ کچھ ہچکچائے مگر میری ایک ڈانٹ نے انہیں راہِ راست پر گامزن کر دیا، میں اور میجر منظور تیز رفتاری سے بھاگے گاڑی نمبر۲ پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ پُل عبور کرنیکے لئے سیڑھیوں پر چڑھے، وہ جے سی او اور پہرہ دار سامان اٹھائے کافی پیچھے رہ چکے تھے پلیٹ فارموں اور پل پر کافی ہجوم تھا جی میں آیا کہ وہاں سے فرار ہو جاؤں، بھائی سے مشورہ کیا موقع نایاب تھا، پہریداروں کا باپ بھی ہمیں نہ پکڑ سکتا تھا مگر بھائی صاحب کا خیال تھا کہ اب فرار کی ضرورت نہیں۔ گاڑی رفتہ رفتہ چل رہی تھی ہم دونوں ایک فسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں چڑھ گئے اور پہریدار بھی ہمارے سامان سمیت کسی دوسرے خانے میں بیٹھ گئے۔

ہمارے کمپارٹمنٹ میں چند شرفا بیٹھے ہوئے تھے، چلنے سے پہلے میں نے اپنی مشرقی پاکستان کی کلف لگی وردی زیب تن کر لی تھی جس پر P O W کا نشان نہیں لگا ہوا تھا، ہم جب کمپارٹمنٹ میں آئے تو ان شرفا کی نگاہیں ہماری نگاہوں سے ٹکرا رہی تھیں، جو پوچھ رہی تھیں کہ ہم کون ہیں ہم لاپرواہی سے سیٹ پر بیٹھ گئے ان شرفا نے آپس میں کانا پھوسی شروع کر دی، میں نے مناسب سمجھا کہ ان کے تذبذب کو ختم کر دوں چنانچہ میں نے اُن سے اپنا تعارف کروایا۔ اسکے بعد انہوں نے ہماری نظربندی کے دوران ہمارے ساتھ سلوک اور حکام کے رویے کے متعلق سوال کئے کہ قیام کیسا رہا۔ یہ نادر موقعہ تھا چنانچہ اس سے میں نے مکمل فائدہ اٹھاتے ہوئے کیمپ کے عہدیداروں کی زیادتیوں اور جنیوا کنونشن کی خلاف ورزیوں کا تفصیل سے ذکر کیا۔ میرے منہ سے ایسے حالات سن کر وہ پشیمان بھی ہوئے اور حیران بھی ان کے اخبارات تو ہمیشہ قیدیوں کے ساتھ شاندار سلوک کی جھوٹی کہانیاں بیان کر رہے تھے، اصل حالات کا تو ان کو میری زبانی پتہ چلا۔ کیمپ کے اندر اکثر یہ خیال آیا کرتا کہ جب باہر نکلیں گے تو نہ جانے باہر کے ماحول سے اتنے عرصے کے بعد دوچار ہوتے وقت کس عجیب و غریب احساس اور جذبات کے حامل ہوں گے مگر گوالیار کے سٹیشن پر

دوڑتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے یہ میرا معمول ہو۔ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔

ہم جنتا ایکسپریس میں سوار تھے تھوڑی دیر بعد وہ جے سی او بمعہ اپنے پہریداروں کے آ گیا۔ ۵ میل کے سفر کے بعد آگرہ آیا اور شام کے ساڑھے آٹھ بجے گاڑی پرانی دلی کے سٹیشن پر پہنچی۔ جے سی او کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ہمارے دلی سے امرتسر کے سفر کے لئے دلی کے ریلوے ٹرانسپورٹ افسر سے رابطہ قائم کرے۔ جے سی او کو میں نے سمجھایا بھی کہ آر ٹی او کا دفتر نئی دلی کے سٹیشن پر ہوگا مگر وہ ہمیں پرانی دلی کے سٹیشن پر اتار کر خود آر ٹی او سے ملنے چلا گیا۔ آر ٹی او وہاں ہوتا تو اسے ملتا۔ اپنا سامنہ لے کر واپس چلا آیا۔ اُس وقت رات کے پونے نو بجے ہوں گے اور نو بجے پرانی دلی سے فرانٹیر میل چھوٹتی تھی جس میں ہمیں مزید سفر کرنا تھا۔ بھاگم بھاگ سٹیشن سے باہر نکلے، اس دوران میں نے اُس جے سی او کی خوب گوشمالی کی۔ مجھے دلی جانے کا اس سے پہلے کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ سٹیشن کے باہر ایک ملٹری پولیس کا ٹرک کھڑا تھا۔ میں نے سوچا اگر وقت پر پہنچنے کا کوئی وسیلہ بن سکتا ہے تو صرف یہ ٹرک ہی ہے اُس کے قریب کھڑے ایک سکھ ملٹری پولیس کے نائیک کو میں نے حاکمانہ انداز میں مخاطب ہو کر کہا یہ سامان جلدی سے اندر رکھواؤ، ہمیں ضروری نئی دلی کے سٹیشن پر پہنچنا ہے۔ وہ کچھ ہچکچایا مگر میں نے ذرا زور سے ڈپٹ دی تو اُس نے ٹرک کا دروازہ کھولا۔ ہمارا سامان جلدی سے ٹرک میں رکھوایا۔ وہ جے سی او میرا منہ تک رہا تھا۔ بغیر بولے وہ بھی ٹرک پر سوار ہو گیا اور ٹرک نئی دلی کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔

دلی شہر کا نظارہ کرتے ہوئے دل میں کئی خیالات آئے۔ حسرت بھرے اس شہر کے لال قلعہ پر پاکستانی پرچم لہراتے ہوئے دیکھنے کی تمنا ہر پاکستانی کے دل میں تھی اور ہے، یہ شہر مسلمان بادشاہوں کا دارالسلطنت کتنی دیر تک رہا۔ یہاں ہم مسلمانوں کا راج ہوا کرتا تھا اور آج ہم قیدیوں کی طرح اسکی سڑکوں سے گزر رہے تھے، یہ تاریخ کی اونچ نیچ تھی۔ جب قوم کے اعمال ناقص اور کردار کمزور پڑ جاتا ہے تو اُسے پستی کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے اور اسکی جگہ بہتر قومیں لے لیا کرتی ہیں قوموں کے عروج و زوال کا انحصار ان کے عوام کے کردار اور اعمال

کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ اگرچہ دلی شہر میں بے حد رونق تھی چہل پہل تھی روشنی تھی مگر میں ان سے بے نیاز دلی کی ماضی کی تاریخ میں کھویا نئی دلی کے ریلوے سٹیشن پر آن پہنچا۔ وہاں پہنچنے پر جب ٹرک ڈرائیور کو معلوم ہوا کہ ہم کون ہیں تو وہ بڑبڑایا مگر ہمیں اسکی بڑبڑاہٹ سننے کی فرصت کہاں تھی۔ پہرہ داروں کو میں نے سامان اٹھانے کے لئے کہا اور ہم سٹیشن کے اندر کی طرف بھاگے۔ گیٹ پر کھڑے ٹکٹ کلکٹر سے میں نے فرنٹیر میل چلنے کے پلیٹ فارم کا نمبر پوچھا تو اس نے بتایا کہ فرنٹیر میل جا چکی ہے، ساری تیزی ٹھنڈی پڑ گئی اتنے میں آر ٹی او جو ایک سکھ ائیر فورس کا فلائٹ لیفٹننٹ تھا آ پہنچا۔ جے سی او کو اس نے ڈانٹ ڈپٹ کی اور ہمیں بتایا کہ اب ہمیں دوسری گاڑی سے رات کے گیارہ بجے وہاں سے روانہ ہونا ہو گا۔

ہمیں پنجاب ایکسپریس کے ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے میں سوار کیا گیا جس میں کئی اور مسافر بھی تھے اور گاڑی گیارہ بجے روانہ ہوئی رات تھی اور باہر اندھیرا۔ کچھ نظر نہ آیا۔ پو پھٹی تو ہم پنجاب میں داخل ہو چکے تھے یہ علاقہ سرسبز بھی تھا اور زرخیز بھی۔ لوگوں کے لباس اور ریلوے لائن کے قریب واقع گاؤں میں مکانوں کی ساخت سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں کے لوگ خوش حال ہیں۔ ہر طرف سکھ نظر آتے رنگ برنگ پگڑیاں باندھے، سارے بھارت میں پنجاب کے لوگ کھاتے پیتے نظر آتے تھے ورنہ بنگال بہار مدھیہ پردیش میں تو غربت دکھائی دیتی تھی۔ گاڑی امرتسر کیطرف بڑھ رہی تھی اور وہاں سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہمارا وطن عزیز تھا جہاں وطن واپس پہنچنے کا وقت قریب آنے کی خوشی تھی وہاں دل میں شرمساری کی چبھن بھی تھی کاش کہ ہم اپنے وطن عزیز کا دفاع کامیابی کیساتھ کر پاتے کیا ہم ننگ قوم تھے؟ شکست کا احساس اور زیادہ تکلیف دہ بننے لگا۔

امرتسر کے سٹیشن پر ہم اترے ۱۹۴۷ء کے بعد اب امرتسر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہی سٹیشن تھا ہمیں ایک ٹرک میں بٹھایا گیا ہم اسی سڑک سے گزرے جس پر ہم اپنے نانا جان کے گھر جاتے ہوئے گزرا کرتے تھے۔ امرتسر کی پرانی عمارات کو دیکھتے ہی ۱۹۴۷ء کی خونی داستان دماغ میں چکر لگانے لگی، کیسی اندوہگیں کہانی تھی مہاجرین کی جو گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔

دوپہر کے ڈیڑھ بجے ہم اٹاری کے سٹیشن پر پہنچے امرتسر سے اٹاری تک سڑک کے دونوں طرف نئی آبادیاں بن چکی تھیں جو پہلے وہاں نہ ہوا کرتی تھیں۔ اٹاری کے سٹیشن کے باہر بھارتی فوج کا کیمپ تھا جہاں کچھ کاغذات مکمل کئے گئے۔ گھنٹہ بھر وہاں انتظار کرنا پڑا۔ اب کچھ یقین آنے لگا کہ ہم گھنٹے دو میں پاکستان پہنچ جائیں گے۔ ہم ٹرک میں پھر بیٹھے اور اڑھائی بجے واہگہ سرحد پر آن پہنچے۔ ساڑھے سات سو جنگی قیدیوں کی جماعت اسی روز صبح ساڑھے آٹھ بجے بھارت سے پاکستان منتقل ہو چکی تھی، مجھے اس بات سے اطمینان تھا کہ چونکہ ہم بے وقت سرحد پار کرینگے، اس لئے وہاں پر کوئی نہ ہوگا اور ہم لوگوں کی نظروں سے اوجھل گھر پہنچ جائیں گے اور اسطرح شرمساری اٹھانے سے بچ جائیں گے.... سرحد سے چار سو گز کے فاصلے پر ہمارا ٹرک رک گیا۔ دور پاکستان کا جھنڈا نظر آیا اور پاکستان کی سرزمین پر اُگے ہوئے سبز درخت سرحد کی جانب سے ایک مہک سی آرہی تھی۔ ایسی مہک جسکی چاہت دلوں میں پچھلے بائیس ماہ سے دبی پڑی تھی۔ کچھ لوگ سرحد کے پار گھومتے دکھائی دیتے مگر اتنے فاصلے سے میں کسی کو پہچان نہ سکا، آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد جو شاید ایک سو گھنٹے سے بھی زیادہ لمبا تھا، ہم کو سرحد کی طرف چلنے کے لئے کہا گیا، دل میں خوشی آزادی کی۔ آنکھوں میں شرم تھی شکست کی اور دماغ پر صدمہ تھا۔ اپنی والدہ کی موت کا۔ سرحد سے چند قدم دور سے خوش آمدید کے الفاظ پڑھے، سرخ قالین ہمارے لئے بچھا ہوا تھا۔ واپس آنے والے قدم کے ساتھ دل و دماغ میں ایک نئے عزم کے ساتھ ایک عہد کا نقشہ بنتا چلا آرہا تھا کہ واپس پہنچ کر ملک و ملت کی خدمت میں زندگی گزار دوں گا اور یہ کہ خدا نے چاہا تو یہ واپس جانے والے قدم ایک نہ ایک دن ضرور واپس لوٹیں گے۔ ایک شکست خوردہ سپاہی کے قدم ایک فاتح قوم اور غازیوں کی یلغار بن کر دلی کی طرف بڑھیں گے۔ اپنی ملت کی بقا اور عزت کی خاطر ایک نہ ایک دن شکست کا داغ مٹانے کے لئے بدلہ لیا جائے گا کیونکہ اگر یوں نہ ہوا تو ہمارے لئے تاریخ اپنا مقصد کھو بیٹھے گی۔

سرحد پر آئی سی آر سی کے نمائندے نے دو تین کاغذات پر دستخط کروائے میں آگے بڑھا

تو بریگیڈیر عبدالقیوم انجم اور میجر جنرل ضامن نقوی کو سامنے پایا۔ بینڈ بجنا شروع ہوا۔ دونوں نے بڑھ کر گلے لگایا۔ کئی عزیز و اقارب اور دوست استقبال کے لئے آئے ہوئے تھے۔ بڑا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ پرتکلف چائے سے خاطر کی گئی۔ ہر ایک نے ہمارے عزم و ہمت کے حق میں جملے کہے ہماری قوم کتنی فراخدل ہے ہارے ہوؤں کو بھی گلے لگاتی ہے ان کی عظمت اور شجاعت کے گیت گاتی ہے۔ میرا ذاتی نکتہ نگاہ اس بارے میں مختلف تھا۔ خیال آتا کہ ہارے ہوؤں کا ایسا استقبال کر کے کہیں ہم غلط روایات کی بنیادیں تو نہیں کھڑی کر رہے؟ ہم ایسے شاندار استقبال کے ہرگز حقدار نہ تھے۔ فتح و شکست میں تفادت کے لئے اور آئندہ نسلوں کو انعام و عبرت کا سبق دینے کے لئے قومی رویہ میں فرق ہونا چاہیئے۔ محمد غوری کی فوج نے جب ایک دفعہ شکست کھائی تو اس نے انہیں توبڑے پہنا کر کابل کی سڑکوں پر پھرایا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ آئندہ جنگ میں وہ فتح یاب ہوتے۔ امید ہے حکومت اور قوم کے اس فراخدلانہ رویہ سے واپس آنے والے تمام جنگی قیدی کوئی غلط سبق اخذ نہ کریں گے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۳ء یوم نجات قرار پایا۔ دشمن کی قید سے بدتر دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ اس وقت دل سے خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا میں الفاظ نکلے اور اس کا شکر دل سے بجا ہوا۔ آزادی کی سچی قدر جاننے کے لئے بھارت سے واپس لوٹنے والوں کے احساسات کا جائزہ لیجئے۔ گھر پہنچنے پر مجھے معلوم ہوا کہ اکیس اکتوبر کو میری والدہ کراچی سے لاہور آئیں تا کہ جب اُنکے تینوں بیٹے بھارت کی قید سے واپس لوٹیں تو وہ بغیر کسی تاخیر کے مل سکیں مگر اسی روز شام عشا کی نماز کے بعد کے بعد جب وہ گھر میں داخل ہونے لگیں تو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئیں (انا للہ وانا الیہ راجعون) ان کی وفات پر انٹرنیشنل ریڈ کراس کی وساطت سے ہم دونوں بھائیوں کی واپسی عمل میں آئی۔ ہمارے بڑے بھائی کموڈور اکرام الحق چونکہ سینئر افسر تھے ان کو بھارتی حکام نے آنے کی اجازت نہ دی۔ بھارتی حکام کی تنگ دلی ملاحظہ ہو

ہمارے دوسرے ساتھی دسمبر کے آخر میں گوالیار سے واپس پہنچے اور بعض تو اپریل ۱۹۷۴ء میں آئے۔ یوں ہماری والدہ نے جان دیکر ہمیں بھارت کی قید سے نجات دلائی۔

ماں ایک عظیم اور مقدس ہستی ہے، اپنے بچوں کے لئے جو وہ قربانیاں کرتی ہے شاید دنیا کی کوئی اور جان دار چیز نہیں کر سکتی۔ آزادی انتہائی قیمتی نعمت ہے۔

یہ تھی میری نظر بندی کی کہانی۔ اس قید کے بائیس ماہ میرے لئے سبق آموز ثابت ہوتے۔ کٹھن اوقات ہی میں انسان ملک و ملت کے لئے سچے جذبات کو جنم دیتا ہے اور اگر ہم اتنے بڑے سانحہ کے بعد بھی اپنی ذاتی اور اجتماعی کمزوریوں پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام رہے تو ہمارے لئے زندانوں کے سوا اور کوئی جگہ نہ رہے گی۔ ہماری قوم کے ہر فرد کو ایک نئے ولولے اور نئے جذبے کیساتھ اپنے اخلاق کو سنوارنا ہوگا۔ لسانی قوتوں کو کچلنا ہوگا، ایک منصف اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے جدوجہد کرنی ہوگی تاکہ مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکیں۔

روپے اور دولت کی خواہش، عیش و عشرت کے سامان، جائیدادیں یہ سب ایک ہیچ مقصد کی ضروریات ہیں بلندیوں پر پہنچنے والی قوموں کے افراد کے مقاصد سادگی، ایثار، ایمانداری محنت کشی، ایمان اور رواداری کے اصولوں پر مبنی ہوا کرتے ہیں۔ زندگی مختصر ہے کہ زندگی عذابوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔

آیئے آزاد اور باوقار زندگی گزارنے کے طور اپنائیں

(آفتاب عالم پریس لاہور)

?

# مشرقی پاکستان میں جنگ کی چند جھلکیاں

مشرقی پاکستان اور بنگلہ دیش کی درمیانی رات

سقوط پر فوجی کے جذبات۔ عوام کے تاثرات

نظر بندی کے دنوں کے حادثات اور حالات

فرار کی کوششوں کی حکایات

ہندو کی ذہنیت کا آنکھوں دیکھا حال

جنیوا کنونشن کی خلاف ورزیاں

قیدیوں کا قومی معاملات کے بارے میں رد عمل

قومی کمزوریوں کا محاسبہ

جنگی قیدیوں کا نفسیاتی جائزہ

مشکلات میں انسانی اقدار اور سپاہی کا کردار

پاکستان واپسی اور آزادی پر احساسات

پیش لفظ میجر جنرل احسان الحق ملک (ریٹائرڈ) کے قلم سے۔